لیتفقہوا فی الدین

"تاکہ وہ دین میں فہم حاصل کریں"

کتاب الاموال

حصہ دوم

تصنیف

امام ابو عبید القاسم بن سلامؒ

تقدیم و ترجمہ و تحشیہ

عبدالرحمٰن طاہر سورتی

ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی ○ اسلام آباد

کتاب الاموال

الزکوٰۃ

(حصّہ دوم)

تالیف :- امام ابو عبید القاسم بن سلّام رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ و تقدیم :- عبدالرحمٰن طاہر سورتی (ریڈر)

ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی

اسلام آباد

ناشر ـــــــ ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی، اسلام آباد

باراوّل تعداد اشاعت ـــــــ ایک ہزار

قیمت ـــــــ بارہ روپے

Rs. 15/-

مطبع ـــــــ علمی پرنٹنگ پریس لاہور

کتاب الاموال (حصہ دوم)

زکوٰۃ

فہرست موضوعات

مقدّمہ

از

عبدالرحمٰن طاہر سُورتی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدّمہ

الحمد للہ الذی انزل الکتاب نوراً و ھدی للناس وارسل رسولہ بالھدی ودین الحق الی الخلق اجمعین، یُعلّمھم الکتاب والحکمۃ ویزکیھم ویُبین للناس ما نزّل الیھم، صلوات اللہ وسلامُہ علی ھذا البشیر النذیر، الذی انقذ من الجھالۃ وحقّق بشریعتہ العدالۃ، وعلی آلہ الطاھرین وصحبہ الابرار المجاھدین وَمن تبعھم الی یوم الدین، امابعدُ:

گذارش

یہ بحث ایک اہم دینی واجتماعی عبادت کے موضوع پر مشتمل نہایت ہی حقیر سی علمی کوشش کی شکل میں پیش کر رہا ہوں۔ ہمارے اس موجودہ دور کے شدید توجہ طلب اور مشکل ترین مسائل میں سے یہ ایک مشکل مسئلہ ہے جس کی تمام اسلامی ممالک اور مسلم معاشرے ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ یہ موضوع زکواۃ وصدقات سے متعلق ہے۔ میں نہیں کہتا کہ اس موضوع پر جو کچھ میں نے لکھا ہے وہی صحیح ہے بلکہ اہل علم وفضل کی خدمت میں یہ مقدمہ اس لئے پیش کیا جا رہا ہے کہ وہ اس موضوع پر سنجیدگی سے غور فرما کر جو حصہ درست سمجھیں اس کی تصویب فرماویں اور جس حصہ میں کجی سمجھیں اس کی تصحیح فرماویں۔ میں ہر علمی وتحقیقی تنقید وتصحیح کو جو حق کے اظہار کے لئے ہوگی بخوشی قبول کر لوں گا کیونکہ یہ صرف میرا ذاتی مسئلہ نہیں ہے پوری اُمتِ مسلمہ

کی مشکل ہے اور تمام دنیا کے مسلمان اس میں میرے شریک ہیں۔ مجھے نہ اپنی فکر پر گھمنڈ ہے نہ اپنی رائے میں استبداد پسند ہے۔ مجھے اس سلسلہ میں علمی آراء و تحقیق و تنقید کا بے چینی سے انتظار رہے گا تاکہ اگلا ایڈیشن اس سے زیادہ صحیح شکل میں پیش کر سکوں [۱]

زکوٰۃ کی قدامت و اہمیت

دین اسلام انسانوں کو کامیاب اور مثالی زندگی گذارنے کے لئے "اقامت صلوٰۃ" اور "ایتاء زکوٰۃ" کو بھی لازمی قرار دیتا ہے اور چونکہ دین اسلام ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک منظور شدہ دین ہے [۲] لہٰذا تمام انبیاء کی تعلیم میں "اقامت صلوٰۃ و ایتاء زکوٰۃ" کو اساسی حیثیت حاصل رہی۔ سورۃ الانبیاء میں جو مکی ہے ابتداءً مجملاً رسولوں کے تذکرہ کے بعد حضرات موسیٰ، ہارون، ابراہیم، لوط، اسحٰق، یعقوب علیہم السلام کا نام بنام ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہے:

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا	اور ہم نے انہیں پیشوا بنایا جو ہمارے حکم سے
وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ	رہنمائی کرتے تھے اور ہم نے ان پر نیک کام کرنے
وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ	اور اقامت صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ کی

---

[۱] ۔میں نے یہ پوری بحث الشیخ صادق علی شحلان فاضل جامع ازہر کو سُنائی جو خوش قسمتی سے پاکستان میں تشریف فرما ہیں۔ موصوف نے نہایت دلچسپی اور غور سے اسے سُنا۔ "نصاب" کے سلسلہ میں انہوں نے فرمایا کہ میرے خیال میں روپیہ کی قیمت جب بیس مثقال سونے کے مساوی ہو اور وہ سال بھر تک بنک میں جمع رہے تو اس پر چالیسواں حصہ زکوٰۃ ادا کی جائے۔ اور یہ معاملہ کہ آج بیس مثقال کتنی رقم کے مساوی ہوں گے اقتصادی ماہرین کے مشورے سے طے کی جائے گی۔

[۲] ۔ ان الدین عند اللہ الاسلام (آل عمران ۳ : ۲۰) بے شک اللہ کے نزدیک دین تو اسلام ہی ہے۔ ایک اور آیت میں ارشاد ہے: ھو سمّٰکم المسلمین من قبل وفی ھذا (الحج ۲۲ : ۷۸) اُس نے تمہارا نام مسلمین رکھا اس سے پہلے اور اس دور میں بھی۔

(الانبیاء[۲۱]: ۷۳) وحی کی[۱]

سورۃ المزمّل میں جو نزول قرآن مجید کے ابتدائی دور کی مکّی سورت ہے مسلمانوں کو "اقامت صلوٰۃ وایتاء زکوٰۃ" کی تعلیم ان الفاظ میں دی گئی:

"وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ" (المزمّل[۷۳]: ۲۰) اور تم اقامت صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ کرو۔[۲]

اور ایک مکی سورۃ حٰمٓ السجدہ (فُصِّلت) میں تو مشرکین کو زکوٰۃ نہ دینے والوں سے ملا کر یوں کہا گیا ہے:

وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِينَ ه الَّذِينَ لَا يُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ: (حٰمٓ السجدہ[۴۱]: ۶و۷) اور مشرکین کے لئے تباہی ہے جو زکوٰۃ نہیں دیتے۔

الغرض اس میں کوئی شک نہیں کہ اقامت صلوٰۃ کی طرح ایتاء زکوٰۃ بھی اسلامی تعلیمات کی بنیادی کڑی ہے اور اس کا حکم تمام انبیاء کو دیا گیا تھا۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو مکی زندگی میں "ایتاء زکوٰۃ" کا حکم اسی طرح دیا گیا تھا جس طرح بتکرار یہ حکم مدینہ میں بھی دیا گیا تھا۔[۳]

---

[۱] بنی اسرائیل سے جو عہد اللہ تعالیٰ نے لیا تھا اس کی پابندی کی تاکید کرتے ہوئے ارشاد ہے: "واقیموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ" (البقرہ[۲]: ۴۳) اپنے اس عہد میں اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا تھا: "إنّی معکم لئن اقمتم الصلوٰۃ وآتیتم الزکوٰۃ" (المائدہ[۵]: ۱۲) اسی طرح حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے متعلق ہے: "وکان یامر أھلہٗ بالصلوٰۃ والزکوٰۃ" (مریم[۱۹]: ۵۵) اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی کہا تھا: "واوصانی بالصلوٰۃ والزکوٰۃ مادمت حیا" (مریم[۱۹]: ۳۱)۔ [۲] اگرچہ بعض علماء نے اس آیت کو مدنی بھی کہا ہے لیکن اس موضوع پر ہم اسی پر اکتفا نہیں کرتے۔ متعدد دیگر مکی آیات ہیں جو اس کی تائید کر رہی ہیں۔ [۳] مدنی سورتوں کے لئے ملاحظہ ہو البقرہ[۲]: ۴۳ و ۸۳ و ۱۱۰۔ النساء[۴]: ۷۷۔ الحج[۲۲]: ۷۸۔ النور[۲۴]: ۳۸ و ۵۶۔ المجادلۃ[۵۸]: ۱۳

اور یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو حکم الٰہی ملتا تھا آپ اس پر عمل پیرا ہو جاتے تھے، لہٰذا ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہیئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ[1] اور مدینہ میں "ایتاء زکواۃ" کا فریضہ انجام دیا تھا۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ جیسے جیسے اجتماعی نظام مضبوط ہوتا گیا زکواۃ کا نظام بھی بتدریج مستحکم ہوتا گیا۔

اسلامی مملکت میں نظامِ زکوٰۃ

جیسا کہ ہم نے کتاب الاموال حصہ اول کے مقدمہ میں بتایا امام ابو عبیدؒ نے اپنی اس کتاب میں صرف ان اموال کا ذکر کیا ہے جو اسلامی حکومت کی تحویل (بیت المال) میں رہتے ہیں۔ ان اموال کے ضمن صدقہ و زکواۃ کا بیان یہ بتا رہا ہے کہ زکواۃ کی وصولی اور اسے تقسیم کرنے کی ذمہ داری تمام تر حکومتِ اسلامی کا فریضہ ہے۔

خود قرآن مجید میں اسلامی حکومت کے فرائض کے ضمن، وضاحت سے یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اس کا ایک فریضہ "ایتاء زکواۃ" بھی ہوگا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ... (الحج ۲۲: ۴۱)	وہ لوگ کہ اگر ہم انہیں ملک میں تمکن عطا کرتے ہیں تو وہ اقامت صلواۃ اور ایتاء زکواۃ انجام دیتے ہیں۔ معروف کا حکم دیتے ہیں اور منکر سے منع کرتے ہیں ....

---

[1] مکہ میں بھی زکواۃ کا حکم تھا اور زکواۃ کا مناسب نظام جاری تھا۔ اس سلسلہ میں حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کا دربارِ نجاشی میں اپنے بیان میں یہ کہنا کہ "وامرنا بالصلواۃ والزکواۃ: اس نبیؐ نے ہمیں صلوٰۃ و زکواۃ کا حکم دیا" بین دلیل ہے، واضح رہے کہ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تشریف رکھتے تھے اور آپؐ کی نبوت پر پانچ یا چھ سال ہی گذرے تھے۔ (دیکھئے سیرۃ ابن ہشام ۱: ۳۵۹ وعیون الاثر لابن سید الناس ۱: ۱۱۹، نیز مسند امام احمد بن حنبل ۱: ۲۰۲)

حقیقت یہ ہے کہ اقامت صلواۃ و ایتاء زکوۃ" ہی وہ ادارے ہیں جن کا نظام مستحکم کرنے کے بعد ایک اسلامی حکومت اپنا صحیح مقام حاصل کر سکتی ہے۔ مذکورۃ الصدر آیت کریمہ دولت خداداد پاکستان کے حق میں پوری طرح منطبق ہو رہی ہے۔ ہمیں اللہ تعالیٰ نے اس ملک میں تمکن سے سرفراز فرمایا ہے اور اپنی مدد کے لئے اقامت صلواۃ و ایتاء زکواۃ ۔ ۔ ۔ الخ کی شرط لگا دی ہے۔ اب ہماری راہ میں ان امور کی انجام دہی میں کوئی مانع باقی نہیں رہنا چاہیئے تاکہ ہم اللہ کی مدد کے مستحق قرار پائیں۔" اقامت صلواۃ و ایتاء زکواۃ کے نظام سے مسلم عوام کا اجتماعی ارادہ بکھرنے نہیں پاتا۔ مسلم عوام اور مسلم حکومت میں بُعد نہیں رہتا۔ حکومت عوام کی بھلائی کے لئے اپنی تمام قوتیں صرف کرتی ہے اور عوام پوری قوت سے اپنی حکومت کے ہاتھ مضبوط کرتے ہیں۔" اقامت صلواۃ و ایتاء زکواۃ" کے بعد معاشرہ میں کسی مخالفت کا سر اُٹھانا ناممکن بن جاتا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ یہ نظام جب تک قوت سے جاری رہا مسلمانوں میں افتراق و تشتت جگہ نہ پا سکا۔ ہمیں حضرت عثمان رضؓ کے عہد تک مملکت اسلامی میں حکومت اور عامۃ المسلمین میں بُعد اور بیگانگی کا پتہ نہیں ملتا۔ اختلافات ہوتے تھے لیکن "نظام صلواۃ و زکواۃ" انہیں بڑھنے نہیں دیتا تھا بلکہ جلد ہی ان کا حل تلاش کر لیتا تھا۔ حضرت ابوبکر رضؓ کے عہد میں جب بعض قبائل نے "نظام زکواۃ" میں خلل اندازی کرنے کی کوشش کی اور یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنی زکواۃ بجائے بیت المال میں داخل کرنے کے نجی طور پر تقسیم کریں گے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے شدت سے ان کی یہ تجویز رد کر دی۔ نہ صرف رد کی بلکہ اُن کے خلاف جنگ کر کے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ "زکواۃ" حکومت کو دیں اور اس طرح تعلیمات اسلام کے اس دانائے راز نے اپنی اصابت رائے اور حکمت عملی سے مسلمانوں کی امامت و جماعت کا نظام درہم برہم ہونے سے بچا لیا اور اس گروہ کو جس نے " زکواۃ " نجی طور پر ادا کرنا

چاہی "باغی" متصور کیا[1]

زکواۃ کی مختصر تشریح

عربی لغت میں "زکواۃ" کے معنی ہیں پاکیزگی، طہارت و پاکی برکت، نشو ونما، مدح و ستائش، کسی چیز کا پاکیزہ و منتخب حصہ[2]

زکواۃ بمعنی تَزۡکِیَۃ مصدر بھی ہے یعنی (نشو ونما کرنا) بڑھانا، بار آور کرنا، پاک کرنا سدھارنا اور اصلاح کرنا۔ لزوم کی جہت سے اس کے معنے طہارت و نمو اور صلاح (پاک ہونا، بڑھنا اور درست ہونا) بھی ہیں[3]۔ الغرض اس مادہ کے بنیادی معنوں میں دو پہلو پائے جاتے ہیں۔ ایک بڑھنا، پھلنا پھولنا، نشو ونما پانا اور دوسرے پاکیزگی، طہارت، صفائی[4]۔ امام راغب اصفہانی نے زکواۃ کا اصل مفہوم "ایسے بڑھنے اور نشوونما پانے کو بتایا ہے جو اللہ تعالیٰ کی برکت سے حاصل ہو" وہ لکھتے ہیں: "زکواۃ کے بنیادی معنوں ہی سے اس زکواۃ کا اشتقاق ہے جو آدمی حاجت مندوں کے لئے اللہ کے حق سے نکالتا ہے اور اس کا یہ نام اس لئے رکھا گیا ہے کہ اس کو دینے میں اللہ سے برکت و کثرت خیر کی اُمید وابستہ کی جاتی ہے یا پھر اس لئے کہ اس کے ذریعہ نفس کی پاکیزگی و بالیدگی ہوتی ہے۔ یعنی اسے فضائل و برکات کے ذریعہ نشو ونما بخشی جاتی ہے۔"

پھر وہ لکھتے ہیں:

"اور نفس کی طہارت ہی کے ذریعہ انسان وہ مقام حاصل کر سکتا ہے جس سے وہ دُنیا میں صفات محمودہ اور آخرت میں اجر و ثواب کا مستحق ہوجائے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ انسان ایسے کاموں کا قصد کرے جن میں اس کی تطہیر کا سامان ہو۔"[5]

---

[1] ۔ دیکھئے سیرۃ النبی جلد پنجم از سلیمان ندوی: ۲۰۸ (طبع سوم) [2] ۔ تاج العروس
[3] ۔ تاج العروس ولسان العرب۔ [4] ۔ ابن فارس، مقاییس اللغہ۔ [5] ۔ مفردات راغب

قرآن مجید نے زکواۃ کو ربا کے بالمقابل بیان کیا ہے[۱] ربا میں جہاں محتاجوں سے ناجائز فائدہ اُٹھایا جاتا ہے "زکواۃ" میں آسودہ حال افراد اور محتاجوں کے درمیان توازن پیدا کیا جاتا ہے۔

ہمارے خیال میں قرآن مجید میں جماعت مسلمین سے متعلق جہاں کہیں اِنفاق، ایتاءِ مال، مال میں حق معلوم، اِطعام مساکین، قرض حسن، جہاد بالاموال وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے ان سے "زکواۃ" بھی مقصود ہے۔

قرآن مجید میں" ایتاء زکواۃ "مطلقاً" ایک مالی فریضہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ نہ اس میں زکواۃ کے لئے کوئی نصاب مقرر ہے نہ مقدار۔ ان سب جزئیات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی سنت بیان کرتی ہے[۲] البتہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ "زکواۃ" کا حکم مدنی زندگی کی طرح مکی زندگی میں بھی موجود تھا۔

صدقہ کی مختصر تشریح

اس لفظ کے مادی معنی سچائی، قول کا اعتقاد وضمیر کے مطابق ہونا۔ ظاہر و باطن کا یکساں ہونا، نیز کسی چیز سے جو توقع کی جائے اس پر اس کا پورا اُترنا ہیں[۳] بنا بریں ہر اس عمل کو جو اللہ پر ایمان کی تصدیق کرتے ہوئے انجام دیا جائے "صدقة" کہا جاتا ہے[۴]۔ اور چونکہ اللہ تعالیٰ بِرّ، رفاہِ عامہ، ہمہ گیر صلاح، احسان، خیر اور اخلاق فاضلہ پسند کرتا ہے لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ان تمام کاموں کے لئے جو رذائل و بخل دور کرتے ہیں یا جن سے نفس کو مہذب و شائستہ بنایا جاتا ہے یا جن سے اجتماعی اُلفت و محبت اور انسانوں میں ہمدردی پیدا ہوتی ہے "صَدَقات" فرمایا ہے[۵] صدقة کے معنے

۱۔ دیکھئے سورہ الروم آیت ۳۹۔ ۲۔ آپ ابو عبیدؒ کی کتاب الاموال کے ترجمہ میں زکواۃ سے متعلقہ سنت کی تفاصیل ملاحظہ فرمائیں گے۔ ۳۔ مفردات راغب۔ ۴۔ تاج العروس

۵۔ حجۃ اللہ البالغہ، مطبع صدیقی : ۲۴۱۔

"ما اعطیتہ فی ذات اللہ للفقراء": "جو کچھ اللہ تعالیٰ کی خاطر تم محتاجوں کو دو"[1]

یا "ما تصدقت بہ علی الفقراء": "جو کچھ تم اللہ پر یقین اور اس سے اجر حاصل کرنے کے لئے محتاجوں کو دے دو"[2] امام راغب نے صدقہ کی تعریف اس طرح کی ہے:-

الصدقۃ ما یخرجہ الانسان من مالہ علی وجہ القربۃ کالزکاۃ:	صدقہ وہ چیز ہے جو انسان اپنے مال میں سے قرب الٰہی کے حصول کی خاطر نکالتا ہے، جیسے زکوٰۃ۔

قرآن مجید میں بھی یہ لفظ بالعموم اس مال کے لئے استعمال کیا گیا ہے جو اللہ پر یقین رکھتے ہوئے اور اس سے اجر و بخشش کی اُمید پر فقراء و مساکین کے لئے دیا جاتا ہے۔ اس میں نجی طور پر رضاکارانہ دی ہوئی مالی امداد و عطیات اور نظام جماعت کے تحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم (اور آپ کے خلفاء یا امیرالمسلمین) کو دئے جانے والے معینہ واجبات مالی دونوں آجاتے ہیں۔ نجی اور رضاکارانہ خیرات و عطیات کے ضمن یہ آیات ملاحظہ ہوں:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ (البقرہ: ۲۶۴)	اے ایمان والو! اپنے عطیات کو احسان یا اذیت سے اکارت نہ کرو دو[3]
إِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَإِنْ تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَكُمْ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ	اگر تم صدقات ظاہر کر کے دو تو یہ خوب ہے اور اگر تم انہیں پوشیدہ طور پر فقراء کو دے دو تو وہ تمہارے لئے بہتر ہے اور

---

[1] - تاج العروس۔ [2] - صحاح از جوہری۔ [3] - اس لئے کہ احسان جتانے کا موقع اسی وقت مل سکتا ہے جب کوئی کسی پر انفرادی شکل میں احسان کرے۔ اجتماعی شکل میں بیت المال سے ملنے والی مدد پر کوئی کسی قسم کا احسان جتا ہی نہیں سکتا۔

سَيِّئَاتِكُمْ (البقرۃ: ۲۷۱)	یہ تمہاری برائیوں کو تم سے مٹا دے گا۔
قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ	بھلی بات اور معاف کر دینا اس صدقہ
مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَا اَذًى	سے بہتر ہے جس کے پیچھے اذیت ہو۔
(البقرۃ: ۲۶۳)	

نظام کے تحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا مسلم ائمہ (حکام وخلفاء) کو دئے جانے والے صدقات کے لئے ذیل کی آیات ملاحظہ ہوں:

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً	آپ ان کے اموال میں سے صدقہ
تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا	لیجئے اور اس کے ذریعہ ان کی تطہیر و
(التوبہ: ۱۰۴)	تزکیہ کیجئے۔
اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِيْنِ	صدقات فقراء و مساکین اور اس پر
وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا ..... الخ (التوبہ: ۶۰)	مامور کارندوں کے لئے ہیں..... الخ

الغرض صدقہ رضاکارانہ عطیہ اور مالی واجبات جو اسلامی حکومت کی طرف سے معین و فرض ہوں دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ مؤخر الذکر مفہوم میں صدقہ بمعنی زکواۃ کتب احادیث و فقہ میں بکثرت استعمال ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ آپ دیکھیں گے کہ امام ابو عبیدؒ نے زکواۃ سے متعلق تمام تفاصیل کے لئے جو ابواب لکھے ہیں انہیں وہ "کتاب الصدقة"[۲] کے تحت لائے ہیں۔

صدقہ اس مال کو بھی کہہ دیا جاتا ہے جو عوام کی فلاح و بہبود کے لئے حکومت کی زیر نگرانی رہتا ہے مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی: "لانورث ما ترکنا صدقة"[۳] ہم کسی کو وارث نہیں بناتے جو کچھ ہم نے چھوڑا وہ صدقہ ہے۔

---

[۱] - اس لئے کہ نظام کے تحت مقررہ صدقات تو بہرحال معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا حساب کتاب رہتا ہے اور اللہ کے سوا وہ دوسروں کو بھی معلوم ہو جاتے ہیں لہٰذا ان کا اخفاء مشکل ہوتا ہے۔

[۲] - کتاب الاموال: ۳۴۹ [۳] فتوح البلدان للبلاذری: ۴۴؛ صحیح مسلم ۲: ۹۰، کارخانہ تجارت کتب

اور پھر اس صدقہ کی تعریف خود آپؐ اس طرح فرماتے ہیں: فَاِذَا مِتُّ فَهُوَ اِلٰی وَالِی الْاَمْر بعدی[1]۔ یعنی میرے مرنے کے بعد ان اموال کا نگران والی (حاکم) ہو گا۔ اسی صدقہ کی توجیہ کرتے ہوئے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہؓ کو جب وہ خیبر اور فدک سے اپنا حصۂ میراث کا مطالبہ کرتی ہوئی تشریف لائی تھیں یہ جواب دیا تھا۔

یا بنتَ رسول اللہ سمعت رسول اللہِ صلی اللہ علیہ وسلّم یقول: "اِنّمَا هِیَ طُعْمَةٌ اَطْعَمَنِیهَا اللہ حیاتی فَاِذَا مت فهی بین المسلمین[2]"

اے بنتِ رسول اللہ! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ یہ اموال اللہ نے مجھے تا حیات عطیہ دئے ہیں اور جب میں مر جاؤں گا تو وہ مسلمانوں کے درمیان رہیں گے۔

اور شاید اسی جہت سے کبھی کبھی جزیہ کے لئے بھی ہماری کتابوں میں "صدقہ" کا لفظ بول دیا جاتا ہے۔ مثلاً بنو تغلب کے عیسائیوں نے جب "جزیہ" دینے کو ناپسند کیا اور جزیہ کے نام سے بیزاری کا اظہار کیا اور کہا کہ ہمارے اُوپر جزیہ کے نام کے بجائے "صدقہ" کے نام سے جتنا چاہیں زیادہ وصول کریں تو حضرت عمرؓ نے ان پر مسلمانوں سے لئے جانے والے صدقہ کا دگنا صدقہ مقرر کر دیا اور اسے (صَدقة مضاعفة) دُگنے صدقہ کا نام دیا[3]۔ ہمارے خیال میں یہ بہر حال جزیہ ہی تھا اور اس کے مصارف جزیہ کے مصارف کی طرح تھے۔ محض نام کے اتحاد کی وجہ سے امام ابو عبیدؒ اس پورے باب کو "کتاب الصدقة" میں لے آئے ہیں۔ حالانکہ

ف۱ ۔ فتوح البلدان: ۴۵ ف۲۔ ایضاً ۴۵۔ اسی طرح مخیریق کے اموال کے لئے الاصابہ ۳: ۳۷۳ میں ہے کہ جعلها النبی صلی اللہ علیہ وسلم صدقة۔

ف۳ ۔ تفصیل کتاب الاموال میں نمبر ۱۶۹۳ سے ۱۶۹۹۔ بعض روایات میں اس کا نام عشر مضاعف ہے۔ دیکھئے نمبر ۱۷۰۷۔ کتاب الاموال۔ مزید تفصیل کے لئے دیکھئے کتاب الخراج یحییٰ بن آدم نمبر ۲۰۶ ــ ۲۰۸ نیز کتاب الخراج لابی یوسف: ۱۴۳

اس کی صحیح جگہ حصۂ اول میں تھی۔

صدقہ کے اس معنی کے متعلق قاضی عبدالوہاب مالکی نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے:۔

کانوا یطلقون علی الجزیۃ اسم الصدقۃ۔[1]

علماء بلا قید کے (مطلقاً) جزیہ کے لئے صدقہ کا لفظ استعمال کرتے تھے۔

اس طرح حکومت کے بیت المال کی تحویل میں آنے والے ہر مال کو "صدقہ" کہہ دیا جاتا تھا جس کا ترجمہ ٹیکس بھی کیا جا سکتا ہے مثلاً آپ دیکھیں گے کہ کتاب الاموال میں ابوعبید رح شراب پر لگائی جانے والی ڈیوٹی (ٹیکس) کو "صدقۃ الخمر"[2] لکھتے ہیں۔ اسی طرح ایک روایت میں وہ لکھتے ہیں: الصدقۃ علی من تجر من اھل الکتاب" یعنی اہل کتاب میں سے جو تجارت کرے اس پر صدقہ واجب ہوگا۔[3]

کبھی کبھی صدقۃ بمعنی نفقہ وخرچ بھی آجاتا ہے[4] مثلاً مخیریق (ایک یہودی عالم) کی وصیت کے مطابق غزوۂ اُحد کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اس کی دولت اور جائداد وغیرہ کو اپنی تحویل میں لیا تو آپؐ نے اسے صدقہ (بیت المال کی ملکیت) قرار دیا اس کے بعد ہے۔

فعامۃ صدقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالمدینۃ منھا۔[5]

تو مدینہ میں رسول اللہ صلعم کے عام صدقات اسی (مخیریق کی جائداد) سے ہوتے تھے۔

یہاں صدقات سے مراد آپؐ کے جملہ اخراجات ہیں جن میں گھر کے اخراجات

---

[1]۔ فتح الباری مع صحیح البخاری (مطبع خیریہ ۱۳۱۹ھ) جزء ثالث: ۲۰۱

[2]۔ دیکھئے کتاب الاموال: ۵۱ نمبر ۱۳۱۔ یہاں خود حضرت عمرؓ نے بھی "صدقۃ الخمر" ہی لکھا ہے۔ [3] کتاب الاموال ۹۱ (نمبر ۲۵۲) [4] مختصر کتاب العالم والمتعلم لابی بکر محمد بن عمر الترمذی المتوفی ۲۸۰ھ: ۵۱۔ [5]۔ سیرۃ ابن ہشام ۲: ۱۴۰

غریبوں کی امداد، جنگی اور ملکی انتظامی اخراجات سب ہی شامل ہیں[1]

زکواۃ وصدقہ کا فرق

علمائے حدیث وفقہ نے صدقہ وزکواۃ کی شرح میں بہت کچھ لکھا ہے۔ چنانچہ کتب حدیث وفقہ میں صدقہ یا زکواۃ کے ذیل میں ان دونوں سے متعلق تفاصیل ملتی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان دونوں لفظوں کا فرق بتانا مشکل مسئلہ بنا ہوا ہے۔ امام شافعی لکھتے ہیں:

والزکاۃ صدقۃ[2] ـــــ اور زکواۃ صدقہ ہے۔ دوسری جگہ ان کا لکھنا ہے: والزکاۃ صدقۃ کلاھما لھا اسم[3] اور زکواۃ صدقہ ہے دونوں زکواۃ کے نام ہیں۔

پھر اسی کے اتباع میں امام ماوردی لکھتے ہیں:

الصدقۃ زکاۃ والزکاۃ صدقۃ یفترق الاسم ویتفق المسمی[4]	صدقہ زکواۃ ہے اور زکواۃ صدقہ ہے نام جدا جدا ہیں لیکن جس کا نام لیا ہے وہ ایک ہی چیز ہے۔

لیکن ایک ہی چیز کے دو ایسے نام جو ہر حیثیت سے برابر ہوں اور قرآن مجید میں جہاں ان میں سے ایک نام کا استعمال ہو وہاں ہم اس سے وہی چیز سمجھیں جو دوسرے نام سے پکاری گئی ہے اسلوب قرآن کے موافق نہیں معلوم ہوتا۔

اسی طرح عربی مادوں کے اشتقاق اور ان مادوں کے بنیادی معنوں کے لحاظ سے یہ ضروری ہے کہ دو مختلف الفاظ اپنے معانی میں بھی کچھ نہ کچھ مختلف ہوں۔

---

[1] ۔مزید تفصیل کے لئے دیکھئے الاحکام السلطانیہ للماوردی جہاں وہ لکھتے ہیں فکانت من صدقاتہ یضعھا حیث یشاء وینفق منھا علی ازواجہ: ۱۶۳۔ صدقہ کے معنے نفقہ کے فتح الباری ۳: ۱۶۸ مطبع خیریہ میں بھی مذکور ہیں۔ [2] کتاب الام للشافعی ۲: ۱۷، [3] کتاب الام للشافعی ۲: ۶۰

[4] ۔ الاحکام السلطانیہ: ۱۰۸

خود مکۃ اور بکۃ کی بحث میں ماوردی لکھتے ہیں کہ کچھ لوگ تو ان دونوں کو ایک معنی میں سمجھتے ہیں لیکن دوسروں کا کہنا ہے :

اختلاف الاسماء موضوع لاختلاف المسمّی [۱] ناموں کا اختلاف مسمی کے اختلاف کی وجہ سے وضع کیا جاتا ہے۔

ہم بھی موخرالذکر گروہ کے ہم خیال ہیں اور ان دونوں الفاظ میں کچھ فرق معلوم کرنے کے خواہشمند ہیں۔

جہاں تک قرآن مجید کا تعلق ہے ہم دیکھتے ہیں کہ اس میں ایتاء زکواۃ " بتکرار مسلمانوں پر فرض قرار دیا گیا ہے اور ایتائے زکواۃ کے مختلف طریقوں میں سے ایک طریقہ کو صدقہ کہا گیا، قرآن مجید میں زکواۃ کے مصارف کا تعین نہیں جبکہ صدقات کے مصارف کا تعین ہے۔

"صدقہ" بھی اپنے معانی کے لحاظ سے بڑی عمومی حیثیت رکھتا ہے۔ تاہم یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہر صدقہ "زکواۃ" ہوتا ہے۔ ہمیں اتنا معلوم ہے کہ "صدقات" کے مصارف محدود ہیں اور زکواۃ کے مصارف قرآن مجید میں محدود نہیں۔ امام ابو عبیدؒ لکھتے ہیں کہ صدقہ اموال مسلمین کی زکواۃ ہے جو سونے چاندی، اونٹ، گائے بھیڑ بکری غلہ اور پھلوں پر لی جاتی ہے۔ یہ ان آٹھ اصناف میں محدود رہے گا جن کے نام اللہ نے متعین فرما دئے ہیں [۲]۔ ان کے سوا لوگوں میں سے کسی اور کا اس میں کوئی حق نہیں ہے [۳] پھر وہ فئے کے مصارف میں کہتے ہیں کہ یہ تمام مسلمانوں کے لئے عام ہے خواہ وہ امیر ہوں یا فقیر، اسی سے جانباز فوجیوں کو عطایا ملیں گے اور اسی سے اہل وعیال کے وظیفے دئے جائیں گے اور اسی آمدنی سے سربراہ مملکتِ اسلامی لوگوں کے دیگر (رفاہی وانتظامی) امور اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے انجام دے گا [۴] ایک اور مقام پر ابو عبیدؒ خمس و فئے اور صدقہ

---

[۱] - الاحکام السلطانیہ: ۱۵۲ - [۲] دیکھئے سورۃ التوبۃ ۹ : ۶۱ - [۳] کتاب الاموال ۱۹: (نمبر ۴۲) - [۴] کتاب الاموال ۱۶۲ (نمبر ۱۴)

کا فرق بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ ائمہ و علماء میں سے کوئی بھی ہمیں ایسا نہیں ملتا جو صدقہ کو اس کے متعینہ آٹھ اصناف[1] سے ہٹا کر کسی اور کو دینے کے حق میں ہو اور اس اعتبار سے خمس (فئے) اور صدقہ کے حکم میں اختلاف ہو جاتا ہے[2] گویا امام ابو عبیدؒ کے نزدیک صدقہ کے اخراجات محدود ہیں اور فوج اور حکومت کے انتظامی اخراجات فئے میں سے کئے جائیں گے۔

امام ابو عبیدؒ کے ہاں اس سلسلہ میں ایک اور قابلِ غور چیز یہ ہے کہ انہوں نے معادن اور رکاز نیز سمندری پیداوار کا ذکر "کتاب الصدقہ" میں نہیں بلکہ "کتاب الخمس" میں کیا ہے جو ان کے نزدیک فئے میں شامل ہے اور حصۂ اول میں گذر چکا ہے جبکہ ہمارے بعض محدثین و فقہاء نے ان چیزوں کو صدقہ یا زکوٰۃ میں درج کیا ہے[3] واضح رہے کہ امام ابو عبیدؒ کے نزدیک "خمس" کے اخراجات "صدقہ" کے اخراجات سے علیحدہ ہیں۔ ان کے نزدیک "خمس" کے اخراجات میں دفاع و انتظامی امور شامل ہیں جو صدقہ کے مصارف میں نہیں[4]۔ ہمارے خیال میں معدنیات اور سمندری اشیاء سے جو کچھ بھی مسلمانوں سے وصول کیا جائے گا خواہ "خمس" ہو یا عشر وہ صدقہ بنے گا اور وہ زکوٰۃ ہی کہلائے گا[5] البتہ ہم زکوٰۃ کے مصارف کو مصارفِ صدقہ کی طرح محدود سمجھنے کو غور طلب مسئلہ خیال کرتے ہیں۔

شاہ ولی اللہؒ زکوٰۃ کو ایک ہمہ گیر مالی مطالبہ بتاتے ہیں جس میں نہ صرف انسانوں کو مالی محبت سے نکال کر سخاوت کا خوگر بنایا جاتا ہے۔ وہ اسے صرف فقر و فاقہ اور حاجت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کا بھی ذریعہ نہیں خیال کرتے بلکہ ان کے نقطۂ نظر سے زکوٰۃ مملکت کی

---

[1]۔ دیکھئے قرآنِ مجید کی سورۃ التوبۃ: ۶۱۔ [2] کتاب الاموال ۳۲۷ (نمبر ۸۳۸)

[3]۔ دیکھئے موطا امام مالک میں کتاب الزکاۃ کے تحت باب الزکاۃ فی المعادن اور باب زکاۃ الرکاز از صفحہ ۲۴۸ تا ۲۴۹ مطبوعہ مصر مع تصحیح محمد فواد عبدالباقی، ۱۳۷۰ھ

[4]۔ دیکھئے فئے کے مصارف کتاب الاموال: ۱۶ (نمبر ۴۲)

[5]۔ جیسا کہ کتاب الام میں امام شافعی نے لکھا ہے۔ دیکھئے جلد ۲: ۷۱

تمام فوجی اور انتظامی ضروریات کی کفیل بھی ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے زکوٰۃ کی مقدار باندازۂ مصارف مقرر فرمائی تھی[۱] ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ ذیل میں شاہ ولی اللہ کی زکوٰۃ سے متعلق عبارت درج کردیں:

اعلم ان عمدۃ ما روعی فی الزکاۃ مصلحتان مصلحۃ ترجع الی تہذیب النفس وھی انہا أحضرت الشُّحّ والشُّحّ اقبح الاخلاق ضارتہا فی المعاد ومن کان شحیحاً فانہ اذا مات بقی قلبہ متعلقاً بالمال وعُذّب بذلک ومن تمرّن بالزکوٰۃ وأذلّ الشُّحّ من نفسہ کان ذلک نافعاً لہ، وأنفع الأخلاق فی المعاد بعد الاخبات للہ تعالیٰ ھو سخاوۃ النفس ....[۲]

واضح رہے کہ زکوٰۃ میں بنیادی طور پر جو امور ملحوظ رکھے گئے ہیں وہ دو مصلحتوں پر مشتمل ہیں پہلی مصلحت تو تہذیب نفس سے متعلق ہے اور وہ یہ ہے کہ نفس میں مال کی شدید حرص و محبّت موجود ہے اور یہ مالی حرص کی شدت اخلاق کی بدترین قسم ہے جو آخرت میں نفس کے لئے مضرت رساں ہے اور جو اس درجہ مال کی حرص میں مبتلا ہو تو مرے بعد بھی اس کا دل مال میں لٹکا رہتا ہے اور اس سبب سے اسے عذاب دیا جاتا ہے، لیکن جو زکوٰۃ کا عادی ہوجاتا ہے اور اپنے نفس کی اس مالی حرص کو زیر کرلیتا ہے تو یہ چیز اس کے لئے سود مند ہوتی ہے اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کے حضور عجز و انکساری سے بندگی بجالانے کے بعد تمام اخلاق میں سب سے زیادہ نفع بخش عادت یہی ہے اور وہ ہے سخاوت نفس۔

---

۱ - حجۃ اللہ البالغہ ۲۳۸ (مطبع صدیقی) ان کے الفاظ یہ ہیں: وَجَعَلَ الجبایۃ بحسب المَصَارِف۔ ۲ - حجۃ اللہ البالغہ للشاہ ولی اللہ، مطبع صدیقی: ۲۳۱

آگے چل کر وہ دوسری مصلحت کو اس طرح بیان کرتے ہیں:-

ومصلحة ترجع الى المدينة وهي انها تجمع لامحالة الضعفاء وذوي الحاجة وتلك الحوادث تغدو على قوم وتروح على آخرين، فلو لم تكن السنة بينهم مواساة الفقراء واهل الحاجات لهلكوا وماتوا جوعا وايضا فنظام المدينة يتوقف على مال يكون به قوام معيشة الحفظة الذابين عنها و المدبرين السائسين لها، ولما كانوا عاملين للمدينة عملا نافعا مشغولين به عن اكتساب كفافهم وجب ان يكون قوام معيشتهم عليها والانفاقات المشتركة لا تسهل على البعض او لا يقدر عليها البعض فوجب ان يكون جباية الاموال من الرعية

اور زکوٰۃ کی دوسری مصلحت کا تعلق ملکی امور سے ہے۔ ظاہر ہے کہ ملک میں کمزور و حاجتمند سب ہی یکجا ہوتے ہیں اور حوادث کبھی ایک گروہ کو شکار کر لیتے ہیں اور کبھی دوسرے کو، اندریں صورت اگر ان کے درمیان فقیروں اور حاجتمندوں کی دست گیری و مواسات کا طریقہ رائج نہ ہو تو لوگ بھوکوں مر جائیں گے۔ نیز یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ملکی امور کا دارومدار اس مال پر ہے جس سے اس کی پاسبانی اور دفاع کرنے والوں اور انتظامی امور کا نظم و نسق چلانے والوں کا گذر بسر ہو سکے اور چونکہ یہ لوگ ملک کے لئے مفید خدمات انجام دیتے ہیں اور اپنی ان ضروریات کی وجہ سے گذر بسر کا کوئی دوسرا پیشہ اختیار نہیں کر سکتے لہٰذا ضروری ہے کہ ان کی گذر بسر کا بار ملک (کی زکوٰۃ) پر ہو، اور اس قسم کے مشترکہ اخراجات ملک کے کچھ لوگ آسانی سے برداشت نہیں کر سکتے یا ان میں اس کی قدرت ہی نہیں ہے لہٰذا ضروری ہے کہ تمام رعیت سے مال کی وصولی کا طریقہ رائج کیا جائے۔ اور چونکہ مصلحت کے اعتبار سے

سنۃً ولما لم یکن اسھل ولا اوفق بالمصلحۃ من ان یجعل احدی المصلحتین مضمومۃ بالاخری ادخل الشرع احدٰھما فی الاخریٰ[۱]

اس سے زیادہ کوئی آسان اور مناسب صورت ہی نہ تھی کہ ان ہر دو مصلحتوں کو ایک دوسری میں ضم کر دیا جائے لہٰذا شریعت نے ان دونوں میں سے ایک کو دوسری میں شامل کر لیا۔

اس طرح شاہ ولی اللہؒ کی تحقیق کے مطابق اسلامی مملکت میں مسلمانوں سے جو زکوٰۃ لی جائے گی وہ رفاہِ عامہ اور حکومت کے جملہ انتظامی و دفاعی محکموں پر خرچ ہوگی۔ ان کے نقطۂ نظر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو مقدار مقرر فرمائی تھی وہ حسب مصارف تھی۔ فئے و غنائم کی بے پناہ آمدنیوں کے ختم یا بہت کم ہو جانے کے بعد مملکتِ اسلامی کے پاس بڑھتے ہوئے اخراجات کے لئے زکوٰۃ کے سوا کوئی دوسرا مطالبہ نہیں ہوتا۔ شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں :۔

ان الحاجات غیر محصورۃ ولیس فی بیت المال فی البلاد الخالصۃ للمسلمین غیر الزکوٰۃ کثیرُ مالٍ فلا بدّ من توسعۃ لتکفی نوائب المدینۃ واللہ اعلم[۲]

بلا شک ضرورتیں غیر محدود ہیں اور خالص مسلمانوں کی آبادی پر مشتمل ممالک میں زکوٰۃ کے علاوہ زیادہ مال (حاصل کرنے کی کوئی صورت) نہیں، لہٰذا اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ (زکوٰۃ میں) اضافہ و توسیع کی جائے تاکہ وہ (زکوٰۃ) ملک کو درپیش ہونے والی تمام ضروریات کے لئے کافی ہو سکے۔ واللہ اعلم

الغرض یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی حکومت کے اپنی مسلمان رعایا سے جو مالی مطالبات ہوں گے خواہ وہ رفاہِ عامہ کے لئے ہوں یا ملک سے فقر و فاقہ دور کرنے کے لئے ہوں۔

۱۔ حجۃ اللہ البالغہ : ۲۲۳ و ۲۳۴ - ۲۔ حجۃ اللہ البالغہ : ۲۳۹ (مطبع صدیقی)

دفاع کے لئے ہوں یا دیگر انتظامی محکموں کے لئے ان سب مطالبات کا ایک نام "زکواۃ" ہوگا لیکن مختلف زمانوں میں مختلف حالات کے مطابق زکواۃ کی جو مقادیر مقرر ہوئیں یا مختلف چیزوں پر جو نئے مالی واجبات لگائے گئے وہ صدقہ کہلائیں گے۔ اور ان صدقات میں سے صرف وہی صدقات ابدی ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے مقرر فرمائے، بقیہ صدقات میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ اسلامی مملکت میں مسلمانوں سے مختلف ناموں سے جو بھی مالی واجبات حسب مصارفِ حکومت وصول کئے جائیں گے۔ ان سب کا ایک ہی نام "زکواۃ" ہوگا اور جن اجزاء یا قسطوں میں وہ زکواۃ وصول کی جائے گی وہ "صدقات" کہلائیں گے۔ واضح رہے کہ زکواۃ وصدقات اپنے ان معنوں میں کہ وہ اللہ و رسول اور اسلامی حکومت کی طرف سے متعین ہوں فریضہ ہوتے ہیں یہ نجی صدقات و خیرات کی طرح نہیں ہوتے۔ لہٰذا ان کو وصول کرنا، ان کا پورا پورا انتظام کرنا ان کو امانت داری سے صحیح جگہوں پر صرف کرنا تمام تر حکومت اسلامی کا فریضہ ہے اور اسلامی مملکت میں حکومت کے سوا کسی نجی فرد یا ادارہ کو قطعاً حق حاصل نہیں ہوگا کہ وہ "صدقہ مفروضہ یا زکواۃ" کے نام سے کوئی مطالبہ کرے۔

عہدِ نبوی ؐ اور خلافتِ راشدہ میں فئے کی بے پناہ آمدنی کے باعث اللہ کے حکم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا فرض کیا ہوا "صدقہ" ہی مسلمانوں سے لیا گیا[۱] اور وہی "زکواۃ" کہلایا، اسے انہی آٹھ مدوں میں محدود رکھا گیا جن میں قرآن مجید نے صدقات کو محدود فرمایا ہے۔ صدقہ کا باقاعدہ نصاب اور مقدار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے آیت خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً[۲] کے نزول کے بعد مقرر فرمایا۔

---

[۱] - اگرچہ اُس زمانہ میں بھی بعض چیزوں پر صدقہ کا اضافہ ہوا مثلاً گھوڑوں پر صدقہ، سمندر سے نکلنے والے قیمتی سامان پر صدقہ وغیرہ۔ اور یہ سب لئے جانے والے نئے صدقات زکواۃ میں شمار کئے جاتے رہے [۲] التوبۃ ۹ : ۱۰۴، ابن خلدون بحوالہ طبری لکھتے ہیں کہ ۹ھ میں اس آیت کے نزول پر صدقات فرض کئے گئے۔ تاریخ ابن خلدون ۲ : ۲۵۰۔

اہلِ علم سے مخفی نہیں کہ "زکواۃ" ہی قرآن مجید و احادیث کی رو سے ایک بڑا مالی فریضہ ہے جو اپنی وضاحت کے لحاظ سے کسی استدلال کا محتاج نہیں اور اس لفظ کا اطلاق عموماً زکواۃ مفروضہ کے لئے ہی ہوتا ہے گو بعض علماء نے تطوعاً خیرات و صدقہ کو بھی زکواۃ کہہ دیا ہے۔ اس کے برخلاف صدقہ کا لفظ صدقہ مفروضہ اور صدقہ تطوع کے لئے عام ہے۔ اسی وجہ سے ہماری کتب احادیث و فقہ میں صدقات کے بیان میں ہر قسم کے صدقہ عام طور پر یکجا کر دئے جاتے ہیں اور ان کے احکام گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ بہت ہی کم ایسی کوشش کی گئی ہے جس میں صدقہ مفروضہ اور صدقہ تطوع کو جداگانہ بیان کیا گیا ہو۔ اس ضمن میں احیاء علوم الدین میں امام غزالیؒ نے توجہ فرمائی ہے لیکن وہ پہلی کوشش ہے اور بعد میں آنے والوں کو مزید توجہ دلاتی ہے۔

الغرض زکواۃ و صدقہ میں ہمیں کوئی فرق متعین کرنا چاہیئے۔ اکثر کتب حدیث میں ایک ہی چیز کے لئے کہیں صدقہ اور کہیں "زکواۃ" آجاتا ہے لیکن کہیں بھی اس صدقہ کے لئے جو محمدؐ اور آلِ محمدؐ کے لئے حرام ہے "صدقہ" کے سوا "زکواۃ" کا لفظ نہیں ملتا۔ اور ہمارا خیال ہے کہ اس سے مراد صرف وہی صدقہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے مقرر فرمایا تھا صدقہ و زکواۃ کے فرق میں اس پر مزید تحقیق مفید رہے گی۔ ہمارے تجزیہ کے مطابق (جو یقیناً پہلی کوشش اور خطا و لغزش سے مبرّا نہیں) "زکواۃ" نام ہے ان تمام مالی مطالبات کے مجموعہ کا جو اسلامی حکومت اپنی مسلم رعایا سے طلب کرے۔ اور "صدقہ مفروضہ" زکواۃ کے اس حصّہ کا نام ہے جو کسی چیز پر کسی زمانہ میں حکومتِ اسلامی مقرر کر دے۔ ہمارے خیال میں صدقہ جب بمعنی زکواۃ ہوتا ہے تو وہ تسمیۃ الکل باسم الجزء[1] کے طور پر ہوتا ہے۔

---

[1] یعنی کسی چیز کے جزء سے اس کے کل کا نام رکھ لینا مثلاً "رقبۃ" معنی تو گردن ہیں لیکن اس سے مراد جان اور پورا شخص ہوتا ہے یا "رأس" کے معنے تو سر ہیں لیکن اس سے مراد پورا ایک شخص ہوتا ہے یا "رکعۃ" معنی تو ایک رکوع کرنا ہیں لیکن اس سے مراد نماز کا وہ پورا حصہ لیا جاتا ہے جس میں قیام، رکوع، قومہ، سجدہ آجاتے ہیں۔

ہماری اس تحریر سے ہرگز یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ ہم صدقہ مفروضہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (بحکم الہٰی) میں کسی تغیر کے قائل ہیں ۔ حاشا وکلّا، ہم تو اسے اس کی تمام تفاصیل کے ساتھ روبعمل دیکھنے کے متمنی ہیں کیونکہ تمام دنیا کے مسلمانوں میں فقر وغنی کے توازن کو برقرار رکھنے کے لئے اس سے زیادہ کامیاب پروگرام پیش کرنا کسی انسان کی طاقت سے باہر ہے ۔ ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے حکم کے بموجب مسلمانوں کے اموال پر یہ کم سے کم واجب الادا صدقہ (زکواۃ) فرض کیا تھا جس کا ادا کرنا مسلمانوں پر بہرحال فرض ہے ۔ اب اگر کوئی اسلامی حکومت اپنے انتظامی اخراجات کے اعتبار سے مزید مالی واجبات مسلمانوں پر فرض کرے گی تو اس کا نام بھی "صدقہ" ہی ہوگا جو زکواۃ کا جزء بنے گا ۔ اس نئے صدقہ اور رسول اللہ ؐ کے مفروضہ صدقہ میں فرق یہ ہوگا کہ رسول اللہ ؐ کا مفروضہ صدقہ ابدی رہے گا، اس میں کوئی تغیر نہ ہوگا جبکہ دوسرے صدقات میں کمی بیشی ہوتی رہے گی ۔ اسلامی ریاست میں اسلامی حکومت مسلمانوں سے "زکواۃ" کے سوا کیا مطالبہ کرسکتی ہے ؟ اور ایک مسلم شہری اسلامی ریاست کے مالی مطالبہ کی ادائی کے بعد کسی مزید زکواۃ کی ادائی کے لئے کیوں پریشان و بے قرار رہے ۔؟؟

ہمارے خیال میں ایک مسلم شہری اپنی اسلامی حکومت کے جملہ مالی واجبات ادا کردینے کے بعد کسی مزید مالی فریضہ کا بوجھ برداشت نہیں کرے گا ۔ اور مالی فریضہ وصول کرنے کا اسلامی حکومت کے علاوہ کوئی حق نہیں رکھتا ۔ البتہ ہم اسلامی حکومت کو مشورہ دیں گے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرض کئے ہوئے صدقہ (زکواۃ) کو بعینہٖ اس کے نصاب و مقدار سے وصول کرے اور اس کے اخراجات میں امانت واحتیاط سے کام لے کر اسے اس کے مقرر کردہ مستحقین میں تقسیم کرے اور یاد رکھے کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فضول خرچیوں

اور اسراف سے منع فرمایا ہے اور بلا ضرورت نئے نئے مالی واجبات لگا کر مال اُڑانے سے روکا ہے :-

نھی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن اضاعۃ المال فلیس لہ ان یضیع اموال الناس بعلۃ الصدقۃ۔[۱]	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مال ضائع کرنے سے منع فرمایا لہٰذا اسے (عامل حاکم کو) حق نہیں ہے کہ وہ صدقہ (واجبات مال) کے سبب سے لوگوں کے مال کو تلف کرے۔

اسی طرح آپؐ کا ارشاد ہے :-

مَن اخذ اموال الناس یرید اتلافھا اتلفہ اللہ ۔ ۔ ۔ ۔[۲]	جو تلف کرنے اور بے جا اُڑا دینے کے لئے لوگوں کا مال لے گا اللہ اسے تباہ کردے گا۔

خلاصہ یہ کہ ایک اسلامی حکومت کو صدقہ مفروضۂ رسول اللہؐ کے وصول کرنے اور اسے اس کے مصارف میں خرچ کرنے کی پوری ذمہ داری لے کر عامۃ المسلمین کو دوہری وفاداریوں اور مملکت کو انتشار و خلفشار اور حکومت در حکومت کے عذاب سے نجات دلانا چاہیئے۔ اسلامی ریاست میں مسلمان عوام کا دو مختلف طاقتوں کو مالی واجبات ادا کرنا مضحکہ خیز صورت ہے۔ یہ بات کہ رسول اللہؐ کے علاوہ اسلامی حکومت جو مالی واجبات عائد کرے صدقہ و زکواۃ کہلائیں گے امام شافعیؒ کے الفاظ میں سنیئے :-

وکُلّ ما وَجَبَ علیٰ مسلم فی مالہ بلا جنایۃ جناھا اوجناھا من یکون	اور وہ سب کچھ جو مسلمان پر اپنے مال میں سے ادا کرنا ضروری (واجب) ہو، جس میں اس کے کسی جُرم کا تاوان یا کسی ایسے مجرم کا کیا

---

[۱] صحیح البخاری مع فتح الباری (مطبع خیریہ) ۳ : ۱۹۰۔ [۲] ایضاً : ۱۸۹

علیه العقل ولا تطوّع تطوع به ولا شئ اوجبه هو فی ماله فهو زکاة والزکاة صدقة کلاهما اسم[1]

ہوا جرم جس کی وجہ سے اس پر دیت کی ادائی لازم آئے شامل نہیں اور نہ وہ رضا کارانہ عطیہ و بخشش جو وہ دے، نہ وہ چیز جسے وہ خود اپنی طرف سے اپنے مال میں سے دینا اپنے اُوپر فرض کرے، تو وہ زکواۃ ہے، اور زکواۃ صدقہ ہے۔ دونوں کے لئے ایک نام ہے۔

امام شافعیؒ کی مندرجہ بالا عبارت سے ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ مختلف جرمانوں، تاوانوں یا رضا کارانہ عطیات نیز نذر وغیرہ کی قسم کے اپنے اُوپر خود فرض کئے جانے والے صدقات کے علاوہ جو کچھ بھی واجبات مسلمانوں پر (اللہ و رسول یا اسلامی حکومت کی طرف سے) فرض کئے جائیں وہ سب "زکواۃ" ہوں گے۔ بہتر ہوگا کہ اس کی تفسیر بھی انہی کے الفاظ میں آپ کے سامنے پیش کر دی جائے:۔

فما أُخذ من مسلم من صدقة ماله ناضًّا کان او ماشیةً اوزرعًا أَو زکاة فطرا وخمس رکازٍ او صدقة مَعدِنٍ او غیره مما وجب علیه فی ماله

تو مسلمان کے مال میں سے جو صدقہ لیا جائے وہ نقدی کی صورت میں ہو یا مویشی کی، زرعی پیداوار میں سے ہو یا زکواۃ فطر، دفینہ کا خمس ہو یا معدن کا صدقہ یا اس کے علاوہ دیگر اشیاء کا۔ جو از روئے کتاب یا از روئے سنت یا پھر کسی ایسے فیصلہ کی رو سے جس پر عامۃ المسلمین

---

[1] ۔ کتاب الام للشافعی ۲: ۶۰

فی کتاب او سنۃ او امر اجمع علیہ عوام المسلمین فمعناہ واحد انہ زکاۃ والزکاۃ صدقۃ۔[1] کا اجماع (متفقہ فیصلہ) ہو چکا ہو تو اس کا مفہوم ایک ہی ہے یعنی وہ (اس طرح وصول کئے جانے والے جملہ واجبات) زکوٰۃ ہوں گے اور زکوٰۃ صدقہ ہے۔

ہم نے یہاں زکوٰۃ سے متعلق اس نازک بحث کو علماء کی تحقیق وتنقید کے لئے مختصر طور پر چھیڑا ہے۔ وعسی ان تکرھوا شیئا ویجعل اللہ فیہ خیرا کثیرا۔

ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مفروضہ صدقہ (زکوٰۃ) کے بارے میں کتاب الاموال میں تفاصیل ملیں گی اور ان میں سے ہر مسئلہ پر امام ابو عبیدؒ ہمیں اپنی رائے بھی دیں گے لہٰذا ہم آئندہ صفحات میں مختصراً اس صدقہ مفروضۂ رسول اللہ کی وصولی واخراجات کے بارے میں کچھ عرض کریں گے اور اتنا اضافہ کریں گے کہ حالات کے لحاظ سے اسلامی حکومت کو اختیار ہوگا کہ ضرورت و اہمیت کے لحاظ سے صدقات کی رقم کو فئے کے مصارف میں یا فئے کی رقم کو صدقات کے مصارف میں لے جائے۔[2]

صدقہ (زکوٰۃ) اور اُس کا نظام

امام ابو عبیدؒ صدقہ کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:۔

---

[1] ۔ کتاب الام للشافعی ۲: ۱۷ ۔ گویا صدقہ اسی وقت زکوٰۃ بنتا ہے۔ جب وہ ان واجبات مالیہ میں سے ہو جو از روئے قرآن یا از روئے سنت یا از روئے اجماع اُمتِ مسلمہ (حکومت اسلامی) طلب کیا جائے۔

[2] ۔ دیکھئے کتاب الام للشافعی ۲: ۷۶

اما الصدقة فزكاة اموال المسلمين من الذهب والورق والإبل والبقر والغنم والحب والثمار، فهي للاصناف الثمانية الذين سماهم الله تعالى، لاحق لاحد من الناس فيها سواهم۔[1]

جہاں تک صدقہ کا تعلق ہے سو وہ مسلمانوں کے مال کی زکات ہے جو سونے چاندی، اونٹ گائے بیل، بھیڑ بکریوں اور غلہ اور پھلوں سے لی جاتی ہے تو وہ ان آٹھ اصناف میں خرچ ہوگی جن کا نام اللہ تعالیٰ نے لیا ہے۔ ان اصناف کے سوا لوگوں میں سے کسی کا اس میں کوئی حق نہیں ہے۔

امام ابو عبیدہؒ نے اپنی کتاب الاموال" میں صرف ان اموال کا ذکر کیا ہے جو نظام حکومت کے تحت مسلمانوں کے سربراہوں (ائمہ) کے ذریعے وصول کرکے خرچ کیے جائیں گے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں :-

فالاموال التي تليها ائمة المسلمين هي هذه الثلاثة التي ذكرها عمرؓ وتأولها من كتاب الله عز وجل الفيء والخمس والصدقة۔[2]

وہ اموال جس کی نگرانی مسلمانوں کے سربراہ کرتے ہیں وہ یہی تین ہیں جنہیں حضرت عمرؓ نے بیان کیا ہے۔ اور کتاب اللہ سے اُنہوں نے اس کی تاویل بیان کی ہے، یعنی فئے، خمس اور صدقہ (زکوٰۃ)۔

قرآن مجید میں رسول اللہ ؐ کو حکم ہے :

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً (التوبۃ ۹: ۱۰۳)

آپؐ ان کے اموال سے صدقہ لیجئے۔

قرآن مجید کا یہ حکم صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خاص نہیں ہے بلکہ آپؐ کے نائبین اور اسلامی مملکت کے سربراہوں کے لئے بھی یہی حکم ہے[3]۔ جیسا کہ رسول اللہؐ نے اس کی شرح

اسلامی مملکت کے سربراہوں کے لئے بھی یہی حکم ہے[3]۔ جیسا کہ رسول اللہؐ نے اس کی شرح میں فرمایا:

---

[1] کتاب الاموال: ۱۶ [2] ایضاً: ۱۶ [3] چنانچہ جب اہل ردّہ نے اس آیت سے صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مراد لیا تو حضرت ابوبکرؓ نے اس کی تردید کی اور بتایا کہ ہر امام اس حکم میں داخل ہے۔ (فتح الباری ۳: ۲۳۲ مطبوعہ خیریہ ۱۳۱۹ھ)۔

یہاں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اسلام ایک اجتماعی نظام زندگی کا متقاضی ہے لہٰذا جہاں اسلام کی بالادستی نہ ہو وہاں مسلمانوں کی جماعت اپنے امیر یا قائد کے تحت نظام زکوٰۃ قائم کرے گی، اس نظام سے یقیناً ان کی قوت بڑھ جائیگی اور وہ پسماندگی اور غلامی سے نجات پائیں گے۔ انشاءاللہ۔

تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِيَائِهِمْ فَتُرَدُّ عَلٰى فُقَرَائِهِمْ ؎۱	صدقہ (زکوٰۃ) ان کے تونگروں سے لی جائے گی اور ان کے محتاجوں میں پلٹا دی جائے گی۔

اس کی شرح کرتے ہوئے امام ابن حجرؒ لکھتے ہیں :۔

استدل بہ علی ان الامام ھو الذی یتولی قبض الزکاۃ وصرفھا امابنفسہ واما بنائبہ فمن امتنع منھم اخذت منہ قھرًا۔ ؎۲	اس سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ امام (سربراہِ مملکت) ہی وصولیٔ زکاۃ اور اس کے خرچ کا نگران و ذمہ دار ہوگا۔ یا تو بذاتِ خود یا اپنے جانشینوں اور نائبوں کے ذریعہ، اور لوگوں میں سے جو بھی اُسے زکات دینے سے رُک جائے تو اس سے جبرًا زکوٰۃ وصول کی جائے گی۔

مذکورۃ الصدر اقتباسات سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ صدقہ (زکوٰۃ) ایک ایسا مالی نظام ہے جسے اسلامی حکومت اپنی نگرانی میں اس لئے قائم کرتی ہے کہ مُلک سے فقر و احتیاج کا سدِّباب کر کے عوام کو زیادہ سے زیادہ خوش حال و آسودہ بنائے۔ اگر اسلامی مملکت میں رہتے ہوئے حکومت کے تحت یہ نظام چلانے کے لئے کسی سبب سے مسلمان تیار نہ ہوں تو ان مسلمانوں کو جبرًا اس نظام کا پابند کیا جائے گا۔ کیونکہ اس کے بغیر مسلمانوں کا اقتصادی نظام استوار نہ ہوسکے گا اور جب کسی قوم کی اقتصادی مشکلات حل نہ ہوسکیں گی تو نہ وہ حیوانی سطح سے ترقی کر کے انسانی عظمت کو پاسکیں گے نہ اُن میں اجتماعی نظم پیدا ہوگا نہ فکری بلندی پیدا ہوگی۔

صدقات (زکوٰۃ) کا یہ نظام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جاری فرمایا اور آپؐ کے بعد حضرات ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم کے عہد تک یہ اسی خط پر جاری رہا۔ یعنی جس طرح رسول اللہؐ کے زمانہ میں مسلمانوں سے صدقات (زکوٰۃ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا آپؐ کے نائبین وصول

؎۱ صحیح البخاری علی حاشیہ فتح الباری ۳ : ۲۳۱ (مطبعہ خیریہ ۱۳۱۹ھ)

؎۲ فتح الباری لابن حجر ۳ : ۲۳۱۔ اور مختصر کتاب العالم والمتعلم لابی بکر محمد بن عمر الترمذی صفحہ ۱۵ میں ایک حدیث کے یہ الفاظ ہیں : مَنْ مَنَعَ مِنَّا الزکوٰۃ فانا ناخذ ھا منہ۔ جو ہم سے زکوٰۃ روکے گا تو ہم اسے اس سے لے کر رہیں گے۔

کرتے تھے[۱] اور وہی اپنی نگرانی میں اسے معاشرہ سے فقر و احتیاج اور پس ماندگی دور کرنے کے لئے خرچ کرتے تھے۔ اسی طرح یہ نظام حضرت عثمانؓ کے عہد تک برقرار رہا۔

ابن سیرینؒ کہتے ہیں کہ صدقہ (زکوٰۃ) رسول اللہؐ کے پاس لایا جاتا تھا یا پھر اسے دیا جاتا تھا جسے آپؐ اس کی وصولی کا حکم دیتے تھے۔ آپؐ کے بعد حضرت ابو بکرؓ کو دیا جاتا یا جسے وہ وصولی کا حکم دیتے۔ بعد ازاں حضرت عمرؓ کو دیا جاتا یا جسے وہ اس کی وصولی کا حکم دیتے۔ اس کے بعد حضرت عثمانؓ کو دیا جاتا یا جسے وہ اس کی وصولی کا حکم دیتے۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت پر صدقہ دینے کے بارے میں لوگوں میں اختلاف ہوگیا۔ کچھ لوگ تو حسب سابق اُمراء و حکّام ہی کو دیتے رہے۔ اور کچھ لوگ اپنے طور پر اسے تقسیم کرنے لگے۔ جو لوگ حکّام کو ادا کرتے رہے اُن میں عبداللہ بن عمرؓ بھی تھے۔[۲]

بلاشبہ حضرت عثمانؓ کے بعد سیاسی انتشار کا اثر صدقات پر بھی پڑا اور لوگوں نے یہ سوال اٹھانا شروع کر دیا کہ اب سیاسی عدم استحکام کی صورت میں ہم کیا صورت اختیار کریں۔ اس وقت بھی صدقات کی اہمیت سے باخبر اور سیاسی شعور رکھنے والے اکثر حضرات نے یہی رائے دی کہ والیوں، حاکموں اور سلطان کو یہ صدقات دیئے جائیں، خواہ وہ اسے خرچ کرنے میں بے اعتدالی برتیں، اور کچھ حضرات نے اپنے طور پر مستحقین میں تقسیم کرنے کی اجازت دے دی۔ جو حضرات والیوں کو دینے کے قائل تھے اُن سے جب دریافت کیا گیا کہ سیاسی انتشار اور حکومت کے عدم استحکام کا حال یہ ہے کہ ہمارے علاقہ پر ایک بار اہلِ شام کی حکومت ہوتی ہے اور ایک بار دوسرے گروہ کی، تو انہوں نے یہی کہا کہ جس گروہ کو غلبہ حاصل ہو جائے یا جس

---

[۱] رسول اللہؐ حلقہ وارانہ طور پر صدقہ جمع کرنے اور متعلقہ نمائندوں کو دینے کے احکام جاری فرماتے تھے:

وان اجمعوا ما عندکم من الصدقۃ والجزیۃ من مخالیفکم وابلغوھا رسلی۔ (عیون الاثر لابن سید الناس ۲ : ۲۴۴)	اور تم اپنے اپنے علاقوں سے صدقہ و جزیہ جمع کرکے انہیں میرے نمائندوں کو پہنچا دو۔

[۲] کتاب الاموال : ۵۶۷ و ۵۶۸۔

سے تم بیعت کر لو اُسی کو "صدقہ" ادا کر دو[1]

اس تفصیل سے متفقہ طور پر بلا اختلاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب سیاسی استحکام ہو اور مسلمانوں پر ایک اسلامی حکومت کا غلبہ ہو تو اس وقت صدقات کا نظام بہر حال حکومت کے ہاتھ میں رہے گا۔ کسی کو یہ اختیار نہ ہوگا کہ وہ حکومت کو تسلیم کرتے ہوئے نجی طور پر اپنے صدقات (زکوٰۃ) تقسیم کرتا رہے۔ جو لوگ مستحکم اسلامی حکومت کے ہوتے ہوئے اس نظام کو اُسی خط پر نہیں چلاتے جس پر یہ نظام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر حضرت عثمانؓ کے عہد تک جاری تھا وہ اسلام کے اس عظیم رُکن "صدقات و زکوٰۃ" کو بے جان بنا کر اسلامی معاشرہ کو پست حال و پس ماندہ بنانے اور غیر مسلم معاشرہ کو اسلامی معاشرہ پر ہنسانے کے خطرناک جُرم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔

اقامتِ صلوٰۃ کے بعد "نظامِ زکوٰۃ (صدقات) قائم کرنا اسلامی حکومت کا اوّلین فریضہ ہے[2] اس سے ایک طرف تو ہمارے معاشرہ کے پس ماندہ اور معیاری زندگی سے محروم افراد کی حالت تیزی سے سُدھرے گی، دوسری طرف وہ افراد اور جماعتیں جو مختلف بھیسوں میں اس نظام سے ناجائز فائدہ اٹھا کر عوام کو منتشر اور مرکز سے متنفر کرنے میں کوشاں ہیں بے قوت ہو جائیں گی، اور عوام کا تعلق حکومت سے مستحکم ہوتا چلا جائے گا۔

ہمارے ہاں اب عموماً یہ سمجھا اور علی الاعلان کہا بھی جا رہا ہے کہ نظامِ صدقات (زکوٰۃ) کا مطلب یہ ہے کہ معاشرہ میں مستقل طور پر ایک کمزور و محتاج طبقہ باقی رہے تاکہ ان کے لئے امیروں سے "زکوٰۃ و صدقات لیتے رہنے کا جواز پیدا ہوتا رہے لیکن درحقیقت یہ اسلام کے نظامِ صدقات (زکوٰۃ) سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔

صدقہ (زکوٰۃ) ایک ایسا مالی فریضہ ہے جس کا پہلا مصرف محتاج و ضرورت مند ہیں۔ یہ جس

---

[1] دیکھئے کتاب الاموال باب دفع الصدقۃ الی الامراء واختلاف العلماء فی ذٰلک از ۵۶۷ تا ۵۷۶۔

[2] الذین ان مکناھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ..... الخ (حج ۲۲ : ۴۱)

علاقہ کے امیروں سے لیا جائے گا اسی علاقہ کے محروموں اور محتاجوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ اور جب تک اُن میں سے ایک بھی ضرورت منداور بے روزگار رہے گا اس علاقہ کے صدقہ (زکوٰۃ) کا زیادہ مستحق وہی ہوگا۔ ایک علاقہ سے جمع کیا ہوا صدقہ (زکوٰۃ) دوسرے علاقہ میں اسی وقت جاسکتا ہے جب کہ اس علاقہ میں کوئی اس کا مستحق باقی نہ رہا ہو۔

صدقات تقسیم کرنے کا طریقہ ایسا ہونا چاہیئے کہ اس سے تدریج محتاج وضرورت مند، آسودہ وخوش حال ہونے لگیں۔ اور انہیں مستقل ذرائع معاش مہیا ہو جائیں۔ حتیٰ کہ ہر علاقہ اپنی احتیاج کے تناسب سے جلد یا بدیر اس قابل ہو جائے کہ بجائے صدقات لینے کے وہ صدقات دینے لگے۔ جب ایک علاقہ میں صدقات جمع ہونے لگیں اور ان کے مستحقین باقی نہ رہیں تو یہ مرکز کے مشورے سے یا تو پڑوسی علاقوں میں یا پھر مرکز میں پہنچیں گے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہی بعض قبائل صدقات کی بدولت اتنے خوش حال ہو چکے تھے کہ ان کو صدقات کی ضرورت باقی نہ رہی تھی۔ اور وہ اپنے صدقات رسول اللہ ص کی خدمت میں لے آتے تھے[1]۔

اسی طرح جلد یا بدیر دوسرے علاقوں میں بھی یہی صورت پیدا ہونے لگی تھی۔ حضرت معاذ بن جبلؓ جو رسول اللہ ص کی طرف سے (تقریباً ۹ھ میں) یمن میں عامل بن کر گئے تھے اور آپؐ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے بھی اُنہیں وہاں بحال رکھا تھا، حضرت عمرؓ کی خلافت قائم ہونے پر مدینہ تشریف لے گئے تو حضرت عمرؓ نے پھر انہیں یمن میں اُن کے پہلے منصب پر واپس بھیج دیا۔ چنانچہ حضرت معاذ بن جبلؓ نے پہلے سال حضرت عمرؓ کی خدمت میں اپنے علاقہ سے جمع ہونے والے صدقہ کا تہائی (⅓) بھیج دیا، اس پر حضرت عمرؓ نے اُن پر اعتراض کیا اور ان کے اس عمل کو غیر معمولی قرار دیتے ہوئے اُن سے جواب طلبی کی اور کہا کہ میں نے تمہیں مال جمع کرنے اور جزیہ وصول کرنے کے لئے نہیں بھیجا، بلکہ امیروں سے مال لے کر انہی میں کے

---

[1] عیون الاثر لابن سیدالناس ۲ : ۲۴۶

فقراء میں اس مال کو تقسیم کرنے کے لئے بھیجا ہے۔ حضرت معاذ رضؓ نے جواب دیا "جو کچھ میں نے آپ کو بھیجا ہے اُسے مجھ سے لینے کا یہاں کوئی حقدار مجھے نہیں ملتا۔" دوسرے سال انہی حضرت معاذ رضؓ نے اپنے علاقے کا آدھا صدقہ بھیج دیا۔ اس بار بھی دونوں میں وہی پہلی سی گفتگو ہوئی۔ تیسرے سال حضرت معاذ رضؓ نے پورا کا پورا جمع ہونے والا صدقہ کا مال حضرت عمر رضؓ کے پاس بھیج دیا۔ اس پر حضرت عمر رضؓ نے پھر وہی بات کہی جو پہلے کہی تھی اور حضرت معاذ رضؓ کا جواب پھر یہی تھا "اب یہاں مجھے ایک بھی ایسا شخص نہیں ملتا جو اس مال کو مجھ سے لینے کا مستحق ہو۔" [1]

ان واقعات سے ان حضرات کی صراحتہً تردید ہوتی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ صدقات (زکوٰۃ) کا نظام مستقل طور پر معاشرہ میں فقراء و مساکین کے باقی رکھنے کا نام ہے۔ اس کے برخلاف یہ ثبوت مل رہا ہے کہ اس نظام صدقات سے چند سالوں میں ہی معاشرہ سے احتیاج و فقر کی بیماری بیخ و بُن سے اُکھڑ جاتی ہے۔ اور معاشرہ کا ہر فرد جلد از جلد آسودہ اور خود کفیل ہو جاتا ہے۔

زکوٰۃ (صدقہ) عبادت ہے یا ٹیکس

یہ بحث اٹھائی جاتی ہے کہ زکوٰۃ عبادت ہے یا ٹیکس۔ ہمارے خیال میں یہ بحث اُٹھانے سے پہلے اگر عبادت کی جامعیت پر نظر ہو تو بحث آسان ہو جائے گی۔ دراصل اللہ پر ایمان رکھتے ہوئے اس کے احکام کے مطابق اپنی زندگی گزارنے کا نام عبادت ہے۔ عبادت سے ہم اپنی دُنیوی و اُخروی دونوں زندگیاں کامیاب بناتے ہیں۔ عبادت ایک رُوح ہے جو مختلف اعمال میں شامل ہو کر تنوعِ مظاہر کے باوجود ان میں وحدت پیدا کرتی ہے۔ مسلمان کا ہر عمل عبادت ہوتا ہے۔ اعمال مختلف ہوتے ہیں۔ کچھ اعمال روح کو پاک کرنے اور اسے تقویت بخشنے کے لئے ہوتے ہیں۔ کچھ جسمانی تطہیر و تزکیہ کے لئے۔ اسی اعتبار سے عبادت اور اس کے احکام میں بھی فرق ہوتا ہے۔ صلوٰۃ و زکوٰۃ دونوں عبادت ہیں لیکن دونوں کے احکام میں نمایاں فرق ہیں۔ اگرچہ ان دونوں

---

[1] کتاب الاموال : ۵۹۶ (نمبر ۱۹۱۱)

عبادتوں سے مقصود و مطلوب دُنیا کی فلاح و بہبود اور اخروی سعادت و کامرانی ہے۔ اللہ تعالےٰ نے ہمیں جو تعلیمات دی ہیں ان پر عمل کرنے سے ہم پہلے اپنی دُنیا خوشگوار بناتے ہیں اور اس طرح ہماری آخرت خوشگوار ہوجاتی ہے۔ ہمیں اللہ تعالےٰ نے دعا میں "رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً" (البقرۃ : ۲۰۱) کی تعلیم دی ہے یعنی پہلے دُنیا کی خوشگواری اور بھلائی اور پھر آخرت کی خوشگواری و بھلائی۔ اللہ تعالےٰ عبادت کے تحت جتنی تعلیمات انسانوں کو دیتا ہے اس میں) انسانوں کی دُنیوی و اُخروی (دونوں جہانوں کی) فلاح ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا انہی کاموں میں ہے جن سے انسانوں میں امن، عدل، خیر، محبّت و اخوّت، اتحاد و اتفاق، خدا ترسی، احسان و ہمدردی عام ہو۔ اور معاشرہ ہر قسم کی پلیدیوں سے پاک صاف ہو جائے۔[1] قرآن مجید کی تمام تعلیمات کا نچوڑ یہی ہے کہ انسانی افراد و معاشرہ پاکیزہ افکار و اخلاق سے متصف ہوجائے۔ اُس کا عقیدہ پاک و بلند اور اس کے اعمال پاک و بلند اور صالح ہو جائیں۔ وہ دُنیا و عقبیٰ میں کامیاب و کامران و سربلند ہو۔

اللہ تعالےٰ نے معاشرے کو باطنی و ظاہری پلیدیوں سے پاک و صاف کرنے کے لئے جو عبادتیں مقرر فرمائی ہیں ان میں سے ایک اہم اور بنیادی عبادت "زکوٰۃ" ہے۔ معاشرہ میں دولت کی محبت، معاشی لوٹ کھسوٹ، دولت کی تونگروں میں گردش، حاجتمندوں سے ناجائز فائدہ اُٹھانا، حاجتمندوں اور غریبوں کا ایک طبقہ مستقل موجود رکھنا، یہ وہ پلیدیاں ہیں جن کی موجودگی میں کسی معاشرہ کا اسلامی ہونا ناممکن ہے۔ اور "زکوٰۃ" ان بیماریوں کا منظم و مکمل علاج ہے۔ زکوٰۃ جہاد بالمال ہے اور جہاد اسی وقت کامیاب ہوتا ہے جب وہ ایک

---

[1] مثلاً قرآن مجید میں ہے : اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ (النحل : ۹۰)۔ وَاَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ (البقرۃ : ۱۹۵)۔ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَھِّرِیْنَ (البقرۃ : ۲۲۲)۔ وَاتَّقُوا اللّٰہَ (نساء : ۱۳۰)۔ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (آل عمران : ۱۰۳)۔ اِنَّ اللّٰہَ یَجْزِی الْمُتَصَدِّقِیْنَ (یوسف : ۸۸)۔ وَافْعَلُوا الْخَیْرَ (الحج : ۷۷)۔

نظام کے تحت کیا جائے۔

ہم جانتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ بدنظمی وانتشار کو پسند نہیں کرتا۔[1] وہ ہر کام کو اس کے صحیح طریقہ سے کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔[2] معاشرہ سے دولت کے شیطان کی بے اعتدلیاں دُور کرنے کے لئے نہایت مضبوط و منظم مہم چلانی پڑتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاءؓ نے یہ مہم "زکوٰۃ و صدقہ" کے نام سے حکومت کی نگرانی میں چلائی اور اسے افراد یا جماعتوں کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑا۔ آج بھی یہ "نظامِ زکوٰۃ" اپنے صحیح وخوشگوار نتائج اسی صورت میں پیدا کرے گا جب وہ حکومتِ اسلامی کے زیرِ نگرانی قائم کیا جائے گا۔ زکوٰۃ اس قسم کی عبادت نہیں جسے اسلامی مملکت میں افراد یا مختلف جماعتوں کے حوالے کر دیا جائے۔ الغرض "زکوٰۃ" ایک ایسی مالی عبادت ہے جس کے نظام کو حکومتِ اسلامی ان خطوط پر چلائے گی جنہیں اللہ کے رسولؐ نے قائم کیا۔ اور خلفاءؓ نے برقرار رکھا۔ اب آپ اس عبادت کو کوئی نام دے لیجئے۔ زکوٰۃ کہئے یا صدقہ، ٹیکس کہئے یا محصول۔ اگر چیز ایک ہو اور نام متفرق رکھ لئے جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ البتہ اگر ٹیکس سے کچھ ظلم کا تصور یا عبادت و ٹیکس میں تضاد پیدا ہوتا ہو تو "صدقہ" یا "زکوٰۃ" جیسے بامعنی و پاکیزہ و بلند اسم کو چھوڑ کر اس کے لئے کوئی دوسرا نام اختیار نہیں کرنا چاہیئے۔ بہرحال اس جہت سے کہ زکوٰۃ و صدقہ اللہ کے حکم کے تحت ادا کئے جاتے ہیں وہ عبادت ہیں۔ لیکن اس جہت سے کہ وہ ایک مالی فریضہ ہیں اور اسلامی حکومت باقاعدہ حساب کتاب کے ساتھ اسے معیّن مقدار میں وصول کر کے اسے اس کے مستحقین میں خرچ کرنے اور نہ ادا کرنے والے پر جبر کرنے کی مجاز ہوتی ہے۔ وہ بعض عبادتوں سے جُداگانہ حیثیت اختیار کر لیتی ہے جو حکومتِ اسلامی کی باز پرس سے مستثنیٰ ہوتی ہیں۔ اور اسی لحاظ سے اسے حکومتِ اسلامی کے مالی واجبات یا فریضۂ مال یا محصولات یا ٹیکس

---

[1] وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ (البقرۃ : ۲۰۵)

[2] وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا (البقرۃ : ۱۸۹)

کے نام سے یاد کیا جا سکتا ہے۔

ہماری رائے میں فیصلہ طلب جھگڑا یا تنازعہ عبادت یا ٹیکس کہنے کا نہیں بلکہ اصل فیصلہ طلب امر یہ ہے کہ اسلامی ریاست میں یہ عبادت نجی طور پر ادا کی جائے گی یا حکومت کے ذریعے سے حکومت کی نگرانی میں۔ ہم مؤخرالذکر صورت کو قرآن و سنّت کے عین مطابق پاتے ہیں۔ اور پہلی صورت کو نہ صرف قرآن و سنّت کے مخالف، بلکہ اسلامی معاشرہ کی تمام اقتصادی بے اعتدالیوں اور اکثر فرقہ بندیوں کا موجب تصور کرتے ہیں۔ ایک اسلامی حکومت کو "صدقہ و زکوٰۃ" اپنی مذکورہ شرائط کے مطابق مسلمانوں سے وصول کر کے اسے مستحقین میں خرچ کرنے کا نظام قائم کر کے ایک طرف تو ملک سے اقتصادی پس ماندگی دُور کرنا، اور دوسری طرف اُمّتِ مُسلمہ کو دوہری وفاداریوں سے نجات دلا کر انتشار و افتراق کا سدِّ باب کر دینا چاہیئے۔

ہمارے معاشرہ میں صدقہ (زکوٰۃ) کی وصولی اور تقسیم کا نظام کیسے جاری کیا جائے

ہم سب جانتے ہیں کہ ہمارے اس معاشرے میں امیر بھی ہیں اور غریب بھی، اِس وقت ہمارے ہاں کوئی ایسا ٹیکس متعیّن نہیں جو امیروں سے لیکر صرف فقراء و مساکین کی بہتری اور ان کی پس ماندگی دُور کر دینے کے لئے مخصوص ہو۔ اگر ایسا ہو تو اب تک معاشرہ سے فقراء و مساکین کی یہ بے لبسی اور کس مپرسی ختم ہو چکی ہوتی۔ دس پندرہ سال کا عرصہ ذرائع و سہولت کی موجودگی میں ایک قوم سے غربت و فلاکت کو ختم کر دینے کے لئے کافی طویل مدّت ہے لیکن اسی صورت میں جب کہ اس طرف خصوصی توجہ کی جائے۔ اور پورے انہماک اور انتہائی دلچسپی سے محنت کی جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقرر فرمودہ صدقہ (زکوٰۃ) کا نظام پورے معاشرے سے غربت و فلاکت کا استیصال کر کے اس کا معیارِ زندگی حیرت انگیز طور پر بلند سے بلند تر کرتا چلا جائے گا۔ اور اس سے مُلک و قوم کو جو دوسرے فوائد ملیں گے ان کا ذکر اس جگہ غیر ضروری ہو گا۔

اِس وقت حکومت اپنے انتظامات اور جملہ اخراجات کے لئے جو محصولات وصول کر رہی ہے اُنہیں ہم اس آمدنی کا بدل قرار دے سکتے ہیں جو اسلامی مملکت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلافت راشدہ میں "خمس و فئے" کی مد سے ملا کرتے تھے۔ اور جو بہرحال صدقاتِ مفروضہ رسول اللہؐ (زکوٰۃ) کی مد سے الگ تھے۔ اور اسلامی حکومت اسے مُلک کے انتظامات، فوج کی عطایا، سرکاری افسروں کی تنخواہوں اور بلا امتیاز جملہ مسلمین کی فلاح و رفاہ اور سماجی بہبود پر خرچ کرتی تھی۔ یہی وہ آمدنی ہوتی تھی جس کی تفاصیل امام ابوعبیدؒ نے اپنی کتاب الاموال کے پہلے حصّہ میں بیان کی ہیں۔ اس سے بالکل الگ رسول اللہؐ کے متعین فرمودہ صدقات (زکوٰۃ) ہیں جو ایک خاص مقدارِ دولت (نصاب) رکھنے والے اغنیاء سے مختلف اموال پر مختلف تناسب سے وصول کر کے اُنہیں قرآن مجید کے مذکورہ آٹھ اصناف پر اسلامی حکومت کی صوابدید کے مطابق اس طرح خرچ کیا جائے گا کہ سب سے پہلے[1] ملک سے فقر و احتیاج کا استیصال ہو اور پھر بتدریج فقیر عوام کا معیارِ زندگی بہتر سے بہتر ہوتا چلا جائے[2]۔ ذیل میں ہم اپنے معاشرہ میں صدقات (زکوٰۃ) کا نظام قائم کرنے کے لئے ایک خاکہ پیش کرتے ہیں۔ واللہ المعین۔

ہمارا یہ خاکہ امام مالکؒ کے طریقِ کار کے مطابق ہے جو کہتے ہیں:

الأمرُ عِندنا فی قسم الصدقاتِ ان ذٰلک لایکون الا علی وجہ	صدقات (زکوٰۃ) کی تقسیم میں ہمارا طریق یہ ہے کہ وہ صرف والی (حاکم) کے اجتہاد پر موقوف ہے،

---

[1] اس مرحلہ کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "تُؤخَذُ من اغنیائھم وترد الی فقرائھم" فرمایا تھا ورنہ صدقہ کے اور بھی مصارف ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سب سے پہلے فقر دور کیا جائے گا اور پھر دیگر مصارف۔ [2] صدقہ (زکوٰۃ) کے متعلق یہ تمام تفاصیل کے اس حصّہ میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

الاجتهاد من الوالی فاتی الاصناف کانت فیہ الحاجۃ والعدد اوثر ذٰلک الصنف، بقدر ما یری الوالی، وعسی ان ینتقل ذٰلک الی الصنف الآخر بعد عام او عامین او اعوام، فیؤثر اہل الحاجۃ والعدد حیثما کان ذٰلک[1]

لہٰذا ان اصناف میں سے جس میں احتیاج زیادہ اور تعداد کثیر ہو پہلے اسے ترجیح دی جائے گی اور اس کا دار و مدار والی اپنی صوابدید کے مطابق کرے گا۔ ہو سکتا ہے کہ سال دو سال یا چند سالوں میں اس صنف کی ضرورت پوری ہو چکنے کے بعد زکوٰۃ کی وہ رقم دوسری صنف میں منتقل ہو جائے۔ ترجیح بہرحال انہی ضرورتمندوں کو ہو گی جن کی تعداد زیادہ ہو خواہ یہ صورت کسی جگہ کیوں نہ ہو۔

نیز ہم نے اس خاکہ کے بنانے میں امام شافعیؒ کی اس عبارت سے بھی رہنمائی حاصل کی ہے :-

ینبغی لوالی الصدقۃ ان یبدأ فیأمر بان یکتب اہل السہمان ویوضعون مواضعہم ویحصی کل اہل صنف منہم علی حدتہم فیحصی اسماء الفقراء والمساکین ویعرف کم یخرجہم من الفقر والمسکنۃ الی ادنی اسم الغنی[2]

اور صدقہ پر مامور حاکم کو چاہیئے کہ وہ پہلے حکم دے کہ جو صدقہ کے مستحق حصہ دار ہیں ان کے نام لکھے جائیں اور انہیں اپنی اپنی جگہوں پر رکھا جائے گا۔ ان میں سے ہر صنف کے مستحقین کو جداگانہ شمار کیا جائیگا۔ چنانچہ فقراء و مساکین کے اسماء کی پوری فہرست بنائی جائے گی اور پھر یہ معلوم کیا جائے گا کہ ان کو فقر و مسکنت سے نکال کر تونگری کے کم سے کم درجہ پر پہنچانے کے لئے کتنا مال درکار ہو گا۔

---

[1] موطا امام مالکؒ مع تعلیق محمد فواد عبدالباقی ۱: ۲۶۸

[2] کتاب الام للشافعیؒ ۲: ۶۲

غنی اور فقیر کی اعداد شماری

اس ضمن میں سب سے پہلے ہمیں غنی اور فقیر کی تعریف معلوم کرنا ہوگی۔ ان الفاظ کے وسیع مفہوم کے لحاظ سے تو انسان فقیر ہے کہ اسے ہر وقت مختلف ضروریات و احتیاجات لاحق ہوتی رہتی ہیں اور اللہ ہی غنی ہے کہ اُسے کوئی احتیاج نہیں ہوتی۔[1] لیکن اس جگہ ہم انسانی سطح پر غنی و فقیر کی تعریف معلوم کریں گے۔

غنی وہ ہے جو مختلف حالات میں اپنی بنیادی ضروریات کا خود کفیل ہو اور فقیر وہ ہے جو اپنی بنیادی ضرورتیں پوری کرنے میں خود کفیل نہ ہو، بلکہ اس سلسلہ میں غنی کی مدد کا طالب ہو۔ اپنی اس تعریف کے لحاظ سے فقر و غنا اضافی حالتیں قرار دی جاسکتی ہیں اور ان کے لئے معاشرہ میں مختلف مدارج بھی بنائے جاسکتے ہیں۔ مالی اعتبار سے غنی وہ شخص ہوگا جو اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے مالی وسائل رکھتا ہو۔ اور فقیر وہ ہوگا جسے اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے مالی وسائل مہیا نہ ہوں۔ اسلامی معاشرہ میں مومنوں کو اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ[2] کے تحت ایک برادری قرار دے کر ان پر یہ فریضہ عائد کیا گیا ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کی کمی پوری کرتے رہیں اور کسی حالت میں ایک دوسرے کو بے مدد نہ چھوڑیں۔[3]

اگر کسی فقیر کے پاس اپنی بنیادی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے کچھ وسائل ہوں اور کچھ نہ ہوں تو جہاں اس کے وسائل ختم ہو جاتے ہوں وہاں سے وہ مسکین ہو جاتا ہے۔ یہ فیصلہ کہ کس کو غنی کہا جائے اور کس کو "فقیر" یا "مسکین"، کسی معیار کو مقرر کئے بغیر مشکل ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غنی[4] کے لئے تو "صاحب نصاب" کی تعریف فرما دی اور "فقیر" یا "مسکین" کو حالات و احتیاجات کے اعتبار سے مختلف نوعیتوں میں تقسیم فرمایا۔ رسول اللہ صلعم نے اپنے زمانہ کے

---

[1] وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ (محمد: ۳۸)

[2] الحجرات: ۱۰

[3] المسلم اخو المسلم لا یظلمه ولا یسلمه ..... الخ (صحیح البخاری ج ۱: ۳۳۰ مطبوعہ مطبع مصطفائی)

[4] یہاں غنی سے مراد وہ مالدار ہے جس کو ادائے صدقہ (زکوٰۃ) کا پابند کیا گیا ہے اور اس طرح وہ فقیر کے بالمقابل ہو گیا۔

مالی معیار۔ آبادی کے مختلف کاروبار اور ان سے سالانہ پیداوار نیز عائلی اخراجات کو ملحوظ رکھ کر ایک مناسب نصاب مقرر فرمایا جس کی حکمت معلوم کر لینے کے بعد یہ عیاں ہو جاتا ہے کہ معاشرہ میں کتنی دولت رکھنے والے کو "غنی" کہا جا سکتا ہے۔

رسول اللہ ؐ کے عہد میں ایک متوسط کُنبے کے لئے روزانہ ایک درہم بخوبی کفایت کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپؐ نے عَتاب بن اسیدؓ کو مکہ کا والی بنایا تو ان کے لئے روزانہ ایک درہم مقرر فرمایا[۱]۔ اسی طرح آپؐ کے عہد میں چالیس بکریاں یا پانچ اونٹ رکھنے والا عمدگی سے اپنے کُنبے کی گزر بسر کا کفیل ہو جاتا تھا۔ عموماً ایک بکری کی قیمت ۵ درہم سے ۱۰ درہم تک ہوتی تھی اور ایک اونٹ کی قیمت آٹھ سے لے کر بارہ بکریوں تک ہوتی تھی۔ چاندی کے دس درہم اور سونے کے ایک دینار کی قیمت مساوی تھی۔ اسی طرح ایک متوسط گھرانے کے سالانہ اخراجات کے لئے پانچ وسق خشک میوہ یا غلّہ کفایت کرتا تھا[۲]۔ قیمتوں کے اس معیار کو ملحوظ رکھتے ہوئے رسول اللہ ؐ نے پانچ اُوقیہ چاندی بحساب چالیس درہم فی اُوقیہ دو سو درہم کا نصاب مقرر فرمایا اور چونکہ چاندی کے دس درہم سونے کے ایک دینار کے برابر ہوتے تھے اور دینار کا وزن مثقال بھر تھا لہٰذا سونے کے بیس مثقال قرار پائے۔ اسی طرح رسول اللہ ؐ نے چالیس بکریاں، پانچ اونٹ، زمین یا باغات کی پیداوار سے پانچ وسق[۳] خشک میوہ یا غلّہ پیدا ہو جائے تو یہ مقدار بھی نصاب قرار دی۔ شاہ ولی اللہؒ کی رائے کے مطابق ایک شخص کو اوسطاً ایک رطل یا ایک مُد روزانہ کفایت کرے گا۔ اس طرح تین افراد کے سالانہ گزر بسر کے لئے یہ مقدار بخوبی

---

[۱] سیرۃ ابن ہشام ۴: ۴۹، [۲] حجۃ اللہ البالغہ (مطبع خیریہ) ۲: ۳۳ [۳] حجۃ اللہ البالغہ (مطبع خیریہ) ۲: ۳۲۔ [۴] ایک وسق ساٹھ صاع اور ایک صاع چار مُد کا ہوتا ہے۔ عموماً صاع کا وزن ڈھائی سیر سے پونے چار سیر تک بتایا گیا ہے۔ ڈھائی سیر کے اعتبار سے پانچ وسق تقریباً انیس من ہوتے ہیں جبکہ پونے چار سیر کے اعتبار سے یہ مقدار تقریباً اٹھائیس من ہو جاتی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان اشیاء کے پانچ وسق کی قیمت دو سو درہم تھی۔ دیکھئے ہدایہ ۱: ۱۸۱۔

پوری ہو گی[1] چونکہ صدقہ غنی سے لیا جاتا ہے اور اس نصاب سے کم آمد والا صدقہ (زکوٰۃ) کا مکلف نہیں لہٰذا رسول اللہ صلعم کے فرمان[2] کے مطابق جس کے پاس بقدرِ نصاب مال پورے سال تک باقی نہ رہے "غنی" نہیں ہوگا۔

اپنے اس زمانے میں اگر ہم رسول اللہ صلعم کے مقررہ معیار کو پیشِ نظر رکھ کر حساب لگائیں اور بکری کی قیمت ساٹھ سے سو روپیہ تک رکھ لیں[3] تو اس زمانہ میں تقریباً ڈھائی ہزار سے چار ہزار تک "نصاب" قرار دیا جا سکتا ہے[4]، اور وہی شخص "غنی" قرار پا سکتا ہے جو سال بھر تک اتنی رقم کا مالک رہے نہ وہ شخص جو سال بھر میں اتنی رقم کما لیتا ہو۔ یاد رکھئے صدقہ (زکوٰۃ) کے لئے ضروری ہے کہ ایک آدمی بقدرِ نصاب بچا کر اسے سال بھر تک اپنی ملکیت میں باقی رکھ سکے، ورنہ اگر کوئی شخص سالانہ پچاس ہزار کما کر بھی تبذیر و اسراف کے بغیر معقول حد تک جائز اخراجات کے بعد ڈھائی ہزار یا چار ہزار سال بھر تک جمع نہ رکھ سکے تو اس پر صدقہ (زکوٰۃ) واجب ہی نہ ہوگا۔

اسی طرح جب کسی شخص کی زمین یا باغ سے بیس یا تیس من غلہ یا خشک میوہ پیدا ہو جائے تو وہ اس پر صدقہ (زکوٰۃ) دے گا، اور ہمارا خیال ہے کہ اتنی پیداوار کی زمین یا باغ بہر حال ڈھائی ہزار اور چار ہزار روپیہ کی مالیت ضرور ہوگی۔ ہم نہیں سمجھتے کہ مذکورۃ الصدر توجیہ کے مطابق ہمارے اس معاشرے میں کسی ایسے آدمی کو "غنی" قرار دیا جا سکتا ہے جو دو سو یا ہزار ڈیڑھ ہزار کا سال بھر تک مالک رہا ہو۔ پھر اس "نصاب" میں نہ مسلمان کی رہائش کا مکان شمار کیا جائے گا نہ اُس کے گھر کے استعمال کا ضروری سامان، نہ اُس کی سواری نہ اس کا خادم، کیونکہ یہ چیزیں اُس کی زندگی اور اس کے کاروبار کے لئے لازمی ہوتی ہیں[5]۔ اس کا

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ (مطبوعہ خیریہ) ۲: ۳۲ [2] تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ فَتُرَدُّ عَلَى فُقَرَائِهِمْ (صحیح البخاری)۔

[3] بکری کی اہمیت اس لئے بھی ہو جاتی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے پانچ اونٹوں پر ایک بکری کا صدقہ (زکوٰۃ) مقرر فرمائی تھی۔ کسی متداول سکہ کی مقدار متعین نہ فرمائی اور حضرت عمرؓ نے بھی افسروں میں بجائے رقم کے بکری تقسیم کی تھی[4] اس مسئلہ پر ماہرین اقتصاد علماء و فقہاء غور کریں گے اور وہ اندازہ لگا کر بتائیں گے کہ آج اس نصاب کی کیا قیمت ہوگی [5] دیکھئے کتاب الاموال: ۵۵۲ (نمبر ۱۷۵۰ و ۱۷۵۱)۔

مطلب یہ ہے کہ اگر ایک شخص کے پاس اپنی رہائشی ضرورت کے مطابق مکان ہو جس کی قیمت خواہ کتنی ہو اور اُس کے پاس اپنے گزر بسر کے لئے پوری آمدنی نہ ہو تو وہ "غنی" شمار نہیں ہوگا۔ اسی طرح ایک شخص جو اپنا رہائشی مکان رکھتا ہو، کاروبار کر رہا ہو یا برسرِ روزگار ہو، اپنی سواری رکھتا ہو، لیکن بایں ہمہ گھریلو ضروری اخراجات کی کفالت نہ کر سکتا ہو وہ بھی "غنی" نہیں کہا جائیگا۔

الغرض جب تک ایک شخص اپنی اور اپنے زیرِ کفالت گھرانہ کی ضروری احتیاجات مثلاً رہائش کے لئے مکان، تن پوشی کے لئے لباس، زندگی و صحت برقرار رکھنے کے لئے غذا و معالجہ، تعلیمی سہولتیں اور کاروبار چلانے کے لئے (مالِ تجارت کے علاوہ) ضروری ذرائع و وسائل کے بعد سالانہ بقدرِ نصاب کا مالک نہ رہے وہ "غنی" نہیں کہلائے گا۔

"غنی" کی اس تعریف کے بعد صدقہ کی وصولی کے سلسلہ میں ہمیں اغنیاء شماری کے ذریعہ تمام مُلک کے اغنیاء کی ایک حلقہ وار تفصیلی فہرست تیار کرنے کے بعد صدقات (زکوٰۃ) کی آمدنی کا اندازہ لگایا جائے۔ جس میں آئندہ حالات کے اعتبار سے وقتاً فوقتاً نظرِ ثانی ہوتی رہے۔

فقراء بعد ازاں ہم صدقاتِ قرآن میں مذکور آٹھ مصارف[1] میں سے سب سے پہلے اس مصرف کو لیں گے جس کی حالت معاشرہ کے لئے سب سے زیادہ تکلیف دہ اور مضرت رساں ہو، اور خود قرآن مجید اور احادیثِ نبویہ[2] کی رُو سے یہ اوّلین اور اہم ترین مصرف "فقراء" کا ہے۔ فقیر سے مراد وہ لُٹا پٹا ہے جس کے پاس گزر بسر کے لئے کچھ نہ ہو۔ قرآن مجید میں "لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ" کے ساتھ "الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ" آیا ہے[3]، یعنی جو اپنے گھروں اور اموال سے بے دخل کر دیئے گئے ہیں۔

امام شافعیؒ نے فقیر کی تعریف یوں کی ہے:۔

---

[1] آیت نمبر ۶۰ سورۃ التوبۃ ۹۔ [2] قرآن مجید میں تو سب سے پہلے "انما الصدقات للفقراء" کہہ کر فقراء کی اہمیت واضح کی گئی ہے اور احادیث میں رسول اللہؐ نے "تؤخذ من اغنیائھم فترد علی فقرائھم" (صحیح البخاری) کہہ کر فقراء کی اوّلیت پر مہرِ ثبت فرما دی ہے۔ [3] سورۃ الحشر ۵۹: ۸۔

الفقیر من لا مال له ولا حرفة تقع منه موقعا زمِناکان او غیر زمن سائلاکان او مُتعَفِفاً[1]

فقیر وہ ہے جس کے پاس کسی قسم کا مال نہ ہو اور نہ کسی ہُنر یا پیشہ سے وہ اپنی گزر بسر کرسکتا ہو۔ خواہ وہ معذور و اپاہج ہو یا معذور و اپاہج نہ ہو۔ بھیک مانگ رہا ہو یا اپنی آبرو لئے بیٹھا ہو اور دستِ سوال دراز نہ کر رہا ہو۔

فقراء کی مختلف حیثیتیں اور مختلف انواع ہیں۔ بے روزگاری خواہ کسی سبب سے ہو فقر ہے۔ اگر کُنبہ کے کمانے والے افراد کسی سبب سے (جس میں بیماری، کسادبازاری وغیرہ شامل ہیں) گزر بسر سے سرے سے محروم ہوں یا بال بچے، کمانے والے کے باقی نہ رہنے کی وجہ سے محروم ہو گئے ہوں تو وہ سب فقیر ہوں گے۔ سب سے پہلے اِس درجہ کے فقراء کی مُلک گیر پیمانہ پر علاقہ وار فہرست بنائی جائے۔ اس قسم کی فہرستیں بنانے کیلئے محلہ کے واقف کار، با اثر، معتمد علیہ افراد سے رہنمائی اور مدد لی جائے۔ ان فقراء کے حالات وضروریات کا اندازہ لگایا جائے۔ ان میں سے جو افراد مختلف پیشے اختیار کرنے کے لئے ضروری اوزار و آلات کے محتاج ہوں اُن کے لئے وہ اوزار و آلات فراہم کئے جائیں۔ وہ جہاں آباد ہوں ان علاقوں کی کامیاب ومقبول صنعتوں کے چھوٹے یا بڑے پیمانوں پر کارخانے کھول کر وہاں اُن فقراء کو تربیت دے کر اُن سے کام لیا جائے۔ معذوروں اور اپاہجوں کے لئے جو کسی کام کی قُوّت نہ رکھیں، وظائف مقرر کئے جائیں، اور مُلک بھر میں ایک فرد بھی بے روزگار یا بے وظیفہ نہ رہنے دیا جائے۔

ایک ضلع کے اغنیاء سے وصول شدہ صدقات (زکوٰۃ) پہلے اسی ضلع کے فقراء کی حالت سُدھارنے میں خرچ کئے جائیں۔ جب ایک ضلع کے فقراء اس متوسط معیارِ زندگی تک پہنچ جائیں جس میں اُنہیں بے سہارا، لٹا پٹا اور بے گھر بار یا بے روزگار نہ کہا جاسکے تب اس ضلع سے وصول شدہ زکوٰۃ (صدقات) کا باقی ماندہ حصّہ صوبہ کے مرکز کو بھیج دیا جائے جسے یہ علم ہوگا کہ صوبہ کے کون سے ضلعے ابھی متوسط معیارِ زندگی" سے محروم ہیں اور ابھی تک فقر میں مبتلا ہیں۔

---

[1] دیکھئے کتاب الام للشافعی ۲: ۶۱

چنانچہ وہ یہ بقیہ مال اُن ضلعوں میں بھیج دے گا، جہاں اُس کی صوابدید کے مطابق فقر دُور کرنے کے لئے اس کی ضرورت باقی ہوگی، البتہ اگر ایک ضلع کے لوگ قدرے بہتر حالت میں ہوں اور دوسرے ضلع کے لوگ غیر متوقع طور پر قحط یا شدید احتیاج کی وجہ سے سخت تکلیف میں ہوں تو امام کو حق حاصل ہوگا کہ وہ ہنگامی حالات کے پیشِ نظر ایک ضلع کا صدقہ (زکوٰۃ) دوسرے ضلع میں بھیج دے[1] پھر اس طرح ایک صوبہ جب فقرا سے خالی ہو جائے گا تو وہ اپنی بقیہ رقم مرکز کو بھیج دے گا جسے دوسرے صوبہ کی حالت کا علم ہوگا اور وہ اپنی صوابدید کے مطابق یہ رقم دوسرے صوبہ سے فقر دُور کرنے کے لئے بھیج دے گی۔ جب اس طرح تمام مُلک سے فقر کا خاتمہ ہو جائے گا تو ملک بھر میں فقر و فاقہ سے مجبور ہو کر بھیک مانگنے والوں کا نشان باقی نہ رہے گا۔ اور ملک بھر میں بھیک مانگنا ممنوع قرار دے دیا جائے گا[2]۔

فقراء کا استیصال کرنے کے لئے ایسا کامیاب طریقہ اختیار کیا جائے جس سے خوش اسلوبی کے ساتھ فقر کا سدِّ باب ہو سکے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سائل کو اسی کا کمبل فروخت کر کے اس کے عوض ملنے والے دو درہم اس شرط پر اسے دیئے کہ وہ ایک درہم کا تو گھر میں غلّہ ڈال دے اور دوسرے درہم سے کلہاڑی اور رسّی وغیرہ خرید لے۔ چنانچہ وہ حسبِ وعدہ کلہاڑی کا پھل لیکر آیا اور حضور ؐنے خود اس میں دستہ ثبت فرمایا[3] اور اُسے کہا کہ پندرہ دن کے بعد مجھے اپنی رپورٹ دینا۔ یہ اس لئے تھا کہ وہ ذمّہ داری محسوس کرے اور جوابدہ ہو۔ جب حضور ؐ اس کے ذاتی پیسوں پر شرط لگاتے ہیں تو حکومت کو عوام کی دولت خرچ کرنے پر اس قسم کی شرط لگانے

---

[1] دیکھئے کتاب الام للشافعی ۲: ۶۷۔

[2] ہمارے خیال میں یہی وہ مقام تھا جہاں پہنچ کر رسول اللہ ؐ نے سوال کرنا منع کر دیا تھا اور فرمایا تھا کہ اگر کسی مجبوری سے تنگ آکر کسی کو سوال کرنا ہی پڑے تو وہ حاکم وسلطان سے سوال کرے۔ نیز چند مواقع کے سوا جو اشد مجبوری کے ہیں آپؐ نے سوال کرنا حرام قرار فرما دیا تھا۔ دیکھئے کتاب الام للشافعیؒ ۲: ۶۲۔

[3] دیکھئے مشکوٰۃ مطبوعہ نور محمد تاجر کتب: ۱۶۳۔

کی بہت زیادہ مستحق[1] ہے۔ لہٰذا حکومت اسلامی صرف مجبوراً فوری ضرورت رفع کرنے کے سوا ہر حال میں نقد رقوم دینے کی بجائے آلات و اوزار دینے یا مواقعِ روزگار مہیّا کرنے کی صورت پیدا کرتی رہے۔

حکومت اسلامی کے تحت صدقات (زکوٰۃ) کا صحیح نظام زیادہ سے زیادہ دس سال میں ملک سے فقر و فاقہ کی لعنت کو سرحدوں سے نکال باہر کرے گا۔ اس وقت تک حکومت کو صدقات (زکوٰۃ) سے وصول ہونے والی دولت کا بھی پورا پورا اندازہ ہو چکے گا۔

مساکین فقراء کو ختم کر دینے کے بعد حکومت اپنے ذرائع و وسائل اور ملکی حالات و ضروریات کو سامنے رکھ کر ایک دس سالہ منصوبہ بنانے کی ابتداء کرے۔ اس دس سالہ منصوبے کا مقصد ملک کے معیارِ زندگی کو بلند سے بلند تر کرنا ہوگا۔ اس مرحلہ پر فقراء کے ساتھ مساکین کو بھی شامل کر لیا جائے گا۔ فقہاء نے فقراء و مساکین کے درمیان حدِ فاصل قائم رکھنے میں بہت کم کامیابی حاصل کی ہے۔ قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت کا تقاضا ہے کہ فقراء و مساکین میں فرق ہو۔ آپ کتاب الاموال[2] میں فقیر و مسکین کے فرق کے سلسلہ میں متعدد اقوال و روایات دیکھیں گے۔ دیگر کتبِ تفسیر و شروحِ حدیث و فقہ میں بھی اس بارے میں تفاصیل ملتی ہیں۔ جن میں بعض اقوال باہمد گر متضاد ہیں۔ تاہم انہی میں کچھ اقوال صحیح رہنمائی بھی کرتے ہیں جنہیں سامنے رکھتے ہوئے قرآن مجید کی روشنی[3] میں ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ "مسکین" سے مراد وہ کاروبار کرنے والا اور برسرِ روزگار ہے جو اپنی تمام بنیادی ضرورتیں پوری نہ کر سکتا ہو۔ اسے یوں سمجھا جا سکتا ہے

---

[1] دیکھئے مشکوٰۃ مطبوعہ نور محمد تاجر کتب: ۱۶۳

[2] دیکھئے باب سہم الفقراء والمساکین من الصدقۃ والفصل بینھما فی التاویل از صفحہ ۶۰۲ تا ۶۰۴ (نمبر ۱۹۳۸ تا ۱۹۴۵)

[3] قرآن مجید میں ہے: اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ (الکہف ۱۸ : ۷۹) یعنی وہ کشتی ان مساکین کی تھی جو سمندر میں کام کرتے تھے۔

کہ اگر ایک آدمی کام کر کے کچھ کما تو رہا ہے لیکن اس کے پاس رہنے کو مکان نہیں، یا رہائش کے لئے مکان ہے تو تن ڈھانکنے کو لباس نہیں یعنی جو کچھ اسے مل رہا ہے اس سے اس کا اور اس کے متعلقین کا گزارہ نہیں ہوتا۔ رہائش کا انتظام کرتا ہے تو لباس کا انتظام نہیں ہوتا۔ پیٹ میں کچھ جاتا ہے تو بدن پر کچھ نہیں رہتا۔ الغرض ایسی کش مکش کا وہ خاموشی سے مقابلہ کر رہا ہے۔ بالکل بے آسرا بھی نہیں کہ قدم قدم پر احتیاج حائل ہو۔ عزت بچانے کے لئے دستِ سوال بھی نہیں پھیلاتا۔ یہ ہے وہ "مسکین" جس کا درجہ "فقیر" کے بعد قابلِ التفات و اصلاح ہے۔

امام شافعیؒ نے مسکین کی تعریف اس طرح کی ہے:

وَالْمِسْكِيْنُ مَنْ لَهُ مَالٌ اَوْ حِرْفَةٌ لَا تَقَعُ مِنْهُ مَوْقِعًا وَلَا تُغْنِيْهِ سَائِلًا كَانَ اَوْ غَيْرَ سَائِلٍ۔[1]	مسکین وہ ہے جس کے پاس مال ہو یا جس نے کوئی پیشہ اختیار کر رکھا ہو لیکن اس سے اُس کی گزر بسر نہ ہوتی ہو اور وہ اپنی ضروریات سے بے نیاز نہ ہو،۔۔۔۔ سوال کرتا ہو یا نہ کرتا ہو۔

"فقرا" کو ختم کرنے کے بعد اس معاشرہ میں "مساکین" شماری ہو گی۔ ہماری بہت بڑی بدنصیبی ہے کہ ہم اسلامی الفاظ و اصطلاحات کا مفہوم سمجھے بغیر ان کا وہی مفہوم اپنے دماغوں میں رکھتے ہیں جو صدیوں سے غلط چلا آ رہا ہے۔ ہم یہی سمجھتے ہیں کہ اسلام میں صدقہ (زکوٰۃ) کا یہی مروجہ ذلت آمیز تصور ہے، اور مسکین وہی ہے جو معاشرے میں ذلیل و بے سہارا ہو اور جس سے سب دور بھاگتے ہوں، حالانکہ اگر مسکین کا صحیح مفہوم سامنے لایا جائے تو اس وقت بہت سے سفید پوش زمرۂ مساکین میں آئیں گے۔

"مسکین" کا تعین کرنے کے لئے اسلامی حکومت کو اپنے وسائل و حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد اسلام کے بلند ترین مقصد کے حصول کے تحت ایک قدم آگے بڑھنے کے لئے ایک "بنیادی معیارِ زندگی" مقرر کرنا ہو گا۔ مثلاً سب سے پہلے دس سالہ منصوبہ بندی کے تحت حکومت ایک

---

[1] کتاب الام شافعی ۲ : ۶۲ ۔

"بنیادی معیارِ زندگی" مقرر کرے گی جس کی رُو سے مُلک کے ہر فرد کو کم از کم مندرجہ ذیل سہولتیں مہیا کی جائیں :-

۱۔ ہر فرد کے لئے صحت مند اور ضرورت کے مطابق غذا کی فراہمی۔

۲۔ ہر فرد کے لئے کم از کم دس جماعت تک تعلیم (جس میں قرآن مجید سمجھ کر پڑھنا لازمی ہو اور ذمّہ دار باخبر شہری بننے کی تربیت دی جائے۔)

۳۔ موسم کے لحاظ سے ضروری لباس۔

۴۔ ہر فرد کی صحت کا بندوبست۔

۵۔ ہر گھرانے کے لئے اس کی ضرورت کے مطابق رہائش گاہ کا انتظام۔

اب جو شخص اتنی استعداد رکھتا ہو کہ مذکورہ بالا "بنیادی معیارِ زندگی" کے مطابق اپنی غذا اور لباس میں تو خود کفیل ہو جائے لیکن صحت و معالجہ کی طاقت نہ رکھتا ہو یا اس کے پاس رہائش گاہ نہ ہو یا وہ تعلیمی اخراجات کا متکفل نہ ہو سکے تو ان میں سے ہر ایک "مسکین" ہو گا، اور "صدقات" (زکوٰۃ) کے مد سے ایسے لوگوں کی محرومی و مسکنت یعنی "بنیادی معیارِ زندگی" تک پہنچنے میں کوتاہی ختم کر دی جائے گی۔ یہ تمام کام اسلامی حکومت اپنے مخلص، محنتی اور دیانتدار مشیروں اور کارندوں کے ذریعہ انجام دے گی۔

اس طرح حکومت اسلامی ہر پانچ یا دس سال کے بعد مُلک کے "بنیادی معیارِ زندگی" کو بلند سے بلند تر کرنے پر نظرِ ثانی کر کے اپنے وسائل کو ملحوظ رکھتے ہوئے ترقی کرتی رہے گی۔ اور ایک دن وہ بھی آئے گا جب اسی نظام سے مُلک کا "بنیادی معیارِ زندگی" اتنا بڑھ جائے گا کہ سواری، عمدہ مکان، اعلیٰ تعلیم، بچّوں کے وظائف، ہر قسم کا سماجی تحفظ اور انسانوں کی ہر ضرورت کی تکمیل "بنیادی معیارِ زندگی" میں شمار ہونے لگے گی۔ مُلک کا ہر فرد "صدقات" دینے والا ہو جائے گا اور اس طرح صدقات کا مستحق افراد نہیں بلکہ پورا معاشرہ بن جائے گا۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کے سامنے معاشرہ کی یہی آسودگی تھی۔ اسی لئے آپ فرماتے تھے کہ لوگوں کو رضاکارانہ صدقہ و خیرات

دے دو، کیونکہ ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے کہ لوگ آسودگی و خوش حالی کی وجہ سے اسے لینے سے انکار کر دیں گے۔[1]

"فقراء و مساکین" کے بعد جتنے اصناف ہیں ان کے بارے میں دو خیال ہیں۔ ایک یہ کہ ان بقیہ اصناف کو بھی اس "مد" سے "فقیری و مسکینی" کی وجہ سے ملے گا۔ دوسرا خیال یہ ہے کہ ان کو اس مد سے دینے کے لئے "فقیری یا مسکینی" کی شرط نہیں ہے۔ ہماری تائید بھی اسی مؤخر الذکر خیال کو حاصل ہے۔ اس لئے کہ ان میں سے جو بھی "فقیر یا مسکین" ہوگا وہ اپنے دوسرے ناموں کی وجہ سے نہیں بلکہ فقیر یا مسکین ہونے کی وجہ سے حصّہ پائے گا۔ اور اس طرح وہ "العَامِلِيْنَ عَلَيْهَا، والمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ، وَفِي الرِّقَابِ، وَالغَارِمِيْنَ، وَفِي سَبِيْلِ الله، وَابْنِ السَّبِيْلِ" میں سے کوئی نہ رہے گا بلکہ محض "فقیر و مسکین" رہے گا۔

اسلامی حکومت کا سب سے پہلا کام فقراء کو ختم کرنا اور پھر مساکین کو بلند سے بلند تر معیارِ زندگی تک پہنچانا ہے۔ فقراء کو ختم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ملک میں اس قسم کے مستقل انتظامات ہوں کہ جہاں معاشرہ میں فقر نمودار ہو، فوراً اس کا تدارک و مداوا ہو جائے۔

اب ہم مختصراً بقیہ اصناف پر روشنی ڈالتے ہیں:

العَامِلِيْنَ عَلَيْهَا صدقات (زکوٰۃ) کے اموال کو جمع اور خرچ کرنے کیلئے حکومت جو دفاتر، محکمے یا وزارت بنائے یا جو بیت المال قائم کرے ان تمام دفتروں کے اخراجات انہی صدقات سے پورے کئے جائیں گے۔ اس ضمن میں جس طرح صدقات (زکوٰۃ) دینے والے خدا ترسی اور عبادت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے فرائض سرانجام دیں گے اسی طرح حکومت بھی اسلامی تعلیمات کی پابندی کرتے ہوئے اپنے فرائض امانت و دیانت سے انجام دینے کی پوری پوری کوشش کرے گی تاکہ یہ نظام صدقات (زکوٰۃ) اپنے متوقع نتائج نکال کر نہ صرف مُلک و ملّت کو فقر و احتیاج سے پاک صاف کر دے...

---

[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عدی بن حاتم سے فرمایا تھا: شاید تم اسلام قبول کرنے میں اس لئے تامّل کر رہے ہو کہ تمہیں مسلمانوں میں کچھ احتیاج و فقر نظر آ رہا ہے لیکن میں تمہیں بتاتا ہوں کہ عنقریب ان پر مال کی ایسی بارش ہوگی کہ اسے لینے والا نہیں ملے گا۔ (تاریخ ابن خلدون ج ۴ : ۲۴۹)

بلکہ تمام دنیا کے سامنے جو اس وقت اقتصادی مشکلات کے حل کی شدت سے منتظر ہے ایک عملی اسلامی نمونہ پیش کرکے اس باب میں رہنمائی کرے۔

عاملین صدقات (زکوٰۃ) کی حیثیت مالیات کے سرکاری افسروں اور ملازمین کی سی ہوگی۔[1] انہیں اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے میں نہایت پاکیزہ کردار کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ ان کا صالح اور متدین ہونا ضروری ہے تاکہ رشوت اور غبن کا دخل نہ ہو۔

الْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ صدقات (زکوٰۃ) کا ایک مصرف اسلامی سربلندی کے لئے ان لوگوں کی اعانت کرنا ہے جن کی مختلف صلاحیتوں اور اثر و رسوخ سے اسلام کو تقویت بہم پہنچے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے ان مسلمانوں کی تائید حاصل کی جائے جو اپنی کمزوریوں کی وجہ سے طاغوتی نظام میں شامل ہوگئے ہوں، اسلام کی طرف مائل غیر مسلموں کو مالی سہارا بھی دیا جاسکتا ہے۔ نومسلموں کی دستگیری بھی اسی مد سے کی جائے گی۔ عالمی رائے عامہ کو اسلام کے حق میں ہموار کرنے کے لئے بھی یہی مد کام دے گی۔ اس قسم کے اخراجات اسلامی حکومت اپنے وسائل اور ضرورت و اہمیت کے پیش نظر اس مد سے اندرون و بیرون ملک جاری رکھے گی۔ غیر مسلموں کو اسلام سے مانوس کرنے سکے مختلف پرحکمت ذرائع سے تبلیغ کرنے کے لئے یہی مد کام آئیگی۔ تمام ایسی طاقتیں جن سے اسلام کو نفع یا ضرر کی توقع ہو، ان کا نفع حاصل کرنے اور ان کے ضرر سے محفوظ رہنے کے لئے بھی اس مد سے اخراجات کئے جائیں گے۔

واضح رہے کہ ملک میں فقر و مسکنت کی موجودگی میں یہ محکمہ برائے نام جاری رہ سکتا ہے۔ اس کو تقویت و وسعت اسی وقت حاصل ہوگی جب ملک میں کوئی مسلم فقر و مسکنت میں باقی نہ رہے۔

فِي الرِّقَابِ اس سے مراد غلام ہیں جن کی گردنیں دوسروں کے ہاتھ میں ہوں، نیز وہ محکوم، نظربند، قیدی جو اپنی مرضی کے مالک نہیں اندرون ملک یا بیرون ملک جہاں بھی

---

[1] کتاب الاموال: ۶۰۶ (نمبر ۱۹۵۸)۔

کسی قسم کی غلامی کی لعنت یا طاقتور ظالم کا کمزور مظلوم پر ایسا دباؤ ہے جس سے وہ اپنی آزادی میں خلل یا اذیت پا رہا ہے اس کا ازالہ اور استعمار کی غلامی سے آزاد کرانا بھی اِسلامی فریضہ ہے۔ جہاں جہاں اِسلام دشمن طاقتوں نے مسلمانوں کو دبا رکھا ہو اس مد سے اُن کی گلو خلاصی کرائی جائے گی۔ ہمارے زمانے میں کشمیر، فلسطین اور قبرص کے مسلمانوں کو آزاد کرانے کے لیے بھی یہی رقم خرچ ہوگی۔ جب تک مُسلمان غلامی سے آزاد نہ ہوں اس مد سے غیر مُسلموں پر خرچ نہیں کیا جائیگا کیونکہ اس مد میں پہلے مسلمانوں کا حق ہے اور یہ حقِ اوّلیت ہر موقع پر ملحوظ رہے گا۔

الغارمین الغارمین سے عموماً "مقروض لوگ" مراد لئے گئے ہیں۔ لیکن یہ لفظ مجرّد قرضداروں کے لئے نہیں، بلکہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو کسی بڑی ضمانت لینے یا ایک دم کاروبار میں گھاٹا ہو جانے یا کسی غیر متوقع ذمّہ داری کے آن پڑنے سے مالی مشکلات میں مُبتلا ہو کر زیر بار ہو جائیں یہ ضروری نہیں کہ وہ فقیر و نادار ہی ہو جائیں۔ امام اللغہ راغب اصفہانی نے لکھا ہے:

الغُرْمُ ماینوب الانسان فی مالہ من ضَرَرٍ بغیر جنایۃ منہ او خیانۃ۔[1]	غُرم سے مراد ایسا مالی نقصان ہے جو کسی شخص کو نہ تو اپنے جُرم کی پاداش میں اُٹھانا پڑے اور نہ کسی خیانت کی وجہ سے برداشت کرنا پڑے۔

غارم کے ایک معنے یہ ہیں:

الغارم الذی یلتزم ماضمنہ وتکفل بہ۔[2]	غارم وہ ہے جو کسی چیز کی ضمانت لینے یا ذمہ داری لینے سے پابند ہو جائے۔

"غَرام" اس کیفیت کو کہتے ہیں جو بغیر ہٹے مسلسل پریشان کرتی رہے اور اس سے انسان کو نجات نہ مل سکے۔[3]

---

[1] دیکھئے مفردات راغب مادہ "غ ر م"

[2] لسان العرب مادہ "غ ر م"۔

[3] تاج العروس مادہ "غ ر م"

اس طرح وہ لوگ جو ضمانت یا کفالت کی ذمہ داری برداشت کرنے کی وجہ سے مالی مشکلات کا سامنا کر رہے ہوں اس مد کے مستحقین قرار پائیں گے۔ ہم یہ خیال بھی نہیں کر سکتے کہ کھاتے پیتے اور آسودہ حال یا بڑے بڑے سرمایہ داروں اور تاجروں کے قرض اس ذیل میں آسکتے ہیں۔ البتہ ایسے مقروض اور تاوان زدہ اس میں آسکتے ہیں جو قرض لینے اور تاوان برداشت کرنے کے بعد اپنے مالی حالات سے مطمئن نہ رہیں یا اپنی ضروریات سے زیادہ نہ رکھتے ہوں، یا دوسروں کی ضمانت لینے کی وجہ سے اپنی مالی حالت کمزور پاتے ہوں۔

اس قسم کی زیر باری خواہ ذاتی کاموں کے انجام دینے میں ہوئی ہو یا قومی و اجتماعی مفاد کی خاطر۔ اگر ایسا تاوان زدہ شخص محکمہ صدقات (زکوٰۃ) کو درخواست کے ذریعہ اپنے حالات سے اطلاع دے کر اپنے لئے مدد طلب کرے تو محکمہ ایسے درخواست گزاروں کے حالات کا جائزہ لے گا اگر اُن کی زیر باری و قرضداری میں کسی قسم کی بے راہ روی کا شائبہ نہ ہو اور اُن کے نقصان اُٹھانے کا سبب معقول ہو اور اس کی ضمانت میں مفادِ عامہ کا پہلو ہو تو محکمہ ایسے شخص کا بار کلّی طور پر یا جزئی طور پر اپنے ذمہ لے کر اُسے زیر بار ہونے سے بچالے گا۔

سبیل اللہ اس میں سب سے پہلے اسلامی مملکت اور اس کی سرحدوں کا دفاع ہے اور جس وقت بھی مملکت اسلامی کے دفاع کی ضرورت ہو تو وہ تمام منصوبے چھوڑ کر اپنی تمام قوتیں " سبیل اللہ" میں صرف کرے گی۔ اسلامی مملکت کو مستحکم بنانے کے لئے اسلحہ کے کارخانے اور فوجی ضروریات کی تمام چیزیں فراہم کرنا بھی "فی سبیل اللہ" ہے۔

ویسے "سبیل اللہ" بڑا جامع کلمہ ہے۔ ہر وہ ذریعہ جس سے اللہ کا بول بالا ہو اللہ کی تعلیمات عام ہوں، اللہ کے پسندیدہ کام رواج پائیں، مسلمانوں کے اجتماعی مفاد اور اسلامی مملکت کو استحکام نصیب ہو، انسانوں کی ہمہ گیر فلاح و بہبود ہو، سبیل اللہ ہے۔ معاشرہ میں "خیر" یعنی "بہتر سے بہترین" کی طرف جانا بھی "سبیل اللہ" میں شامل ہے اور اس کی حدود متعین کرنا ہر زمانہ میں اسلامی حکومت کا فریضہ ہے۔ بعض صحابہؓ و ائمہ نے حج بھی

"سبیل اللہ" میں شمار کیا ہے کہ یہ بھی اعلاءِ کلمۃ اللہ اور عالمگیر اسلامی معاشرہ کی اجتماعی قوتوں کو بڑھانے میں ایک رُکن رکین ہے۔

اجتماعی نقصانات کی تلافی کر کے دو گروہوں کو لڑنے سے بچا لینا اور ان میں مصالحت پیدا کرا دینا بھی "فی سبیل اللہ" ہے۔

اِسلامی علاقوں کی بازیافت، ہر قسم کی قوت سے اسلام کی مدافعت کرنا اور دُنیا کو اسلام کی طرف دعوت دینا بھی "سبیل اللہ" میں شامل ہے۔

مسلمانوں کو فوجی تربیت دینا، موجودہ ٹیکنیکل تعلیمات دلانا، احیاءِ ثقافتِ اسلامی ضروری تعلیم کا بندوبست کرنا، الغرض تمام وہ امور جن سے عامۃ المسلمین اور اسلام کا مفاد وابستہ ہو "فی سبیل اللہ" ہوگا۔

اِبْنُ السَّبِیْل ابن السبیل سے مُراد عموماً مسافر لیا جاتا ہے، یعنی صدقات کی مد سے مسافروں کی سہولت، زیادہ سے زیادہ پُرآسائش سفر کا بندوبست، مسافروں کے قیام وطعام کا معقول اِنتظام کرنے اور اُنہیں بخیریت اپنی منزل پر پہنچا دینے میں صرف کیا جائے۔

ہمارے خیال میں "مسافر"، جو عربی لفظ ہے، اسے چھوڑ کر "ابن السبیل" اختیار کرنے میں یہ نکتہ ہے کہ "ابن السبیل" سے مراد ایسا مسافر ہے جو دائم سفر میں رہے، یا جسے مسلسل سیروسیاحت اور سفر سے دلچسپی ہو۔ اِس لئے کہ اِس قسم کی اضافتوں میں "ابنٌ" سے مراد وہ ہوتا ہے جسے اُس کے مضاف الیہ نے اپنی تربیت ونگرانی میں پروان چڑھایا ہو یا جس نے اپنے مضاف الیہ کی بڑی خدمت اور دیکھ بھال کی ہو یا جسے اس سے خصوصی تعلق اور بڑی دلچسپی ہو۔ یا جس نے اس چیز کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہو۔ مثلاً "اِبْنُ حَرْبٍ" سے مُراد ہے وہ شخص جس کی عمر لڑائیوں میں گزری ہو اور اُسے جنگ سے بڑی دلچسپی ہو، اِسی طرح "اِبْنُ الْعِلْمِ" سے مُراد ہے وہ شخص جس کا ہمہ وقت لگاؤ

علم سے ہو اور جو خدمتِ علم میں اپنے آپ کو وقف کر چکا ہو۔ اور جس کی پوری توجّہ علم سیکھنے سکھانے میں ہو۔[1]

اِس طرح یہ لفظ اپنی وسعتوں میں سیّاحی اور بین الاقوامی تبلیغ دین کو بھی لے لیتا ہے۔ اِس لئے کہ ایک مسلمان کا مسلسل سفروں میں زندگی گزارنا یعنی سیاحت اختیار کر لینا مسلسل تبلیغِ دین کے مترادف ہوتا ہے اور اس قسم کے رُجحانات جن مسلمانوں میں پائے جائیں اُن کی حوصلہ افزائی بھی اسی مد سے کی جائے گی۔ ہمارے خیال میں اس لفظ کی وسعتوں میں وہ "پیشرو" (PIONEERS) بھی آجاتے ہیں جو دینی تبلیغ کے لئے دوسرے ممالک میں جا کر بسنا اور آباد ہونا پسند کریں۔ ان لوگوں کو اسلامی حکومت پوری پوری مدد بہم پہنچائے گی۔ غیر مُلکی سیّاحوں کی مہمان نوازی کر کے اُنہیں اسلامی تعلیمات و اخلاق سے متاثر کرنے میں بھی یہ مد کام میں لائی جا سکتی ہے۔

ہنگامی حالات میں خانہ بدوش، ایک علاقہ سے پریشان ہو کر دوسرے علاقے میں جانے والے بھی اس مد سے امداد کے مستحق قرار پا سکتے ہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ قرآن مجید نے "مسافر" کی جگہ "ابن السبیل" کا لفظ استعمال کر کے دینِ اسلام کی انہی وسعتوں کو ملحوظ رکھا ہے اور شاید دُنیا کے کسی دین میں یہ توسیع و جامعیت ہمیں نہیں مل سکے گی۔

اموالِ ظاہرہ اور اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ

عُلماء نے اموالِ تجارت، زرعی پیداوار، مویشی اور معادن و دفائن کو اموالِ ظاہرہ اور نقدی، سیم وزر اور زیورات کو اموالِ باطنہ کہا ہے۔ پھر بعض علماء فقہ نے بعد میں یہ کہہ دیا کہ حکومت اموالِ ظاہرہ کی زکوٰۃ لینے کی مجاز ہے اور اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ ان کا مالک نجی طور پر مستحقین میں تقسیم کرنے کا مجاز ہے۔ اس کی مصلحت بعض حضرات یہ بتاتے ہیں کہ اِس طرح لوگوں کو اپنے طور پر خیرات کا حق رہے گا

---

[1] دیکھئے مفرداتِ راغب۔ مادہ "ب ن و"۔

اور وہ اپنی دانست میں اپنے اعزہ و اقربا یا آس پڑوس والوں کو جنہیں وہ مستحق سمجھیں یہ زکوٰۃ ادا کر دیں۔

ہم اس قسم کا کوئی فرق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا خلافت راشدہ کے عہد میں نہیں پاتے وہاں "زکوٰۃ" یا "صدقہ مفروضہ" کے نام سے جو کچھ بھی مقرر کیا جاتا تھا وہ حکومت کے نمائندوں ہی کو دیا جاتا تھا اور کسی کو یہ حق نہ تھا کہ وہ نظام زکوٰۃ یا صدقہ قائم ہونے کے بعد حکومت اسلامی کے مفروضہ حصہ کو اپنی صوابدید سے تقسیم کر دے۔ البتہ اموال ظاہرہ اور اموال باطنہ سے "صدقہ" وصول کرنے میں جو ایک فرق ہمیں نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ اموال ظاہرہ کے متعلق سرکاری نمائندہ ظاہری اعداد و شمار اور حساب سے "صدقہ" وصول کرے گا۔ اگر اموال ظاہرہ کا مالک ان سے گریز کرنے کی کوشش کرے گا تو اس کے خلاف قانونی کارروائی کی جا سکے گی لیکن اموال باطنہ پر اسلامی حکومت، مالک اموال کے بیان کو مسلمان ہونے کی وجہ سے آخری مانے گی اور اس بارے میں اس کے ایمان پر اعتماد کرے گی اور جب تک صریح غلط بیانی ثابت نہ ہو جائے اُس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جائے گی۔ اپنے طور پر زکوٰۃ کی تقسیم صرف اُسی وقت تک ممکن ہے جب تک کہ اسلامی مملکت میں نظام صدقات و زکوٰۃ جاری نہیں ہوتا یا کسی خاص مصلحت کی بنا پر حکومت اسلامی افراد کو کچھ رعایات دیدے اور بعض حدود میں انہیں مختار بنا دے۔ بصورت دیگر اسلامی مملکت میں ہر قسم کے اموال پر "زکوٰۃ و صدقہ مفروضہ" صرف حکومت کے نمائندے ہی لیں گے اور افراد کو اپنے طور پر صرف "صدقات تطوع" ہی تقسیم کرنے کی اجازت ہوگی۔

صدقۂ فریضہ اور صدقۂ تطوع

جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، "کتاب الاموال" میں امام ابو عبیدؒ نے جن اموال کا ذکر کیا ہے وہ تمام کے تمام حکومت اسلامی کی نگرانی میں وصول اور خرچ کئے جانے والے اموال ہیں۔ "کتاب الصدقہ" کے تحت امام موصوف بہت سے ایسے واقعات بھی درج کر دیتے ہیں جو "نظام صدقات" قائم ہونے سے قبل ہوتے رہے۔ لہٰذا اس قسم کی جتنی صورتیں ہمیں نظر آتی ہیں کہ رسول اللہ ؐ نے لوگوں کو "صدقہ" نجی طور پر خرچ

کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ اکثر واقعات "نظامِ صدقات" کے قیام سے پہلے کے ہیں یا پھر وہ "صدقاتِ تطوع" ہیں۔ ان میں شاذونادر ہی کوئی ایسی صورت دلائل و ثبوت سے پیدا کی جاسکتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے "صدقۂ فریضہ" کو نجی طور پر ادا کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ ہمیں تو اس کا کوئی ثبوت نہیں مل سکا لیکن اگر کوئی ثابت کر سکے تو وہ واقعہ حکومت کی خصوصی مراعات میں شامل ہو جائے گا جس کے معنے یہ ہوں گے کہ اسلامی حکومت کو اجازت ہوگی کہ بعض مخصوص حالات میں "صدقۂ فریضہ" کا کوئی حصہ کسی خاص فرد کو نجی طور پر خرچ کرنے کی اجازت دے دے اور بس۔ کتاب الاموال کے ترجمہ کے حاشیہ میں ہم جا بجا "صدقات" کی قسموں کی نشاندہی کرتے جائیں گے تاکہ اس بارے میں حقائق منکشف ہو جائیں۔

ہمیں اعتراف ہے کہ احادیث کے مجموعوں اور فقہ کی کتابوں میں اس امر کی بہت ہی کم کوشش کی گئی ہے کہ صدقاتِ فریضہ اور صدقاتِ تطوع میں حد بندی کی جائے حقیقت یہی ہے کہ حکومت اسلامی کی کمزوری اور "نظامِ صدقات و زکوٰۃ" میں تساہل برتنے کی وجہ سے زکوٰۃ و صدقاتِ فریضہ اور صدقاتِ تطوع وغیرہ کے احکام کچھ اس طرح خلط ملط ہو چکے ہیں کہ ان میں امتیاز کرنا مشکل ہو چکا ہے۔ تاہم اگر یہ اصول تسلیم کر لیا جائے کہ مملکتِ اسلامی میں "زکوٰۃ" اور اس کے تحت مقرر کیے گئے "صدقاتِ فریضہ" صرف اسلامی حکومت اور اس کے نمائندے ہی وصول کرنے اور خرچ کرنے کے مجاز ہیں تو ایک بڑی حدِ فاصل قائم ہو جاتی ہے اور آسانی سے فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ "صدقہ" کا لفظ فلاں مقام پر کن معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

صدقہ فریضہ اور صدقہ تطوع کو الگ الگ کرنے میں ایک نمایاں کوشش حجۃ الاسلام امام ابوحامد محمد غزالیؒ نے اپنی کتاب احیاء علوم الدین[1] میں کی ہے۔ انہوں نے آخر میں صدقہ تطوع کو صرف "صدقہ" لکھا ہے اور صدقہ فریضہ کو "زکاۃ"[2]۔ پھر وہ لکھتے ہیں کہ صدقہ میں مستحق

---

[1] احیاء علوم الدین للغزالیؒ ۲۳۲ تا ۲۳۷ [2] ایضاً ۱: ۲۳۶۔

کی قید نہیں اور زکوٰۃ دے کر کوئی کسی پر احسان نہیں جتا سکتا۔ تاہم امام غزالیؒ کی یہ کوشش "صدقۂ تطوع" اور "زکوٰۃ" "وصدقۂ فریضہ" کو الگ الگ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ کیونکہ وہ پھر زکوٰۃ کو بھی نجی طور پر تسلیم کرا دیتے ہیں۔

ہم امام غزالیؒ کے اس جملہ سے کہ لأن الزکوٰۃ لا منّۃ فیہا وانما ھو حق واجب للہ سبحانہ۔" (ترجمہ) اس لئے کہ زکوٰۃ میں کوئی احسان جتانے کی صورت نہیں، کیونکہ وہ اللہ کی طرف سے واجب کردہ حق ہے۔" یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ایسی زکوٰۃ وہی ہوتی ہے جو نظام کے تحت حکومت تقسیم کرے، ورنہ انفرادی طور پر دی جانے والی "زکوٰۃ" بارِ احسان کے شائبہ سے کسی صورت بھی پاک نہیں ہو سکتی۔

اِستدراک

امام ابو عبیدؒ نے کتاب الاموال کے اس حصہ میں محض نام کے جزئی اشتراک کی وجہ سے "جزیہ" کا پورا باب ہی کتاب الصدقۃ میں شامل کر دیا ہے۔ دراصل یہ "دگنا صدقہ" بنی تغلب سے جو عیسائی تھے، ایک معاہدہ کے تحت وصول کیا گیا تھا۔ ہمارے خیال میں یہ باب (جو کتاب الاموال کے صفحہ ۵۴۰ سے ۵۴۶ تک پھیلا ہوا ہے از نمبر ۱۶۲۳ تا ۱۷۱۹) کتاب الاموال کے حصہ اوّل میں ہونا چاہیئے تھا۔ جس میں جزیہ وخراج وفئے وخمس وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔

اسی طرح انہوں نے معدنیات، دفائن اور سمندری اشیاء سے لئے جانے والے خمس (۱/۵) کو کتاب الصدقہ کے تحت نہیں بلکہ کتاب الخمس کے تحت بیان کیا ہے، حالانکہ ان تمام اشیاء پر مسلمانوں سے لیا ہوا خمس بہرحال زکوٰۃ ہو گا اور اسے بجائے کتاب الخمس کے کتاب الصدقہ کے تحت آنا چاہیئے تھا۔

نظامِ زکوٰۃ و صدقات کو کتاب اللہ وسنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں دیکھنے کی یہ ایک حقیر سی تحقیقی کوشش علماء و محققین کے سامنے پیش ہے، حرفِ آخر نہیں۔ اگر ہم اسلاف

کے علمی و فکری ذخیرہ کو سامنے رکھ کر پیش آمدہ مسائل کو سمجھنے میں اُن سے مدد لیں اور قرآن و سُنّت کے سوا کسی کو حرفِ آخر نہ قرار دیں، اجتہاد جاری رکھیں تو اللہ تعالےٰ ہماری مشکلات آسان فرمائے گا۔ اور ہمیں دُنیا کی امامت پر بحال کر دے گا۔ وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰہَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ۔

اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْہِ اُنِیْبُ۔

اب ہم آپ کے سامنے کِتَابُ الْاَمْوَال کے اِس حصّہ کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔ جس کا نام امام ابوعبیدؒ نے کِتَابُ الصَّدَقَۃ رکھا ہے۔

عبدالرحمٰن طاہر سُورتی
ریڈر ادارہ تحقیقاتِ اسلامی
اسلام آباد

کتاب الاموال

(حصّہ دوم)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فصل

صدقہ (زکوٰۃ) کے احکام و قوانین کا بیان

باب

صدقہ[1] کے فضائل اور اُس کے دینے میں ثواب

(۸۹۵) - ابو ہریرہ رضؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

صدقہ کی قبولیت اور اُس کا نشوونما

"اللہ تعالیٰ صدقات قبول فرماتا ہے اور اُن میں سے صرف پاکیزہ ہی کو شرفِ قبولیت بخشتا ہے۔ وہ انہیں اپنے داہنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ پھر معطی کے لئے اس صدقہ کی اس طرح پرورش اور نشوونما فرماتا ہے جس طرح تم میں سے ایک اپنے گھوڑے یا اونٹ کے بچے کی پرورش کرتا ہے، تاآنکہ (صدقہ کا) ایک لقمہ بڑھ کر اُحد پہاڑ کے برابر ہو جائے گا۔"

(۸۹۶) - اِس روایت کے ایک دوسرے راوی کو میں نے اس میں یہ اضافہ کرتے سُنا ہے: "پھر آپؐ نے یہ آیت پڑھی:

---

[1] اِس باب میں "صدقہ تطوّع" اور "صدقہ فریضہ" ملے جلے ہیں اور بیشتر کا تعلق "صدقہ تطوّع" سے ہے۔

يَمۡحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرۡبِي الصَّدَقٰتِ (البقرۃ ۲ : ۲۷۵)	اللہ ربا کو مٹاتا اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔

(۸۹۷)۔ ابوہریرہ رضؓ سے دو اور مختلف اسناد سے بھی یہی مذکورہ بالا
(۸۹۸)۔ حدیث مروی ہے۔

صدقہ بُری طرح مرنے سے بچاتا ہے

ابوہریرہ رضؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "صدقہ بُری طرح مرنے سے بچاتا ہے" اور یہ کہ صدقہ سائل کے ہاتھ میں جانے سے قبل اللہ کے ہاتھ میں پہنچتا ہے۔"

(۹۰۰) - عبداللہ بن مسعود رضؓ کہتے ہیں: جب بھی کوئی شخص صدقہ دیتا ہے تو وہ سائل کے ہاتھ میں جانے سے پہلے اللہ کے ہاتھ میں پہنچتا ہے اور وہ اسے سائل کے ہاتھ پر رکھتا ہے۔ پھر عبداللہ بن مسعودؓ نے یہ آیتِ کریمہ پڑھی:

أَلَمۡ يَعۡلَمُوٓا أَنَّ اللّٰهَ يَقۡبَلُ التَّوۡبَةَ عَنۡ عِبَادِهٖ وَيَأۡخُذُ الصَّدَقٰتِ. (التوبۃ ۹ : ۱۰۵)	کیا انہیں معلوم نہیں کہ اللہ اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا اور صدقات لیتا ہے۔

(۹۰۱)۔ ابوالدرداءؓ کہتے ہیں: "اے دَرۡدَاء کی ماں! اللہ تعالیٰ کے پاس ایسی زنجیریں ہیں جو جہنم کی آفرینش کے دن سے لے کر اس دن تک کہ جس دن وہ لوگوں کی گردنوں میں ڈالی جائیں گی، مسلسل جہنم کی دیگوں میں اُبل رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اللہ عزّوجل پر ایمان لے آنے کی وجہ سے اس کے آدھے حصّے سے نجات بخش دی ہے، تو اے دَرۡدَاء کی ماں! (بقیہ نصف حصّہ سے بچنے کے لئے) مسکین کے کھلانے پر رغبت دلاتی رہو۔"

ابوعبید: ابوالدرداءؓ کا مذکورہ بالا قول مندرجہ ذیل آیتِ کریمہ کی شرح کر رہا ہے:

اِنَّہٗ کَانَ لَا یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ الْعَظِیْمِ ۝ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ ۝ (الحاقۃ ۶۹ : ۳۳-۳۴)

بلا شبہ وہ اللہ بزرگ و برتر پر ایمان نہ رکھتا تھا اور مسکین کے کھلانے کی ترغیب نہ دیتا تھا۔

صدقہ دینے والے کے مال کی حفاظت کرتا ہے

(۹۰۲) - زہری رح کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب کوئی بندہ بحُسن و خوبی صدقہ ادا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کے چھوڑے ہوئے مال کی باحسن طریق قائم مقامی کرتا ہے۔"

صدقہ کی راہ میں شیاطین حائل ہوتے ہیں

(۹۰۳) - بُریدہ رضہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کوئی شخص اس وقت تک کوئی چیز نہیں نکالنے پاتا تاآنکہ وہ اسے دینے کے لئے ستّر شیطانوں کے جبڑوں سے نہ چھڑا لے[1]۔"

صدقہ کا ہر ذرہ اجر رکھتا ہے

(۹۰۴) - عدی بن حاتم رضہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا: "(جہنم کی) آگ سے بچنے کی کوشش کرو، خواہ کھجور کے ایک ٹکڑے کے ذریعے (ایسا ممکن) ہو۔ لیکن اگر یہ بھی میسّر نہ ہو تو صرف اچھی بات ہی کہہ دو۔"

(۹۰۵) - عدی بن حاتم رضہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "(جہنم کی) آگ سے بچو، خواہ کھجور کے ایک ٹکڑے کے ذریعہ (ایسا ممکن) ہو۔ پھر حضور ص نے (جہنم کے ہولناک منظر سے) کراہت فرماتے ہوئے رُخ پھیر لیا۔

(۹۰۶) - حضرت عائشہ رضہ سے روایت ہے کہ لوگوں نے ایک بکری ذبح کی.... حضرت عائشہ رضہ کہتی ہیں، پھر میں نے کہا "یا رسول اللہ! بکری کے دست کے سوا اس میں سے کچھ نہیں بچا ہے"۔ اِس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اس کا سارا حصّہ بچ گیا صرف

---

[1] مطلب یہ ہے کہ ستّر شیطان صدقہ کی راہ میں حائل رہتے ہیں اور انسان کو راہِ خدا میں مال نکالنے کے لئے بہت سی سرکش خواہشات سے لڑنا پڑتا ہے۔

دست نہیں بچا۔"

ابو عبیدؒ: اس سے آپؐ کا مقصد یہ تھا کہ جو کچھ انہوں نے صدقہ کر دیا ہے وہ تو ان کا ہو گیا (اور وہ انہیں ملے گا، لیکن جو اُن کے اپنے استعمال میں آگیا وہ ختم ہو گیا)۔

(۹۰۷)۔ عطاء بن فروخؒ سے روایت ہے کہ ایک سائل نے عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے بھیک مانگی۔ اس وقت ان کے پاس کھجور تھے۔ چنانچہ انہوں اُسے ایک کھجور دے دیا۔ اس سائل نے اس پر بُرا مانا۔ اس پر ان (عبدالرحمٰن بن عوفؓ) سے دریافت کیا گیا: وہ (سائل) اس کا کیا کرے گا؟" تو عبدالرحمٰن (بن عوفؓ) نے جواب دیا: "اللہ تو اس میں سے ایک ذرہ برابر وزن قبول فرماتا ہے اور تم اس پورے کھجور پر بھی راضی نہیں ہو؟"

ابو عبیدؒ: عبدالرحمٰنؓ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے:

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ط (الزلزال ۹۹ : ۷)	تو جو ذرہ کے وزن برابر بھی بھلائی کرے گا وہ اسے دیکھ لے گا۔

(۹۰۸)۔ ابو مدینہ کہتے ہیں کہ ایک سائل نے عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے بھیک مانگی اور اس وقت اُن کے سامنے انگوروں کا تھال تھا تو انہوں نے اُسے ایک انگور دے دیا۔ پھر کہا: "اس میں بہت سے ذرّوں کے برابر وزن ہیں۔"

(۹۰۹)۔ ہمیں ایک دوسرے راوی سے اسی سند سے یہ مؤخر الذکر واقعہ بجائے عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے سعد بن ابی وقاصؓ کے ساتھ ہونے کی روایت ملی ہے۔

(۹۱۰)۔ زینب بنت نصر کہتی ہیں کہ میں اہلِ کوفہ کی عورتوں کے ساتھ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں پہنچی۔ اُن کے پاس انگور تھے۔ ابھی ہم ان کے پاس ہی تھے کہ ایک سائل آگیا انہوں نے کچھ دانے لے کر اس سائل کو دے دیئے۔ اِس پر ہم (عورتیں) آپس میں ایک دوسری کو دیکھ کر ہنسنے لگیں۔ انہوں نے دریافت کیا: "کیا تم کوفہ والیاں ہو؟" ہم نے کہا، "ہاں"۔ تو اُنہوں نے کہا "اِن دانوں میں جن کو تم دیکھ رہی ہو، بہت سے ذرّوں کے برابر وزن ہیں۔"

افضل صدقہ

(۹۱۱)۔ جابر بن عبداللہ رضہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا: "کونسا صدقہ افضل ہے؟" تو آپؐ نے فرمایا: "کم مال والے کی گاڑھی کمائی کا۔"

(۹۱۲)۔ حسنؒ کہتے ہیں کہ کسی شخص نے عثمان بن ابی العاص سے کہا: "اے ابو عبداللہ! تم ہم سے بڑی دوری اختیار کر گئے ہو۔" انہوں نے کہا: "یہ کیسے؟" اُس شخص نے کہا: (اس طرح کہ) تم صدقہ بھی دیتے ہو، کام بھی کرتے ہو، عطیے بھی دیتے ہو۔" انہوں نے کہا: "کیا تم ہماری اس فراوانی پر بھی رشک کرنے لگے ہو؟" اُس شخص نے کہا: اللہ کی قسم، یہی بات ہے۔" اِس پر عثمان نے کہا: "اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ وہ ایک درہم جسے تم میں سے ایک (راہِ خدا میں) خرچ کرتا ہے، اپنی گاڑھی محنت کی کمائی میں سے اسے نکالتا ہے۔ پھر اُسے اُس کی صحیح جگہ پر رکھتا ہے۔ اُس کا وہ (ایک درہم) میری نظر میں ان دس ہزار درہموں سے افضل ہے جو ہم میں سے ایک خرچ کرتا ہے اور جس کی حیثیت سمندر سے شبنم کی سی ہے۔"

(۹۱۳)۔ ابو ہریرہ رضہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا: "کونسا صدقہ افضل ہے؟" آپؐ نے فرمایا: "وہ جو کینہ ور رشتہ دار کو دیا جائے۔"

(۹۱۴)۔ ایک اور سند سے بھی یہی روایت مروی ہے لیکن اس سند میں تابعی (ابن شہاب) بغیر صحابی کے واسطہ کے براہِ راست حضورؐ تک پہنچ رہا ہے۔

دوہرا صدقہ

(۹۱۵)۔ سلمان بن عامر ضبّی رضہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کسی مسکین کو صدقہ دینا تو ایک حیثیت سے صدقہ ہے لیکن رشتہ دار کو صدقہ دینا دوہری حیثیت رکھتا ہے۔ ایک تو صدقہ دوسرے صلہ رحمی۔"

(۹۱۶) - ایک اور روایت میں (سلمان) میں سے اختلاف سند کے ساتھ یہی مضمون مروی ہے۔

(۹۱۷) - عبداللہ بن مسعود رضؓ کہتے ہیں: "صدقہ غنیمت (کا باعث) اور اُس کا ترک کرنا تاوان و خسارہ (کا موجب) ہے۔"

(۹۱۸) - کعبؓ کہتے ہیں: "جمعہ کے دن صدقہ (کا اجر) دگنا کر دیا جاتا ہے۔"

باب

صدقہ (زکواۃ) روکنے یا اسے نہ دینے پر سخت تنبیہ

(۹۱۹)۔ عبداللہ رضؓ کہتے ہیں: "جس نے نماز قائم کی اور زکوٰۃ نہ دی تو اُس کی کوئی نماز (قبول) نہ ہوگی۔"

(۹۲۰)۔ ابوالاحوصؒ سے بھی یہی روایت مروی ہے۔

(۹۲۱)۔ ابوذرؓ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا۔ آپؐ اُس وقت کعبہ کے زیرِ سایہ تشریف فرما تھے۔ جب آپ نے مجھے سامنے سے آتے دیکھا تو فرمایا: "کعبہ کے رب کی قسم، وہی لوگ بڑے گھاٹے میں ہیں۔" میں نے کہا: "مجھے کیا ہوگیا، کہیں میرے بارے میں کوئی وحی تو نازل نہیں ہو گئی؟ کون ہیں وہ (گھاٹے والے) لوگ؟ میرے ماں باپ آپؐ پر فدا ہوں۔" تو آپؐ نے فرمایا: "(یہ بڑے گھاٹے والے سرمایہ دار) بہت مال والے ہیں۔ اور ان میں سے صرف وہی لوگ اس گھاٹے سے بچے رہیں گے جو اپنا مال دھوبے بھر بھر کر اپنے سامنے دائیں اور بائیں اس طرح تقسیم کرتے رہے۔ (پھر آپؐ نے دھوبے بھر کر اشارے سے اس قول کی تشریح فرمائی)، پھر فرمایا: "اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تم میں سے جو بھی ایسے اونٹ یا بکریاں یا گائیں چھوڑ کر مرا جن کی زکات اُس نے ادا نہ کی ہو تو روزِ قیامت وہ جانور اپنی بڑی سے بڑی اور موٹی سے موٹی شکل میں آئیں گے، اُس شخص کو اپنے پیروں سے روندیں گے اور اپنے سینگ سے

ماریں گے۔ جب تمام جانور (ایک مرتبہ) یہ عمل ختم کریں گے تو پھر از سرِ نو یہ عمل جاری ہو جائے گا۔ (اور یہ سلسلہ برابر جاری رہے گا) حتٰی کہ لوگوں کے درمیان فیصلہ نہ ہو جائے۔"

(۹۲۲)۔ جابر بن عبداللہ رضؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا: "کوئی اونٹوں کا مالک جو ان کا حق ادا نہیں کرتا ہے۔ روزِ قیامت اس کے اونٹ ہمیشہ سے زیادہ تعداد میں آئیں گے۔ وہ شخص ایک ہموار میدان میں بٹھا دیا جائے گا۔ جہاں وہ (اونٹ) اُس کو اپنی ٹانگوں اور سُموں سے رَوندتے ہوتے تیزی سے گزریں گے۔ اسی طرح کوئی بیل گایوں والا جو اُن کا حق ادا نہیں کرتا، روزِ قیامت وہ ہمیشہ سے زیادہ تعداد میں آئیں گے، اُس شخص کو ایک ہموار میدان میں بٹھا دیا جائے گا جہاں وہ اسے اپنے سینگوں سے ماریں گے اور اپنے پیروں سے رَوندیں گے۔ اسی طرح کوئی بھیڑ بکریوں والا جو اُن کا حق ادا نہ کرتا ہو۔ روزِ قیامت ان کے مویشی ہمیشہ سے زیادہ تعداد میں آئیں گے۔ اُس شخص کو ہموار میدان میں بٹھا دیا جائیگا جہاں وہ بھیڑ بکریاں اُسے اپنے سینگوں سے ماریں گی اور اُسے اپنے کُھروں سے روندیں گی۔ اُن میں سے ایک بھی بے سینگ یا سینگ ٹوٹی نہ ہوگی۔ اسی طرح کوئی خزانہ والا جس نے اس خزانہ کا حق ادا نہ کیا ہو، روزِ قیامت اُس کا خزانہ ایسا سانپ بن کر آئے گا جس کے زہر کی شدّت کی وجہ سے اس (سانپ) کے سر کے بال اُڑ جاتے ہیں اور وہ منہ کھول کر اس (مالک) کا پیچھا کرے گا۔ جب وہ (سانپ) اُس کے پاس پہنچے گا وہ (مالک) اُس سے بھاگے گا۔ تب اُس کا رب اُسے آواز دے گا: "لو اپنا وہ خزانہ جسے تم چُھپا چُھپا کر رکھتے تھے۔" (جتنی بے گانگی تم اس وقت برت رہے ہو) میں اس سے بھی زیادہ اس سے بے نیاز ہوں۔" جب وہ شخص دیکھے گا کہ اس کے لئے اس سے مفر ہی نہیں تو وہ اپنا ہاتھ اس (سانپ) کے مُنہ میں ڈال دے گا اور وہ اسے (خشمناک) اونٹ کی طرح چبا ڈالے گا۔"

(۹۲۳)۔ ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کوئی ایسے خزانے کا مالک جو اس کی زکوٰۃ نہ ادا کرتا ہو، روزِ قیامت اسے لایا جائے گا۔

اور اس کا خزانہ اپنی بھرپور شکل میں اس کے پاس آئے گا۔ پھر اسے ڈھا کر اس کی چادریں بنائی جائیں گی۔ پھر انہیں جہنم کی آگ میں گرم کیا جائے گا۔ پھر ان سے اس کی پیشانی، پہلو اور پُشت کو داغا جائے گا۔ جب کوئی چادر ٹھنڈی ہو جائے گی۔ اُسے پھر گرم کیا جائے گا۔ اور یہ عمل جاری رہے گا تا آنکہ اللہ پچاس ہزار سال کے لمبے دن میں اپنی مخلوق کے درمیان فیصلے کر دے۔ بعد ازاں اس شخص کو اس کی راہ جنّت یا جہنم دکھائی جائے گی۔ اسی طرح اونٹوں کا وہ مالک جو ان کی زکوٰۃ نہ ادا کرتا ہو، اُسے حاضر کیا جائے گا۔ پھر اس کے اونٹ بھرپور تعداد میں لائے جائیں گے۔ پھر اس (مالک) کو ہموار زمین میں اوندھا لٹایا جائے گا۔ جہاں اس پر وہ اونٹ زور سے چلیں گے۔ اپنے سُموں سے اسے ٹھکرائیں اور کُچلیں گے اور اپنے موہنوں سے اُسے چبائیں گے جب ایک بار وہ یہ عمل کر چکیں گے تو پھر از سرِنو پلٹیں گے تا آنکہ اللہ تبارک وتعالیٰ پچاس ہزار برس کے لمبے دن میں فیصلہ نہ فرما دے۔ بعد ازاں اسے اس کی راہ جنّت یا جہنم کی دکھائی جائے گی۔ پھر آپؐ نے بھیڑ بکریوں اور گائے بیلوں کے بارے میں بھی ایسا ہی فرمایا۔"

مال میں زکوٰۃ کے علاوہ دیگر واجب حقوق

(۹۲۴)۔ طاؤسؒ نے بھی یہ یا اسی قسم کی روایت کی ہے۔ مگر اس میں یہ اضافہ ہے: "آپؐ سے دریافت کیا گیا:" ان کے حق کیا ہیں، تو آپؐ نے چار حق بتائے طاؤس کہتے ہیں کہ مجھے اُن کی ترتیب معلوم نہ رہی کہ حضورؐ نے ان چاروں میں سے کس کو پہلے کہا۔ بہر حال آپؐ نے فرمایا: "اُن کے رباکشتی باڑوں پر ہی انہیں دوہا جائے ان میں سے سواری کے جانور پہ (لوگوں کو سوار کیا اور سامان) لادا جائے اُن میں سے جو موٹا ہوا سے نحر (ذبح) کیا جائے اور ان میں سے دُودھ دینے والی اُونٹنی ضرورت مند کو عاریت دی جائے۔"

(۹۲۵)۔ خالد بن یزید کہتے ہیں کہ عطاء بن رباحؒ سے ایسا ہی سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ ابوہریرہؓ سے روایت ہے: "تیس (اونٹ) بہت ہی عمدہ دولت ہے۔

اس میں سے دودھ والی اونٹنی ضرورت مند کو عاریت دی جائے گی۔ ان میں کی موٹی اونٹنی نحر (ذبح) کی جائے گی اور ان میں اچھی نسل اور تیز رفتار اونٹنی پر (آدمی یا سامان) لادا جائے گا۔"

ابو عبیدؒ: ابوہریرہؓ اور طاؤسؒ اس روایت سے یہ معنے لیتے ہیں کہ مویشی کے مالک پر یہ چار حقوق زکوٰۃ کے علاوہ بھی واجب ہیں۔ اور یہ حضرت ابن عمرؓ کے اس قول سے مشابہ ہے:۔

(۹۲۶)۔ قزعہ کہتے ہیں کہ مجھ سے ابن عمرؓ نے کہا: "تیرے مال میں زکوٰۃ کے سوا اور بھی حقوق ہیں۔[۱]"

(۹۲۷)۔ ابن عمرؓ کہتے ہیں: "جس نے زکوٰۃ ادا کی، مہمان نوازی کی، مصیبت زدوں کو دیا تو وہ حرص کی وجہ سے نفس کی بے صبری اور بخل سے پاک ہوگیا۔"

(۹۲۸)۔ ابو حمزہؒ کہتے ہیں کہ میں نے شعبیؒ سے کہا: "اگر میں اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کر دوں تو کیا میرا وہ مال میرے لئے پاکیزہ اور طیب ہو جائے گا؟ انہوں نے جواباً یہ آیتِ کریمہ تلاوت فرمائی:۔

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ

سرچشمۂ خیر یہ نہیں کہ تم اپنے چہرے مشرق یا مغرب کی طرف پھیر لو، بلکہ حقیقی خیر اور بھلائی تو اس کی ہے جو اللہ پر اور روزِ آخرت پر نیز

---

[۱] دراصل فرض اور لازمی حق صرف "زکوٰۃ" ہے اور جیسا کہ ہم نے مقدمہ میں بتایا ہے "زکوٰۃ" کی اس تعریف کے بعد مسلمان پر کوئی مال فریضہ باقی نہیں رہتا۔ تاہم اپنے طور پر خیرات و صدقات دیتے رہنا اور نیک کاموں میں حصہ لینا اچھا عمل ہے جس کی تاکید کی گئی ہے اور اس کا شوق دلایا گیا ہے۔ یہاں اگر "زکوٰۃ" سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقرر کردہ صدقہ ہے تو پھر اس کے علاوہ وہ سب مزید مطالبات جو اسلامی حکومت کرے فرض ہوں گے اور وہ بھی "زکوٰۃ" ہی ہوں گے۔

واضح رہے کہ یہ حدیثِ رسولؐ نہیں ہے بلکہ صحابی کا قول ہے اور اس ماحول میں کہا گیا ہے جبکہ "زکوٰۃ" سے مراد "صدقہ مفروضہ رسول اللہؐ" ہوتا تھا۔ (مترجم)

وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ

(البقرہ ۲ : ۱۷۶)

فرشتوں پر، کتاب اور نبیوں پر ایمان لاتا ہے اور مال کو باوجود اس کی محبت کے رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں اور سائلوں نیز گردنوں کو آزاد کرانے میں خرچ کرتا نیز نماز قائم کرتا اور زکوٰۃ دیتا ہے اور جب عہد و پیمان کئے جائیں تو اپنے عہد و پیمان کو وفا کرنے والے (نیکوکار ہیں) بالخصوص تنگ حالی تکلیف و مصیبت اور جنگ میں صبر کرنے والے۔ یہ لوگ ہیں جو سچے ہیں اور یہی لوگ تقویٰ شعار ہیں۔[1]

(۹۲۹)۔ ایک دوسری سند سے یہی روایت شعبی ہی سے مروی ہے

ابوعبید: شعبی یہ بتانا چاہتے ہیں کہ انسان پر اس کے مال میں زکوٰۃ کے علاوہ یہ حقوق بھی ہیں۔

جبکہ بعض علماء کا خیال تھا کہ یہ آیت منسوخ ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

(۹۳۰)۔ ضحاک بن مزاحم کہتے ہیں کہ زکات فرض ہونے کے بعد قرآن مجید میں جس قدر صدقات کا ذکر ہے وہ سب منسوخ ہو گئے۔[2]

---

[1] یہاں قرآن مجید میں ایک ہی آیت میں زکوٰۃ کے علاوہ دیگر ضرورتمندوں کو مال دینے کی تاکید کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے زکوٰۃ کے علاوہ نجی طور پر تطوعاً دیگر حقوق بھی مالداروں پر عائد ہوتے ہیں۔ (مترجم)

[2] "زکوٰۃ" کی وسعتوں میں "صدقات سما جاتے ہیں جو مختلف ادوار اور مختلف مقادیر میں مسلمانوں کے اولوالامر کی طرف سے فرض کئے جاتے ہیں۔ ہٰذا زکوٰۃ سے صدقات کا نسخ نہیں ہوتا۔ پھر زکوٰۃ کا حکم قدیم ہے اور صدقات کا بعد میں۔ یوں بھی صدقات سے زکوٰۃ کا منسوخ ہونا درست ہوتا نہ کہ زکوٰۃ سے صدقات کا۔ حقیقت میں اس قسم کے تمام اقوال زکوٰۃ و صدقات کے بارے میں ابہام کے پیدا کردہ ہیں۔

(مترجم)

ابو عبیدؒ: لیکن یہ مسلک ابن عمرؓ و ابوہریرہؓ نیز دیگر اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہے جو قرآن مجید کے مفہوم و تاویل کو زیادہ جاننے والے اور اتباع کے زیادہ مستحق ہیں۔ اور یہی مسلک طاؤس اور شعبی کا بھی ہے یعنی یہ کہ مال میں زکوٰۃ کے علاوہ دیگر حقوق بھی ہیں۔ مثلاً والدین کے ساتھ سلوک اور ان کی خدمت، صلہ رحمی، مہمان نوازی نیز وہ حقوق جو مویشیوں کے مالکوں کے لئے بیان ہوئے ہیں۔

(۹۳۱) - ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ وہ آیت کریمہ:

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ۔ الآیۃ۔ (البقرہ ۲ : ۱۷۶)	اور باوجود مال کی محبت کے اسے رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور سائلوں اور گردنوں کے چھڑانے میں دیا۔

کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ مدینہ منورہ میں اس وقت اتری جب فرائض و واجبات کے احکام نازل ہوئے اور دیگر پابندیاں متعین کی گئیں۔ اور لوگوں کو عمل کا حکم دیا گیا۔

(۹۳۲) - ابن جریج کہتے ہیں کہ مومنوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا: "کیا کچھ خرچ کریں؟" تو یہ آیت نازل ہوئی:-

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلْ مَا اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ (البقرہ ۲ : ۲۱۵)	یہ لوگ آپؐ سے دریافت کرتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں؟ آپؐ کہہ دیجئے کہ جو کچھ تم خیر (خدا کی دی ہوئی دولت) سے خرچ کرو تو وہ والدین کے لئے ہو نیز اقربا و یتامیٰ و مساکین اور مسافروں کے لئے۔

ابن جریج کہتے ہیں کہ یہ رضاکارانہ عطیات سے متعلق ہے۔ زکوٰۃ کا اس سے تعلق نہیں (وہ) اس سے جداگانہ ہے۔

باب

اونٹوں پر صدقہ (زکوٰۃ) کا فریضہ اور اُس کے قوانین

صدقات سے متعلق عمرو بن حزم رضؓ کے نام رسول اللہ کا مکتوب گرامی

(۹۲۳) عمرو بن حزم محمد بن عبد الرحمٰن انصاری کے واسطہ سے روایت کرتے ہیں کہ خلافت ملنے کے بعد عمر بن عبد العزیز نے مدینہ منورہ میں ایک آدمی بھیجا جو وہاں صدقات (زکوٰۃ) سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گرامی نامہ اور حضرت عمر بن الخطاب رضؓ کا گرامی نامہ تلاش کر لائے۔ چنانچہ اُسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صدقات سے متعلق وہ مکتوب گرامی جو آپؐ نے عمرو بن حزم رضؓ کے نام بھیجا تھا، عمرو بن حزم رضؓ کے خاندان میں مل گیا اور صدقات سے متعلق حضرت عمر رضؓ کا مکتوب گرامی حضرت عمر رضؓ کے خاندان میں مل گیا، اُس مکتوب کی عبارت رسول اللہؐ کے گرامی نامہ کی عبارت سے مشابہ تھی۔ الغرض وہ دونوں گرامی نامے اُن کے لئے نقل کرائے گئے۔ عمرو بن حزم کہتے ہیں کہ انہوں نے محمد بن عبد الرحمٰن سے درخواست کی کہ وہ اِن دونوں گرامی ناموں کی نقلیں انہیں دے دیں۔ چنانچہ اُن کے لئے اس خط کا وہ حصہ جو اونٹوں، گائے، بیلوں، بھیڑ، بکریوں، چاندی، کھجور یا پھلوں، نیز غلوں اور منقے کشمش کے صدقہ (زکوٰۃ) سے متعلق تھا نقل کر دیا گیا اس میں تھا:

جب تک پانچ اونٹ نہ ہو جائیں ان پر کچھ واجب نہیں ہوگا۔ جب ان کی تعداد پانچ ہو جائے تو ان پر نو ہونے تک ایک بکری (زکوٰۃ) دی جائے گی۔ جب نو میں ایک کا اضافہ ہو کر دس (اونٹ) ہو جائیں تو ان پر چودہ [۱۴] ہونے تک دو بکریاں (زکوٰۃ) دی جائے گی۔ پھر جب ان میں ایک اونٹ بڑھ جائے اور وہ پندرہ ہو جائیں تو ان پر انیس [۱۹] ہونے تک

تین بکریاں (زکوٰۃ) دی جائیں گی۔ پھر جب ان میں ایک بڑھنے سے وہ بیسؔ ہو جائیں تو چوبیس تک ان پر چار بکریاں (زکوٰۃ) دی جائیں گی۔ اور جب وہ پچیس اونٹ بن جائیں تو ان پر پینتیس ہونے تک ایک بنتِ مخاضؔ دی جائے گی۔ لیکن اگر اونٹوں میں "بنت مخاض" نہ ہو تو پھر اس کے بجائے "ابنِ لبون" دیا جائے گا۔ پھر جب ان (پینتیس) میں ایک کا بھی اضافہ ہو جائے تو پینتالیس تک ان پر "بنتِ لبون" دی جائے گی۔ پھر جب پینتالیس میں ایک کا بھی اضافہ ہو جائے تو ان پر ساٹھ ہونے تک ایک "حِقّۃ" دی جائے گی۔ یہ اونٹنی نر کی جفتی کے لئے تیار (اور بار برداری کے لئے بھی مناسب) ہو گی۔ پھر جب ان کی تعداد ساٹھ سے ایک بھی بڑھ جائے تو ان پر پچھتر ہونے تک ایک جذعۃ دی جائے گی۔ پھر جب (پچھتر سے) ایک بھی بڑھ جائے تو ان پر نوّے ہونے تک دوٌ "بنتِ لبون" دی جائیں گی۔ پھر جب وہ اس تعداد سے ایک بھی اوپر ہو جائیں تو ان پر ایک سو بیس ہونے تک دو حِقّۃ، نر کی جفتی کے لائق (اور بار برداری کے لئے مناسب) دی جائیں گی۔ اور جب اونٹوں کی تعداد ایک سو بیس ہو جائے تو اس کے بعد پورے دس اونٹوں کے اضافہ سے پہلے زکوٰۃ میں کوئی نیا اضافہ نہیں کیا جائے گا۔ جب وہ ایک سو تیس ہو جائیں تو ان پر ایک سو چالیس ہونے تک دوٌ "بنتِ لبون" اور ایک حِقّۃ بطور زکوٰۃ لی جائیں گی جب وہ پورے ایک سو چالیس ہو جائیں تو ان پر ایک سو پچاس ہونے تک دوٌ حِقّۃ اور ایک بنتِ لبون وصول کی جائیں گی۔ جب وہ پورے ایک سو پچاس ہو جائیں تو ان پر ایک سو ساٹھ ہونے تک تین حقّہ وصول کی جائیں گی۔ جب وہ ایک سو ساٹھ ہو جائیں تو ان پر ایک سو ستّر ہونے تک چار "بنتِ لبون" لی جائیں گی۔ جب وہ ایک سو ستّر ہو جائیں تو ان پر ایک سو اسّی ہونے تک تین بنتِ لبون اور ایک حقّہ وصول کی جائیں گی۔ جب وہ ایک سو اسّی ہو جائیں تو ان پر ایک سو نوّے ہونے تک دوٌ "حقّہ" اور دوٌ "بنتِ لبون"

---

[1] متن میں ہم نے ہر جگہ اونٹوں کی عمروں کے مطابق بدلنے والے نام عربی ہی لکھے ہیں۔ ان کی شرح کتاب کے آخر میں ضمیمہ میں ملاحظہ فرمائیں (مترجم)

لی جائیں گی۔ جب وہ ایک سو نوے سے ہو جائیں تو دو سو ہونے تک ان پر تین حقہ اور ایک بنتِ لبون وصول کی جائیں گی۔ جب وہ دو سو ہو جائیں تو ان پر دو سو دس ہونے تک یا تو پانچ "بنتِ لبون" یا چار حِقہ" وصول کی جائیں گی۔ جب وہ دو سو دس ہو جائیں تو ان پر دو سو بیس ہونے تک چار بنتِ لبون اور ایک حِقہ لی جائیں گی۔ جب وہ دو سو بیس ہو جائیں تو ان پر دو سو تیس ہونے تک تین "بنتِ لبون" اور دو حِقہ لی جائیں گی۔ جب وہ دو سو تیس ہو جائیں تو ان پر دو سو چالیس ہونے تک تین "حِقہ" اور دو "بنتِ لبون" لی جائیں گی۔ جب وہ دو سو چالیس ہو جائیں تو ان پر دو سو پچاس ہونے تک یا تو چھ "بنتِ لبون" یا چار "حِقہ" اور ایک "بنتِ لبون" لی جائیں گی۔ جب دو سو پچاس ہو جائیں تو دو سو ساٹھ ہونے تک ان پر پانچ حِقہ یا پانچ "بنتِ لبون" اور ایک حِقہ لی جائیں گی۔ جب دو سو ساٹھ ہو جائیں تو دو سو ستر ہونے تک ان پر چار "بنتِ لبون اور دو حِقہ" لی جائیں گی۔ جب وہ دو سو ستر ہو جائیں تو دو سو اسّی ہونے تک ان پر تین "حِقہ" اور تین "بنتِ لبون" لی جائیں گی۔ جب وہ دو سو اسّی ہو جائیں تو دو سو نوے ہونے تک ان پر سات "بنتِ لبون" یا چار "حِقہ" اور دو "بنتِ لبون" لی جائیں گی۔ جب وہ دو سو نوے ہو جائیں تو تین سو ہونے تک ان پر یا تو چھ "بنتِ لبون" اور ایک "حِقہ" یا پھر پانچ "حِقہ" اور ایک "بنتِ لبون" لی جائیں گی۔ جب وہ تین سو ہو جائیں تو ان پر یا تو چھ "حِقہ" یا پانچ "بنتِ لبون" اور دو حِقہ لی جائیں گی۔ اور صدقہ وصول کرنے والے کو اختیار ہوگا کہ وہ ان دونوں عمروں کی اونٹنیوں میں جونسی چاہے وصول کرے۔ اور جب اونٹوں کی تعداد تین سو سے اوپر ہو جائے تو ہر پچاس پر ایک "حِقہ" اور ہر چالیس پر ایک "بنتِ لبون" لی جائے گی۔

ابو عبیدؒ: اونٹوں کے صدقہ کے بعد اس روایت میں بقیہ انواعِ صدقہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ جسے ہم ان کی جگہوں پر بیان کریں گے۔ ان شاء اللہ۔

(۹۳۴) ابن شہاب کہتے ہیں۔ یہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے "صدقات" کے متعلق گرامی نامہ کی نقل، اور یہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے خاندان

میں تھی، مجھے سالم بن عبداللہ بن عمرؓ نے اس کا مطالعہ کرایا، اور اس مکتوب کی تفصیل یہ ہے۔ "پانچ سے کم اونٹوں پر کچھ صدقہ نہیں لیا جائے گا۔ جب پانچ ہو جائیں گے تو ان پر ایک بکری (یا بھیڑ) لی جائے گی۔" بعد ازاں انہوں نے وہی تفصیلات بیان کیں جو عمرو بن حزم کی مذکورہ بالا حدیث میں ہیں، دونوں روایتوں میں ایک سو بیس کی تعداد سے اوپر ہونے کے سوا کوئی اختلاف نہیں ہے جسکی تفصیل ذیل میں ہے:

۱۔ ابن شہاب کی روایت میں ہے کہ جب ایک سو اکیس ہو جائیں تو ایک سو انتیس ہونے تک ان پر تین "بنت لبون" لی جائیں گی۔

لیکن عمرو بن حزم کی مذکورہ بالا روایت کے الفاظ یہ ہیں:۔ ایک سو بیس ہو جانے کے بعد پورے دس اونٹوں کے اضافہ سے پہلے (یعنی ایک سو تیس ہو چکنے تک) زکوٰۃ میں کوئی نیا اضافہ نہیں کیا جائے گا۔

بعد ازاں ہر دو روایت کا حساب یکساں ہے اور آگے چل کر صرف دو سو پر پھر دونوں میں اختلاف ہوتا ہے۔

ابن شہاب کی روایت میں دو سو کے بعد کوئی حساب مذکور نہیں۔ بلکہ دو سو کے بعد وہ کہتے ہیں۔ "دو سو سے اوپر جو اضافہ ہوا اس پر ہماری مذکورہ تفصیل کے مطابق صدقہ لیا جائے گا۔"

۹۳۵
۹۳۶
۹۳۷
اسی مضمون کی روایات ابن شہاب ہی سے بواسطہ سالم مختلف سندات سے ہم تک پہنچی ہیں۔

ابوعبید: میرا خیال ہے کہ سالم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ عباد بن العوام اس روایت کی سند میں "سالم اپنے باپ سے" کے الفاظ بیان کرتے ہیں۔

(۹۳۸) ابن جریج کہتے ہیں کہ مجھے حضرت عثمان بن عفان رضؓ نے ایک خط دیا جسے عبداللہ بن ابی بکر بن محمد بن حزم نے مکہ کے گورنر محمد بن ہشام کو لکھا تھا۔ اس کے بارے میں لوگوں کا خیال تھا کہ یہ وہی مکتوب گرامی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن حزم کو لکھا تھا اس کی عبارت یہ ہے:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"یہ ہے بھیڑ بکریوں اور اونٹوں سے متعلق وہ فریضہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمایا ہے۔ پھر انہوں نے اونٹوں کے بارے میں بھی مذکورہ بالا جیسی تفصیل بیان کی۔ البتہ انہوں نے اپنے حساب میں ایک سو بیس سے اوپر حساب نہیں بتایا، بلکہ اس کے بعد کہا۔ جب وہ (اونٹ) ایک سو بیس سے زیادہ ہو جائیں تو ہر پچاس پر ایک "حقہ" لے لی جائے۔"

(۹۳۹) عکرمہ بن خالد کہتے ہیں کہ ابو بکر بن عبد اللہ ابن عمر نے انہیں ایک مکتوب بھیجا۔ جسے ابو بکر بن عبد اللہ نے اس صحیفہ سے نقل کیا تھا۔ جو انہوں نے حضرت عمرؓ بن الخطاب کی نیام سے بندھا ہوا پایا تھا، پھر انہوں نے اونٹوں کے صدقہ کے بارے میں مذکورہ بالا جیسی تفصیل بیان کی، جس میں انہوں نے ایک سو بیس کے اوپر کوئی حساب نہیں بتایا بلکہ یہ کہا "ایک سو بیس کے اوپر جو اونٹ بڑھیں تو ان پر ہر چالیس میں ایک "بنتِ لبون" اور ہر پچاس میں ایک "حقہ" لی جائے گی۔"

(۹۴۰) لیث بن سعد کہتے ہیں۔ صدقہ سے متعلق مکتوب میں ہے۔ چوبیس یا اس سے کم اونٹوں پر صدقہ میں بھیڑ بکریاں لی جائیں گی اور حساب یہ ہوگا۔ کہ ہر پانچ اونٹوں پر ایک بھیڑ یا بکری لی جائے گی۔ پھر انہوں نے بھی مذکورہ بالا جیسی روایت بیان کی لیث کہتے ہیں کہ مجھے نافع نے بتایا کہ یہ حضرت عمر بن الخطابؓ کے اس مکتوب کی نقل ہے جو ان کی وصیت سے منسلک تھا۔ لیث یہ بھی کہتے ہیں کہ نافع نے مجھے بتایا کہ انہوں نے متعدد بار یہ مکتوب عبد اللہ بن عمرؓ کے روبرو پیش کیا تھا۔

(۹۴۱) مالک بن انس کہتے ہیں کہ میں نے صدقہ کے موضوع پر حضرت عمرؓ ابن الخطاب کا مکتوب پڑھا۔ اس میں درج تھا۔

یہ صدقہ پر مشتمل مکتوب ہے۔ چوبیس اونٹوں تک ہر پانچ پر ایک بھیڑ یا بکری لی جائے گی۔ پھر انہوں نے بھی مذکورہ بالا جیسی روایت بیان کی۔

(۹۴۲) اور ہمیں حسنؒ، ابراہیم اور شعبی سے یہ روایت پہنچی ہے کہ یہ تینوں حضرات بھی اونٹوں کے صدقہ کے بارے میں مذکورہ بالا جیسی تفصیل ہی بیان کرتے ہیں۔

ابو عبیدؒ: صدقہ کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد، حضرت عمرؓ کا مکتوب، اور بعد ازاں تابعین کے فتاوی، اونٹوں کے صدقہ کے بارے میں پانچ سے لے کر ایک سو بیس تک بالتواتر ایک بات کی تائید کر رہے ہیں۔ اس حد تک سوائے ایک روایت کے جو حضرت علیؓ سے مروی ہے اور جو ہمارے خیال میں ان سے محفوظ طریقہ سے منقول نہیں، اس باب کی دیگر جملہ روایات میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ (حضرت علیؓ والی روایت یہ ہے)

حضرت علیؓ کی شاذ روایت اور اس پر کلام

(۹۴۳) عاصم بن حمزہ حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا: ان کی یہ روایت ایک مقام کے سوا تمام مذکورہ بالا روایات کے مطابق ہے اور وہ اختلافی مقام یہ ہے کہ انہوں نے کہا: "پچیس اونٹوں پر پانچ بھیڑیں یا بکریاں لی جائیں گی"۔

ابو عبید: اور یہ ایسا قول ہے جس پر نہ اہل حجاز کا عمل ہے نہ اہل عراق کا، نہ ہی ہمیں ان کے سوا ایسے لوگوں کا علم ہے۔ جو اس کے قائل ہوں۔

بلکہ سفیان بن سعید سے منقول ہے کہ وہ اس روایت کو حضرت علیؓ کا کلام ماننے سے انکار کرتے اور کہتے تھے کہ حضرت علیؓ کی دینی فقاہت سے مستبعد ہے کہ وہ ایسی بات کہیں۔

اور کچھ لوگوں نے انہی (سفیان) سے یہ بھی روایت کی ہے کہ لوگوں نے اس بات کو حضرت علیؓ سے منسوب کرنے کو تسلیم نہیں کیا۔

ابو عبیدؒ: یہ ہیں اونٹوں کے فرائض سے متعلق پہنچنے والی روایات، ان میں ایک سو بیس کی حد تک تو سوائے ایک (مذکورہ بالا) اختلاف کے کوئی اختلاف نہیں ہاں جب اونٹوں کی تعداد ایک سو بیس سے زیادہ ہو جائے تو اس میں اختلافات ہیں

اونٹوں کی تعداد ایک سو بیس سے زائد ہونے پر اختلافات

(۹۴۴) عاصم بن حمزہ حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ جب اونٹوں کی تعداد ایک سو بیس ہو جائے تو پھر پہلے حساب کے مطابق ان پر از سرِ نو فریضہ جاری کیا جائے گا۔

(۹۴۵) سالم بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ اس مکتوبِ صدقہ میں جسے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں (دیکھئے نمبر ۹۳۴) مذکور ہے کہ جب اونٹوں کی تعداد ایک سو بیس سے ایک بھی زائد ہو جائے تو ان پر تین "بنت لبون" لی جائیں گی۔

(۹۴۶) محمد بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوبِ صدقہ اور حضرت عمرؓ کے مکتوب صدقہ میں یہ درج ہے کہ اونٹوں کی تعداد جب ایک سو بیس تک پہنچ جائے تو پھر اگلی دہائی کے پورا ہونے (ایک سو تیس) ہونے تک ان پر کوئی زکوٰۃ نہیں لی جائے گی۔ تاآنکہ وہ ایک سو تیس ہو جائیں۔

ابو عبیدؒ:- یہ ہیں تین مختلف اقوال، پہلا قول جو حضرت علیؓ سے ہم نے درج کیا ہے۔ اس کی رو سے فریضہ از سرِ نو جاری کیا جائے گا۔ یہ اہلِ عراق کا قول ہے۔ اور اسی کو سفیان بھی اختیار کئے ہوئے تھے۔ اس کے مطابق شرح صدقہ یہ ہوگی کہ ایک سو پچیس اونٹوں پر دو حِقّے اور ایک بھیڑ یا بکری، اور ایک سو تیس پر دو حِقّے اور دو بکریاں یا بھیڑیں اور ایک سو پینتیس پر دو حِقّے اور تین بکریاں یا بھیڑیں اور ایک سو چالیس پر دو حِقّے اور چار بکریاں یا بھیڑیں، اور ایک سو پنتالیس پر ــــ حضرت علیؓ کی تاویل کے لحاظ سے ــــ دو حِقّے اور پانچ بھیڑیں یا بکریاں، اور سفیان نیز اہل عراق کے قول کے بموجب دو حِقّے اور ایک بنتِ مخاض۔ پھر جب اونٹ پورے ایک سو پچاس ہو جائیں تو ان پر تین حِقّے لی جائیں گی۔ اس کے بعد اونٹوں کے بڑھنے پر دو سو تک از سرِ نو پہلا حساب دہرایا جائے گا۔ جب وہ دو سو ہو جائیں تو ان پر چار حِقّے لی جائیں گی اور جب اس تعداد سے زیادہ ہو جائیں تو ان پر بھی از سرِ نو ہمارا بیان کردہ پہلا حساب دہرایا جائے گا۔

یہ ہے حضرت علیؓ کے قول سے پیدا شدہ مسلک اور اہل عراق کا معمول۔

دوسری روایت ابن شہاب کی ہے۔ اس کی رو سے جب اونٹوں کی تعداد ایک سو بیس سے بڑھ جائے تو ان پر تین بنت لبون لی جائیں گی، ہمیں یہ تصریح سوائے اس روایت کے اور کہیں نہ ملی اور اس کی کوئی توجیہ بھی میری سمجھ میں نہیں آتی۔ بلکہ مجھے تو خطرہ ہے کہ یہ غیر محفوظ روایت ہے۔ اس لئے کہ اس میں نہ تو فرائض کا ابتدائی حساب ملحوظ رکھا گیا ہے اور نہ آخری۔ چنانچہ آپ جانتے ہیں کہ ابتدا میں جب اونٹوں کی تعداد پچیس ہو جاتی ہے تو پینتیس ہونے تک ان پر ایک "بنتِ مخاض" لی جاتی ہے اور جب پینتیس سے ایک بھی بڑھ جائے تو اونٹنی تو ایک ہی رہتی ہے لیکن عمر بڑھا دی جاتی ہے اور اب ان پر ایک "بنتِ لبون" لی جاتی ہے۔ پھر تمام فرائض کی عمریں اسی معیار پر رکھی جاتی ہیں۔ یہ ہے فرائض میں ابتدائی حساب کو ملحوظ رکھنے کا نتیجہ۔ اگر اسے ملحوظ رکھا جائے تو لازم آتا ہے کہ ایک سو اکیس ہونے پر ایک سو تیس تک "دو بنتِ لبون اور ایک حقہ" لی جائے۔ اس طرح ابتدائی حساب کی رعایت ہوتی۔ اور اگر آخری حساب کی رعایت رکھی جائے تو اس میں ہر چالیس پر ایک بنتِ لبون اور ہر پچاس پر ایک حقہ لیا جائے گا۔ اگر اسے معیار بنایا جاتا تو اس حساب سے ایک سو بیس پر تین بنتِ لبون لی جاتیں۔ اس لئے کہ ہر چالیس پر ایک "بنتِ لبون" لی جائے گی۔ اور اس صورت میں اونٹوں کی تعداد ایک سو بیس سے زائد ہے۔ اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس اضافہ کے باوجود انہوں نے زکوٰۃ میں لئے جانے والے جانوروں کی عمروں میں کسی اضافہ سے تبدیلی نہیں کی ہے۔ اس بنا پر یہ قول نہ تو ابتدائی حساب کی رعایت سے درست رہتا ہے نہ آخری حساب کی رعایت سے۔

اب رہا تیسرا قول، جو محمد بن عبد الرحمان کی روایت (نمبر ۹۴۶) میں ہے اس کی رو سے ایک سو بیس پر اضافہ سے صدقہ میں کسی مزید اضافہ کی ضرورت نہیں ہوگی، تاوقتیکہ وہ ایک سو تیس نہ ہو جائیں۔ پھر ان پر دو بنتِ لبون اور ایک حقہ لی جائے گی۔ یہ وہی قول ہے جس پر عمل کیا جاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک سو بیس سے ایک سو تیس ہونے تک کا اضافہ وہ درمیانی تعداد (شنق) ہے۔ جسے شمار نہیں کیا جائے گا۔ ایسے

دو فریضوں کے درمیان کی تعداد جو محسوب نہ ہو گایوں کے لئے وہ "وقص" کہلاتی ہے۔ پھر جب وہ اونٹ ایک سو تیس ہو جائیں تو ان پر اونٹ ہی لیے جائیں گے اور بالتدریج ان کی عمروں کا اضافہ ہوتا رہے گا۔ اور آگے تک کوئی بھی ایسی شکل نہ پیدا ہوگی۔ جس میں بھیڑ یا بکری پھر سے لی جائے۔

یہ امام مالک اور اہلِ حجاز کا قول ہے کہ جب (اونٹوں پر) ایک بار اونٹ لے لیا جائے تو بعد ازاں ان کے صدقہ میں بھیڑ بکری نہیں لی جائے گی۔

اور ابتدا میں اونٹوں پر اونٹ اسی وقت فرض ہو گا۔ جب ان کی تعداد پچیس ہوجائے۔ اس تعداد پر بکری بھیڑ کی بجائے ان پر ایک "بنتِ مخاض" لی جائے گی

یہی مفہوم ہماری مذکورہ بالا تمام روایات میں پایا جاتا ہے۔ صرف حضرت علیؓ کی روایت اس سے مستثنیٰ ہے۔ بشرطیکہ ان کی وہ روایت محفوظ طور پر ان سے مروی ہو۔

اسی ذیل میں یہ حدیث رسول اللہؐ بھی ہے۔ جو حضرت ابو بکرؓ سے مروی ہے۔

(۹۴۷) حضرت ابو بکرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اونٹوں میں ہر چالیس پر ایک "بنتِ لبون" اور ہر پچاس پر ایک "حِقّہ" لی جائے گی۔

اور ایسا ہی حضرت عمرؓ کا قول ہے۔

(۹۴۸) جسے بالکل اسی طرح ابن عمرؓ نے حضرت عمرؓ سے نقل کیا ہے۔

ابو عبید: ان روایات میں دونوں مفہوم یکجا ہیں، ایک تو یہ کہ ایک سو بیس کے بعد اونٹوں کے صدقہ میں بھیڑ بکریاں پلٹ کر نہیں لی جائے گی۔ چنانچہ آپ دیکھ لیجئے کہ اس تعداد کے بعد پلٹ کر ان کا ذکر نہیں کیا گیا۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ دو فرائض کے درمیان کی تعداد پر کچھ نہیں لیا جائے گا۔ اس لئے کہ آپ کا فرمان صاف ہے "ہر چالیس پر ایک بنتِ لبون اور ہر پچاس پر ایک حقہ"۔ چنانچہ آپؐ نے ان دونوں دہائیوں کے اضافہ پر سکوت فرمایا۔ حالانکہ محمد بن عبد الرحمٰن سے ہماری مذکورہ مروی روایت (نمبر ۹۲۳) میں تین سو تک کی تفصیلات ہیں۔ جس میں یہ درمیانی تعداد بھی شمار کی گئی ہے۔

معینہ عمر والے اُونٹ نہ ملنے کی صورت میں تبادل صورتیں

یہ ہیں اونٹوں کے فرائض سے متعلق روایات، ظاہر ہے مذکورہ عمروں کے جانور اسی وقت لئے جائیں گے۔ جبکہ زکوٰۃ دینے والے اونٹوں کے مالکان کے پاس ان عمروں کے جانور موجود ہوں، ایسی صورت میں جبکہ ان کے پاس مذکورہ عمروں کے جانور موجود نہ ہوں اور زکوٰۃ وصول کرنے والا، ان متعین عمروں کے جانوروں کے بجائے دیگر جانور لینے کی ضرورت محسوس کرے تو اس ضمن میں کچھ اور قواعد ہوں گے جو احادیث و آثار میں بیان ہوئے ہیں۔

(۹۴۹) محمد بن عبد الرحمٰن کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقہ نامہ اور مکتوب حضرت عمرؓ میں درج ہے: "ہر پچیس اونٹوں پر ایک بنتِ مخاض لی جائے گی اگر مذکورہ عمر والی اونٹنی نہ ہو تو اس کی جگہ ایک ابن لبون لیا جائے گا۔"

(۹۵۰) عاصم بن ضمرہ حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں: "جب اونٹوں کی تعداد پچیس سے اوپر ہو جائے تو ان پر ایک "بنتِ مخاض" لی جائے گی، اگر یہ نہ ملے تو پھر اس کی جگہ ابن لبون لیا جائے گا۔"

(۹۵۱) ابراہیم کہتے ہیں: "صدقہ میں بنتِ مخاض کے بجائے ابن لبون کے لینے کے علاوہ اور کوئی ایسی شکل نہیں۔ جس میں مادہ کی بجائے نر لیا جاتا ہے۔"

(۹۵۲) عاصم حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں: "جب بھی صدقہ وصول کرنے والا معینہ عمر سے بڑی عمر کا جانور (اونٹ) لے۔ تو اسے دو بکریاں یا دس درہم واپس کرنا ہوں گے۔"

(۹۵۳) ابراہیم کہتے ہیں۔ "جب صدقہ وصول کرنے والے کو بنتِ مخاض نہ ملے تو اسے ابنِ مخاض اور اوپر سے دس درہم یا دو بکریاں دے دی جائیں گی۔"

ابو عبیدؒ: اس مسئلہ میں سفیان، اوزاعی اور مالک ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہیں۔

سفیان نے تو حضرت علیؓ کی روایت کو اختیار کیا ہے اور اس کے سوا کسی

روایت کو نہیں لیا۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں: جب صدقہ وصول کرنے والے کو معینہ عمر کا جانور نہ ملے تو وہ اس سے اوپر کی عمر کا جانور لے لے اور دو بکریاں یا دس درہم واپس کر دے۔ یا پھر انہوں نے یہ کہا کہ وہ ایک دینار یا دس درہم واپس کر دے۔"

اس کے برخلاف اوزاعی کہتے ہیں۔

(۹۵۴) محمد بن شعیب بن شابور راوی ہیں کہ میں نے اوزاعی کو یہ کہتے سنا: "جب وہ (محصل صدقہ) معینہ عمر کا جانور نہ پائے تو اس کی قیمت وصول کرے گا۔

اور مالک نے ان دونوں سے الگ ہو کر ایک تیسری بات کہی ہے

(۹۵۵) عبداللہ بن بکیر راوی ہیں کہ مالک نے کہا: کوئی جانور معینہ عمر کے جانور کے سوا نہیں لیا جائے گا۔ صرف اس اصول سے "بنتِ مخاض" کے بجائے "ابنِ لبون" لے لینا مستثنیٰ ہے۔

ابوعبید: ہمارے خیال میں مالک کی یہ رائے اس لئے ہے کہ انہوں نے اس رخصت کو خصوصی طور پر صرف اسی شکل میں منحصر کر دیا۔

مالک کہتے ہیں: ان شکلوں میں جبکہ صدقہ میں بنتِ لبون یا حِقہ یا جذعہ واجب ہوتی ہوں تو اونٹوں کے مالک کو اس عمر کے جانور ہی فراہم کرنا ہوں گے۔ وہ کہتے ہیں: "میں یہ پسند نہیں کرتا کہ زکوٰۃ وصول کرنے والا ان کے بجائے ان کی قیمت وصول کرے۔" وہ کہتے ہیں: "یہی صورت گائے اور بکریوں میں بھی ہوگی۔"

ابوعبید: اور ان میں سے ہر ایک نے ایک بنیاد کی وجہ سے یہ مسلک اختیار کیا ہے۔

۱۔ سفیان نے تو ایک صحابی کے اثر کو لیا اور اسی پر اکتفا کی۔

۲۔ اور جہاں تک ہمارا خیال ہے اوزاعی کا استدلال اس پر ہے کہ عمریں مختلف ہوتی ہیں اور اسی بنا پہ دو فریقوں کے درمیان ایک دینار اور دس درہم سے زیادہ اور بعض حالات میں ان سے کم، کا فرق پڑ جاتا ہے۔ لہٰذا وہ کہتے ہیں کہ اسی قاعدہ کو میں تمام بقیہ احکام پر بھی منطبق کرتے ہوئے کہوں گا۔ کہ جس کے ذمہ بھی

کسی جانور یا کسی ساز وسامان کی ادائی لازم ہو جائے اور وہ چیز ختم ہو چکی ہو یا نہ مل سکے تو اسے اس کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔

۲۔ مالک کی دلیل یہ ہے کہ صدقہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے حقوق میں سے ایک حق ہے اور اس کی حیثیت لوگوں کے ان حقوق کی طرح نہیں جو ایک معینہ شکل میں ہونے کے بعد قرض کی صورت اختیار کر لیتے ہوں۔ بلکہ ان کی حیثیت نماز کی سی ہے کہ اگر اس کی ادائی کی سبیل ہو تو ایک کی جگہ دوسری نہیں لے سکتی۔ امام مالک کا یہ قول رہی صحیح مسلک ہوتا بشرطیکہ لوگوں کو اس کے بجالانے میں دشواری نہ ہوتی اور انہیں بڑی تلاش کی زحمت اور اپنے پاس غیر موجود شے کو مہیا کرنے کی تکلیف برداشت نہ کرنی پڑتی۔

مقررہ اشیاء کے عوض دیگر اشیاء یا قیمت لینے کا بیان

(۹۵۶) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت ثابت ہے کہ آپ نے حضرت معاذ رضؓ کو یمن جاتے وقت یہ حکم دیا تھا کہ لوگوں کے ساتھ آسانی اور نرمی برتنا۔ نیز یہ کہ ان (واجبات ادا کرنے والوں) کے پسندیدہ جانور (یا اموال) نہ لینا۔

(۹۵۷) پھر اس حدیث کی تفسیر حضرت معاذ رضؓ کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ انہوں نے وہاں پہنچ کر کہا: "میرے پاس یمنی چادر یا کپڑا لے آؤ، میں انہیں بھی تم سے صدقہ میں لے لوں گا۔ ان کی ادائی تمہارے لئے زیادہ آسان ہے۔ اور مدینہ کے مہاجرین کے لئے یہ زیادہ منفعت بخش ہوں گے۔" اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو جانوروں کی عمروں کے باہمی تفاوت کو سامان سے زیادہ مشابہت ومناسبت ہے۔ جبکہ خود حضرت معاذ رضؓ نے بھی سامان قبول کر لیا تھا۔

اور حضرات عمر رضؓ وعلی رضؓ سے بھی جزیہ کے ضمن میں یہ مروی ہے کہ دونوں ایک چیز کے بجائے دوسری چیز لے لیا کرتے تھے۔

(۹۵۸) اسلم اپنے باپ کے واسطہ سے حضرت عمر رضؓ سے روایت کرتے

ہیں کہ ان کے پاس شام سے جزیہ میں بہت سے مویشی آیا کرتے تھے۔

(۹۵۹) عنترہ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ جزیہ میں، سوئیاں بنانے والوں سے سوئیاں اور سُوئے بنانے والوں سے سُوئے اور رسیاں بنانے والوں سے رسیاں لے لیا کرتے تھے۔

ابو عبیدؒ: میرا خیال ہے کہ ان دونوں بزرگوں نے جزیہ میں سامان اور جانور لینے کی رخصت دے دی تھی۔ حالانکہ جزیہ ادا کرنے کی اصل شکل درہم و دینار اور غلّہ (خوردنی اشیاء) تھی۔

(۹۶۰) ان دونوں بزرگوں کی یہی رائے دِیتوں میں دیئے جانے والے سونے، چاندی، اونٹوں، گایوں، بھیڑ، بکریوں اور گھوڑوں میں بھی تھی۔ یہ دونوں بزرگ اس طریقہ سے لوگوں کے لئے سہولت پیدا کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ہر علاقہ والوں پر (مقررہ اشیاء کے عوض) ان اشیاء کی ادائی کا حکم دیا۔ جس کی فراہمی ان کے لئے ممکن ہو سکے۔

ابو عبید: ہمارے نزدیک صدقہ بھی اسی پر قیاس کیا جائے گا۔ اس بناء پر اگر ایک مقررہ عمر کا جانور جس کی ادائی صدقہ میں واجب ہو نہ ملے تو ان میں کا دوسرا اس کی جگہ لے لیا جائے گا۔ اس بارے میں ہمارا مدار حضرت علیؓ سے مروی روایت اور سفیانؒ کی اختیار کردہ رائے پر ہوگا۔ اس لئے اس طریقہ میں ایک طرف تو ان لوگوں کے ساتھ سہولت ہوتی ہے۔ جن سے زکوٰۃ لی جاتی ہے اور دوسری طرف ان لوگوں کا پورا پورا حق ادا ہو جاتا ہے۔ جن کے لئے صدقہ لیا جا رہا ہے۔

چھوٹی عمر کے اونٹوں پر صدقہ

یہ ہیں ان اونٹوں کے فرائض سے متعلق احادیث و روایات جن کی عمریں بڑی ہوں یا جن میں چھوٹے بڑے سب ملے جلے ہوں۔ لیکن جب صورت یہ ہو کہ تمام اونٹ چھوٹے ہوں اور ان میں بڑی عمر کا نہ ہو۔ تو اس بارے میں چار اقوال ہیں:۔

(۹۶۱) سفیانؒ کا قول ہے کہ ان (چھوٹی عمر کے اونٹوں) پر بھی انہی عمر وں

کے جانور لئے جائیں گے۔ جو بڑی عمروں کے جانوروں پر لئے جاتے ہیں۔ البتہ محصل صدقہ جانوروں کے مالک کو اُس زائد رقم کا فرق واپس کرے گا جو ان چھوٹی عمر والے اونٹوں کے تناسب سے لئے جانے والے اونٹ میں زیادہ ہو۔

(۹۶۲) مالکؒ کا قول ہے کہ ان (چھوٹی عمر والوں) پر بھی (بہی کچھ لیا جائے گا جو بڑی عمر کے جانوروں پر لیا جاتا ہے اور صدقہ وصول کرنے والا مالک کو وہ اضافہ (فرق) واپس نہیں کرے گا۔

(۹۶۳) ان دونوں کے علاوہ دیگر علماء نے یہ تیسری بات کہی ہے۔ "چھوٹے جانوروں پر ان کے مالکوں سے کوئی صدقہ نہیں لیا جائے گا۔"

(۹۶۴) چوتھا قول یہ ہے کہ ان پر انہی میں کا ایک (جانور) لیا جائے گا۔ اور یہ ابو حنیفہؒ کا قول ہے۔

ابو عبید: ان چاروں اقوال کے قائلین میں سے ہر ایک کے پاس ایک اصل ہے جس پر اس نے اعتماد کیا ہے۔

جہاں تک ہمارا خیال ہے سفیانؒ یہ چاہتے ہیں کہ صدقہ لینا تو ضروری ہے خواہ جانور چھوٹے ہوں یا بڑے، بایں ہمہ وہ کہتے ہیں کہ سنت سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ کہ بنتِ مخاض سے کم عمر کا اونٹ نہ لیا جائے۔ بنا بریں جانور کے مالک سے بنتِ مخاض یا حسبِ موقع اس سے بڑی عمروں والی اونٹنیاں ہی لی جائیں گی۔ جو مقرر کی گئی ہیں۔ پھر زکوٰۃ وصول کرنے والا بڑی اور چھوٹی عمروں کے تفاوت سے قیمت میں جو اضافہ ہو وہ واپس کر دے گا۔ تاکہ اس طرح فرائض وسنت کے مطابق صدقہ بھی وصول ہو جائے اور جانوروں کے مالک کو بھی وہ زائد فرق واپس مل جائے جو اس سے لیا گیا ہے۔

مالکؒ کا استدلال یہ ہے کہ اونٹوں میں کبھی بڑی عمر کے بھی ہوتے ہیں مثلاً ثنیہ (چھٹے برس میں لگنے والی اونٹنی) رباعیہ (ساتویں برس میں لگنے والی) سدیس (آٹھویں برس میں لگنے والا) اور بازل (نویں برس میں لگنے والا) اور اس سے اوپر عمر کے بھی، لیکن صدقہ میں ان اونچی عمروں کا جانور نہیں لیا جاتا بلکہ اس سے کم عمر والے

مثلاً دوسرے، تیسرے، چوتھے اور پانچویں سالوں میں لگنے والی اونٹنیاں ہی لی جاتی ہیں چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ جس طرح ایک طرف ان بڑی عمروں (کے جانور) کو چھوڑ دیا گیا ہے (یعنی ان پہ عمروں کی مناسبت سے زکواۃ میں کوئی اضافہ نہیں کیا جاتا) اسی طرح دوسری طرف چھوٹی عمر کے جانوروں کو شمار کیا جائے گا۔ خواہ ان میں ایک بھی بڑی عمر کا جانور نہ ہو۔

جو لوگ چھوٹے جانوروں پر کسی صدقہ کے قائل نہیں ہیں۔ وہ اس بنا پر یہ کہتے ہیں کہ ان کم عمر اونٹ کے بچوں کا اونٹوں میں شمار نہیں ہو گا۔ اس لئے کہ یہ پورے اونٹ نہیں۔ زکوٰۃ تو اونٹوں پہ لئے جانے کا حکم ہے اور ان بچوں کو عربی میں اونٹ (اِبِل) نہیں کہا جاتا بلکہ اونٹوں کے بچوں کے لئے رکھے ہوئے ناموں مثلاً رِبَاع وفُصْلَان وغیرہ سے پکارا جاتا ہے لہذا ان پر کچھ نہیں لیا جائے گا۔

اب رہے اس آخری رائے کے قائل کہ ان پر انہی میں سے ایک لیا جائے گا۔ سو ان کا استدلال یہ ہے کہ صدقہ میں چونکہ عمدہ اور پسندیدہ جانوروں کو چھوڑ کر چھوٹے معمولی اور عمومی حیثیت کے جانور لئے جاتے ہیں۔ لہذا یہ کیونکر روا ہو گا کہ جانوروں کے مالک سے ایسی بڑی عمر کے جانور لئے جائیں۔ جو اس کی ملکیت میں نہ ہوں؟ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ جب صدقہ وصول کرنے والا ان جانوروں میں سے ایک ایسا جانور لے جو ان میں سب سے عمدہ نہ ہو۔ تو اس نے جانوروں کے مالک سے اپنا فریضہ پورا پورا یا اس سے بھی کچھ زیادہ وصول کر لیا۔

ابو عبیدؒ: ان میں سے ہر ایک کے پاس دلائل ہیں۔ تاہم میری نظر میں صدقہ سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ کے مکاتیب اور آپ کی سنت کی رُوح سے زیادہ ملتا جلتا قول امام مالکؒ کا ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب صدقہ میں لئے جانے والے جانوروں کا تعین اور ان کی عمروں کا تعین فرمایا تو آپ کو معلوم تھا کہ جانوروں میں بڑی اور چھوٹی سب ہی عمروں کے ہوتے ہیں، بایں ہمہ ہمیں آپؐ سے یا آپؐ کے بعد

کسی امام سے ایسی روایت نہیں ملتی جس میں انہوں نے چھوٹی عمر کے جانوروں کو چھوڑ کر صرف بڑی عمر کے جانور (صدقہ کے سلسلہ میں) مخصوص کر دیئے ہوں بلکہ سنت میں سب کو مجموعی طور پر عمومی حیثیت دی گئی ہے۔ چنانچہ فرمان رسول ؐ ہے۔ "ہر پانچ اونٹ پر ایک بکری لی جائے گی اور ہر دس پر دو بکریاں"۔ پھر آخر تک اسی طرح یہ سلسلہ مذکور ہے۔ لہٰذا جب سنت میں عمومی حیثیت ہے تو کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ایک حصہ میں سے دوسرے کو مستثنیٰ قرار دے۔ بس صرف وہی مستثنیٰ ہو گا جسے سنت نے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ مثلاً:-

(۹۶۵) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ ؐ نے عاریت دیئے ہوئے کھجور کے درختوں کو مزابنہ (معین شے کے عوض غیر معین اور بے اندازہ شے کے تبادلہ) سے مستثنیٰ قرار دیا۔ اور ان میں مزابنت کی رخصت دے دی۔

(۹۶۶) اور جس طرح حج کے ضمن میں حائض کو دیگر اشخاص سے مستثنیٰ کرتے ہوئے حضور ؐ نے خصوصی طور پر اجازت دے دی کہ وہ وداعی طواف کئے بغیر چلی جائے

(۹۶۷) یا جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آٹھ جوڑوں[1] میں سے خصوصی طور پر سات آٹھ ماہ کی بھیڑ کی قربانی کرنے کی اجازت دے دی تھی۔

سنت میں اس قسم کی بہت سی نظیریں ملیں گی۔ ہم صرف اُسی کو مخصوص قرار دیں گے جسے سنت خاص کرے گی اور اسی کو عمومی حیثیت دیں گے۔ جسے سنت عام قرار دے گی۔

بلاشبہ "اِبِل" (اونٹ) کا لفظ عربی میں عمومیت رکھتا ہے اور اس میں چھوٹے بڑے ہر عمر کے اونٹ آجاتے ہیں۔ جس طرح سے لفظ "ناس" (لوگ) آدم کے تمام بیٹوں کو اپنے احاطہ میں لے لیتا ہے۔ خواہ وہ بچے ہوں یا بڑی عمر کے مرد۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی کتاب میں لفظ الانعام (چوپائے، مویشی جس میں اونٹ

---

[1] آٹھ جوڑوں سے مراد بکریوں میں سے دو نر و مادہ بھیڑوں میں سے دو نر و مادہ، اونٹوں میں سے دو نر و مادہ اور گایوں میں سے دو نر و مادہ ہے۔ (مترجم)

گائے بھیڑ بکری سب ہی شامل ہیں) استعمال کیا ہے، پھر ان مویشیوں کے چھوٹے اور بڑے سب کو اس لفظ میں شامل کر لیا اور ان سب کو "نَعَم" (مویشی) کہا چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمِنَ الْأَنْعَامِ حَمُولَةً وَفَرْشًا۔ (الانعام ۶ : ۱۴۲)

اور مویشیوں میں بار برداری والے اور بچھے ہوئے چھوٹے ہیں (جو بار برداری کے قابل نہیں)

(۹۶۸) ابو الاحوص عبد اللہ آیت کریمہ وَمِنَ الْأَنْعَامِ حَمُولَةً وَفَرْشًا کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ حَمُولَة سے مراد ہے وہ مویشی جو بار برداری اور سواری کے کام آسکیں۔ اور فَرْشًا سے مراد ہے چھوٹے مویشی۔

(۹۶۹) **ابو عبیدؒ:** بایں ہمہ ہم دیکھتے ہیں کہ علماء حجاز و عراق میں اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ چھوٹے اونٹ بڑے اونٹوں میں ملے ہونے پر زکوٰۃ کے لئے ان سب کو گنا جائے گا۔ یہی صورت گائے کے بچوں اور ان کی ماؤں میں اور بکری کے چھوٹے بچوں اور بڑی عمر والی بکریوں میں بھی ہے۔

(۹۷۰) اور اس کی تائید حضرت عمرؓ کی اس روایت سے ہوتی ہے جس میں انہوں نے سفیان بن عبد اللہ سے کہا تھا: "ان کا ہر جانور شمار کرو حتیٰ کہ وہ نومولود بھی جسے چرواہا اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر چلتا ہے۔"

ابو عبیدؒ: مقام تعجب ہے کہ بڑوں کے ساتھ ملے جلے ہونے پر تو ان سب کو گنا جائے اور جب وہ اکیلے ہوں تو ان سب کو بے گنے چھوڑ دیا جائے، حالانکہ دونوں صورتوں میں ان کی ایک ہی حیثیت باقی رہنا چاہئے۔ اگرچہ حضرت عمرؓ کی روایت میں یہ احتمال ہے کہ انہوں نے چھوٹی عمروں کے جانوروں کو شمار کرنے کے لئے کہا خواہ ان کے ساتھ بڑی عمر کا ایک بھی جانور نہ ہو، چنانچہ دیکھ لیجئے ان کی روایت میں بڑی عمر کے جانوروں کی موجودگی مشروط نہیں ہے۔ لہذا ہمارا فیصلہ اسی بناء پر یہ ہے کہ جس طرح صدقہ بڑی عمر کے جانوروں پر واجب ہے چھوٹی عمر کے بچوں

پر بھی واجب ہے اور ہماری شرح کے مطابق ان کے درمیان کسی قسم کی تفریق نہیں ہوگی۔ یہ مالکؒ کا قول ہے اور یہی صورت گایوں اور بکریوں میں بھی ہوگی۔

(۹۷۱) اگر اس عمر کا جانور جو جانوروں کے مالک کو ادا کرنا ضروری ہو نہ مل سکے[1] تو بقول مالکؒ: "اسے بہر حال اس عمر کا جانور لانا پڑے گا"۔ لیکن مجھے ان کا یہ قول پسند نہیں، اور اس کی وجہ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں یہ ہے کہ ایسا کرنے میں لوگوں کو پریشانی اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ثانیاً یہ قول حضرت علیؓ کی اس روایت کے بھی خلاف جسے ہم بیان کر آئے ہیں۔

اور ان تمام اقوال سے بلند تر وہ مرفوع حدیث ہے جسے حضرت ابو بکرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں :۔

(۹۷۲) انس بن مالک حضرت ابو بکرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹوں کے فرائض میں فرمایا :۔ جس کے اونٹ اتنی تعداد میں ہو جائیں کہ ان پر اسے ایک جَذَعَة (پانچویں برس کی اونٹنی) صدقہ میں دینا ہو اور اس کے پاس جَذَعَة نہ ہو بلکہ حِقَّة (چوتھے برس کی اونٹنی) ہو تو یہی اس سے قبول کر لی جائے۔ لیکن اس کے ساتھ وہ دو بکریاں دے گا۔ بشرطیکہ وہ آسانی سے اسے مل سکیں۔ ورنہ پھر بیس درہم دے گا۔ اور جس کے اونٹوں پر بطور صدقہ ایک حِقّہ واجب ہو لیکن اس کے پاس جَذَعَة (پانچویں برس کی اونٹنی) ہو تو وہی اس سے قبول کر لی جائے گی اور محصّل صدقہ اسے بیس درہم یا دو بکریاں پلٹا دے گا۔ اور جسے صدقہ میں ایک حِقّہ (چوتھے برس کی اونٹنی) دینا ہو اور وہ اس کے پاس نہ ہو بلکہ بنتِ لبون (تیسرے برس کی اونٹنی) ہو تو اس سے یہی قبول کر لی جائے گی۔ لیکن اس کے ساتھ وہ مزید دو بکریاں دے گا۔ بشرطیکہ وہ آسانی سے اسے مل سکیں یا پھر بیس درہم۔

---

[1] یہاں اصل کتاب میں "تعدّدت" ہے جس کے معنی ہیں متعدد ہونا۔ لیکن ہم نے اسے "تعذّرت" پڑھا ہے اور اسی لحاظ سے معنی کئے ہیں۔ تعدّدت کے لحاظ سے اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اگر جانوروں کے مالک کو مختلف عمروں کے متعدد جانور دینے ہوں اور وہ نہ مل سکیں۔ (مترجم)

اور جسے صدقہ میں بنت لبون (تیسرے برس کی اونٹنی) دینا ہو۔ اور اس کے پاس حقہ (چوتھے برس کی اونٹنی) ہی ہو تو وہی اس سے قبول کر لی جائے گی اور محصل صدقہ اسے بیس درہم یا دو بکریاں واپس دے گا۔ اور جسے صدقہ میں بنت لبون (تیسرے برس کی اونٹنی) دینا ہو۔ لیکن اس کے پاس وہ نہ ہو بلکہ بنت مخاض (دوسرے برس کی اونٹنی) ہو تو اس سے وہی قبول کر لی جائے گی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ دو بکریاں مزید دے گا بشرطیکہ وہ بکریاں آسانی سے اسے مل جائیں۔ ورنہ بیس درہم۔ اور جسے صدقہ میں بنت مخاض (دوسرے برس کی اونٹنی) دینا ہو۔ اور وہ اس کے پاس نہ ہو۔ بلکہ اس کے پاس ابن لبون (تیسرے برس کا نر اونٹ) ہو تو اس سے وہی قبول کر لیا جائے گا اور اس کے ساتھ اس پر کچھ واجب نہ ہو گا۔"[1]

ابو عبید: ہمارے نزدیک اس حدیث پر عمل پیرا ہونا زیادہ پسندیدہ ہے۔

یہ تو ہوئے اونٹوں کے صدقہ کے احکام ایسی صورت میں جبکہ محصل صدقہ کی آمد کے وقت اونٹوں کی تعداد پوری پانچ یا اس سے اوپر ہو۔

سال بھر تک بقدر نصاب اونٹ رہیں لیکن محصل کی آمد پر کم ہو جانے کا حکم

(۹۷۳) اب رہی ایسی صورت کہ اونٹ والے کے پاس سال بھر تو پانچ اونٹ رہے ہوں۔ لیکن ان میں سے ایک مر جائے اور جب محصل پہنچے تو اس کو چار ہی ملیں، ایسی حالت میں سفیان رح اور اہل عراق کا قول ہے: ایسے اونٹوں کے مالک سے بکری کا ⅘ لیا جائے گا ان کے مذہب کے مطابق پورا سال گذر چکنے کی وجہ سے ان اونٹوں پر ایک بکری واجب

---

[1] ابن حزم نے اس روایت کو نہایت درجہ صحیح بتایا ہے۔ حضرت ابو بکر رضؓ نے علماء کی موجودگی میں اس پر عمل کیا اور ان میں سے کسی نے ان کی مخالفت نہ کی۔ ابن حجر نے (تلخیص: ۱۷۳) میں لکھا ہے کہ بخاری نے اپنی "صحیح" میں اسے مختلف مقامات پر ایک ہی سند سے بیان کیا ہے۔ ان کی روایت کے بموجب حضرت ابو بکرؓ نے حضرت انس رضؓ کو بحرین روانہ فرماتے وقت ایک مکتوب میں انہیں صدقہ کی یہ شرح لکھ دی تھی۔ ابوداؤد، حاکم، نسائی نے یہ حدیث بیان کی ہے، ابن حبان نے اسے صحیح بتایا ہے۔ (از حاشیہ کتاب الاموال)

ہو چکی تھی۔ اور اب جبکہ اونٹوں کا کچھ حصہ تلف ہوگیا تو اس ضائع شدہ کے حساب سے اس کا صدقہ بھی کم کر دیا جائے گا۔ اور بقیہ کا حساب رکھا جائے گا۔

(۹۷۴) لیکن اس بارے میں مالک رح کہتے ہیں : "ایسی حالت میں اونٹوں کے مالک سے کچھ نہیں لیا جائے گا۔"

(۹۷۵) **ابو عبید :** ان کے اس قول کی روایت ہم سے یحییٰ بن عبداللہ ابن بکیر نے کی۔ وہ کہتے ہیں کہ مالک رح نے کہا : جانوروں کے مالک پر صدقہ اس وقت واجب ہوتا ہے جب وہ اپنے مال کا صدقہ نکالتا ہے۔ چنانچہ اگر اس وقت سے پہلے مویشی مر جائیں تو اس سے ہلاک ہونے والوں پر کچھ نہیں لیا جائے گا اس مالک سے صرف انہی پر صدقہ لیا جائے گا جو محصل صدقہ اس کی ملکیت میں پائے گا۔ اسی طرح اگر مویشی بڑھ جائیں گے تو وہ اس تمام مجموعہ پر اس سے صدقہ لے گا جو سال گذرنے کے بعد اس کے پاس ہوگا۔

ابو عبید رح : مالک رح کا یہ قول میری نظر میں صدقہ کے مسنون طریقہ سے زیادہ مشابہ ہے اس لئے کہ سنت کی تفصیلات میں اطلاق ہے کہ اتنے اور اتنے اونٹوں پر اتنی اور اتنی زکوٰۃ ہوگی۔ اور اس اطلاق کے معنے یہی ہیں کہ اتنی تعداد مالکوں کے پاس موجود ہو اور کہیں بھی مکاتیب صدقہ میں یہ نہیں ملتا کہ مویشیوں کے مالکوں سے اس تعداد پر صدقہ لیا جائے جو پہلے ان کی ملکیت میں رہے ہوں۔ خواہ وہ بعد میں مر جائیں، ان سے تلف شدہ جانوروں کے بارے میں کچھ پوچھ گچھ نہیں ہوگی۔

(۹۷۶) اہل عراق نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ جب مال پر سال گذر جائے تو صدقہ بمنزلہ قرض ہو جاتا ہے۔ اگر یہی بات ہوتی کہ صدقہ بمنزلہ قرض ہوتا تو انہیں چاہیئے تھا کہ مویشیوں کے مالک سے ان پانچوں کی زکوٰۃ لیتے جن میں سے ایک مر گیا ہے۔ اور اس طرح انہیں پوری بکری لینا چاہیئے تھی۔ اور یہی صورت اس وقت بھی برقرار رہتی جبکہ تمام کے تمام اونٹ مر جائیں۔ اس لئے کہ ان سب کے مر جانے سے وہ ایک مرتبہ لازم ہو چکا ہے ختم نہیں ہو سکتا۔

ہمارے خیال میں اس مسئلہ کا حل مالکؒ کے قول کے مطابق ہی ہو سکتا ہے اس لئے کہ وہ روایات و سنت کے مفہوم سے ہم آہنگ ہے۔

دو سال کے بعد محصل صدقہ کے آنے پر ادائی صدقہ کی کیفیت

(۹۷۷) اب اگر صورت یہ ہو کہ ان پانچ (اونٹوں) میں سے کوئی ضائع تو نہ ہوا ہو لیکن ان پر دو سال گذر چکے ہوں اور وہ پورے پانچ ہی ہوں۔ بعد ازاں صدقہ وصول کرنے والا آئے۔ ایسی صورت میں سفیانؒ سے ان کا یہ قول مروی ہے کہ اس مالک کو ان اونٹوں پر پہلے سال کی زکوٰۃ ایک بکری دینا ہوگی اور دوسرے سال پر اسے کچھ دینا نہیں ہوگا۔

(۹۷۸) مالکؒ کا قول ہے کہ اسے دو بکریاں دینا ہوں گی، ہر سال کی ایک بکری۔

ابو عبیدؒ: ان میں سے ہر ایک کو اپنے اختیار کردہ مسلک کی وجہ سے یہ بات کہنا پڑی۔ اس لئے کہ سفیانؒ کے نقطۂ نظر سے پانچ اونٹوں کے اس مالک پر سال گزشتہ ایک بکری واجب ہوئی تھی اور اسی حالت میں اس پر دوسرا سال گذرا جس میں ایک بکری کے مقروض ہونے کی وجہ سے وہ پورے پانچ اونٹوں کا مالک نہ رہا۔ گویا دوسرے سال اس کے پاس پانچ اونٹ اس طرح رہے کہ ان میں سے ایک بکری کی قیمت کم رہی اور اسی کمی نے اس سے دوسرے سال کا صدقہ ختم کرا دیا۔

(۹۷۹) لیکن مالکؒ اس قرضہ سے کوئی تعرض نہیں کرتے جو اس پر رہا۔ وہ کہتے ہیں: "میں تو وہ کچھ دیکھوں گا جو مویشیوں پر سالوں کے گزرنے کے بعد محصل صدقہ ان مالکوں کے پاس موجود پاتا ہے۔"

ابو عبیدؒ: اور اسی کی میں بھی تائید کرتا ہوں اس لئے کہ یہی مضمون اس حدیث سے نکلتا ہے جس میں ہے: "سال یا اس سے زائد عرصہ گزرنے پر صدقہ مویشیوں کی موجودہ تعداد پر لیا جائے گا۔ اور ان کے علاوہ جو کمی بیشی ہو گی۔ اس پر مالکان سے

حساب نہیں لیا جائے گا، نیز یہ کہ صدقہ کوئی ایسا (لازمی) قرض نہیں بنے گا جس کی بناء پر مالک مویشی کا پیچھا لیا جائے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایسا کچھ اسی صورت میں ہوگا۔ جبکہ جانوروں کی تباہی کسی ایسے حادثے کی وجہ سے ہو جس میں مالک مویشی کا تصرف بیع، ہبہ یا ذبح وغیرہ کے ذریعے نہ ہو۔ لیکن ایسی صورت میں جبکہ وہ خود ان جانوروں کی ہلاکت کا مرتکب ہو تو تمام اقوال کے مطابق اس (اتلاف) کی ذمہ داری اُسی پر لازم ہوجائیگی

ہمارے اس قول کی تائید، کہ محصلِ صدقہ صرف انہی جانوروں کو مدِ نظر رکھے گا جنہیں وہ اپنی آمد کے وقت زندہ و موجود پائے گا، حضرت عمرؓ کی اس روایت سے ہوتی ہے :-

(۹۸۰) ابن ابی ذُباب حضرت عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے عام رمادہ[1] میں صدقہ کی وصولی موخر کردی۔ پھر جب بارش ہوئی (اور فصل پیدا ہوئی) تو انہوں نے مجھے صدقہ کی وصول کے لئے بھیجا اور فرمایا: لوگوں سے دو سال کا صدقہ لو پھر ایک سال کا صدقہ انہی میں تقسیم کردو اور دوسرے سال کا صدقہ میرے پاس لے آؤ۔"

ابو عبیدؒ: ملاحظہ فرمایئے حضرت عمرؓ نے ان سے دو سال کی زکوٰۃ لی حالانکہ انہیں معلوم تھا کہ اس اثناء میں یا اس سے کم مدت میں بھی ایسے واقعات رونما ہو سکتے ہیں جن میں مویشیوں کی کمی بیشی واقع ہو سکتی ہے۔ بایں ہمہ ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے ان سے کسی ضائع شدہ چیز کا حساب کرنے کی شرط نہیں رکھی۔

اور میرا خیال ہے کہ مندرجہ ذیل مرفوع حدیث کا اسی طرف اشارہ ہے:۔

(۹۸۱) حسن بن حسن اپنی والدہ فاطمہ بنتِ حسین سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے فرمایا: زکات میں (ثنی) نہیں ہوگی۔"

ابو عبید: عربی زبان میں "ثنی" تکرار کے لئے جو لفظ استعمال ہوا ہے اس کے معنے ہیں، کسی چیز کو پلٹانا، دہرانا، اس کی تکرار کرنا اور اسے بے جگہ رکھنا، مطلب

---

[1] قحط کا سال جو ۱۸ھ میں ہوا تھا اور جس میں انسان اور مویشی بکثرت مر گئے تھے۔

یہ ہے کہ اگر کچھ لوگوں سے کسی آفت کی بنا پر جس میں ان کے مویشی اور اموال تلف ہو جائیں صدقہ کی وصولی موخر کر دی جائے تو آئندہ سال ان سے گذشتہ سال کا صدقہ نہیں لیا جائے گا۔ لیکن ان سے اس تعداد پر صدقہ لیا جائے گا۔ جو زکوٰۃ کے سال میں ان کے پاس رہی اور ان میں سے جو (مویشی) نقصان سے بچے رہیں گے ان پر زکوٰۃ لی جائے گی خواہ ان پر کئی سال گذر چکے ہوں۔ اور اندریں صورت یہ عمل "دوبارہ" یا تکرار (ثنی) نہیں کہلائے گا اس لئے کہ یہ تو ملکیت میں موجودہ مویشیوں پر لیا جانا حق ہے اسی طرح گذشتہ زمانہ کی زکواۃ بھی ان سے لی جائے گی۔ "تکرار یا دوبارہ" (ثنی) کا ایک اور مفہوم بھی ہے اور وہ یہ کہ ایک سال میں دو بار زکوٰۃ نہیں لی جائے گی۔ اور یہ عمل بھی کسی چیز کو بے جگہ رکھنے کے مترادف ہے۔

ابو عبید: پہلا مفہوم مجھے زیادہ پسند ہے، اس لئے کہ ابن شہاب سے اس کی تفسیر میں ایسی ہی روایت ہے:

(۹۸۲) یونس کہتے ہیں کہ ابن شہاب نے "ثنی" کی شرح کرتے ہوئے کہا: "صدقہ دوبار نہیں لیا جائے گا۔ تاہم وہ سرسبز و شادابی اور قحط، موٹاپے اور لاغری ہر دو حالت میں لیا جائے گا۔ انہوں نے مزید کہا: سب سے پہلے جس نے عملاً ایسا کیا وہ معاویہ رضہ ہیں۔ لہذا جب ایسی شکل ہو تو ان کے باقی ماندہ مویشیوں پر ہی صدقہ لیا جائیگا۔"

ابو عبید: ایسی شکل میں جبکہ اونٹ (باربرداری سواری اور زراعت میں) کام میں لائے جاتے ہوں اور افزائش نسل کے لئے چرنے والے گلوں میں نہ رہیں تو اس بارے میں دو اقوال ہیں:۔

سواری، باربرداری اور کھیتی وغیرہ کے کام میں لائے جانے والے اونٹوں پر زکوٰۃ

(۹۸۳) طلحہ بن ابی سعید راوی ہیں کہ جب عمر بن عبدالعزیز خلیفہ تھے تو انہوں نے لکھا تھا: "ان اونٹوں پر بھی جو شہری علاقوں میں کام پر لگے ہوتے ہیں زکوٰۃ لی جائے گی"۔ میں نے خود پہنچ کر عمر بن عبدالعزیز کے اس مکتوب کا معائنہ کیا۔"

(۹۸۴) لیث بن سعد کہتے ہیں: "میں نے وہ اونٹ دیکھے ہیں جو حج کے

لئے کرایہ پر لئے جاتے ہیں، مدینہ منوّرہ میں ان پر زکوٰۃ لی جاتی ہے وہاں اس موقع پر ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن اور یحییٰ بن سعید وغیرہ جیسے علماء و فضلا موجود ہوتے ہیں۔ ان میں سے کوئی اس عمل کو قابلِ اعتراض نہیں سمجھتا۔ بلکہ وہ سب اسے سنّت تصوّر کرتے ہیں بشرطیکہ اونٹ جُدا جُدا نہ ہوں اور سب یکجا ہوں۔

(۹۸۵) مذکورہ بالا روایت کے ایک راوی عبداللہ بن صالح کہتے ہیں کہ یہی لیث اور مالک بن انس کی بھی رائے ہے۔

ابو عبید: یعنی ان دونوں حضرات کا مسلک یہ ہے کہ اونٹوں کی زکوٰۃ کے بارے میں جس قدر احادیث آئی ہیں وہ سب مجمل ہیں اور ان میں کچھ اونٹوں کو دیگر اونٹوں سے مستثنیٰ نہیں قرار دیا گیا لہٰذا تمام اونٹ زکوٰۃ میں شامل ہوں گے اور ہمارا خیال ہے کہ یہی عمرؓ، ربیعہؒ، اور یحییٰ کا مسلک بھی ہے۔

افزائشِ نسل کے لئے پالے جانے والے اور سخت محنت کرنیوالے اونٹوں میں تفریق

اور اگر ہمیں سنّت کے ذریعہ افزائش نسل کے لئے ریوڑوں میں چرنے والے مویشیوں کی خصوصیت نہ ملتی تو یہی مسلک صحیح ہوتا۔ اس لئے کہ ہم اسی خصوصیت کو روا رکھتے ہیں جسے سنّت نے خاص کیا اور جسے سنّت نے عمومیت بخشی، اس کے سوا ہم کسی کو عمومیت کا مقام نہیں دیتے۔

(۹۸۶) معاویہ بن حیدہ قشیری سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: "تمام (افزائش نسل کے لئے ریوڑوں میں) چرنے والے اونٹوں میں، ہر چالیس اونٹ پر (زکوٰۃ میں) ایک بنتِ لبون (تیسرے برس میں لگنے والی اونٹنی واجب) ہے۔ اس حساب سے بچنے کے لئے اونٹوں کو جدا جدا نہیں کیا جائے گا۔ جو اللہ سے اجر حاصل کرنے کے لئے اسے ادا کر دے گا۔ تو اسے اس کا بدلہ ملے گا۔ اور جو اسے نہ دے گا، تو ہم اس سے وہ لے لیں گے اور اس کے آدھے اونٹ بھی لے لیں گے۔ یہ ہمارے ربّ کے فرائض میں سے ایک فریضہ ہے۔ محمدؐ کے لئے اس میں سے

کچھ بھی حلال نہیں ہوگا۔" [1]

(۹۸۷) اسی کی تائید حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بواسطہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ہوتی ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "(افزائش نسل کے لئے چرنے والی بھیڑ بکریوں کے ریوڑ پر چالیس عدد ہونے سے پہلے کوئی زکوٰۃ نہیں لی جائے گی۔"

ابوعبیدؒ: اب اس صورت میں جب کہ ہمارے پاس یہ دو احادیث اونٹوں اور بھیڑ بکریوں کے بارے میں بصراحت یہ تفصیل بتا رہی ہیں کہ زکوٰۃ (افزائش نسل کے لئے ریوڑوں میں) چرنے والے جانوروں پر عائد ہوگی۔ تو ہم ان دونوں کا اتباع کریں گے اور ان کے سوا دیگر روایات (و اقوال) کو چھوڑ دیں گے۔ اور پھر یہی حسنؒ کا فتویٰ بھی ہے۔

(۹۸۸) ہشام کہتے ہیں کہ حسنؒ نے کہا: "کھیتی باڑی یا سواری میں) کام کرنے والے اونٹوں یا بیلوں پر صدقہ نہیں ہے۔"

(۹۸۹) **ابوعبید**: یہی سفیانؒ اور تمام اہل عراق کا قول ہے اور مجھے مسئلہ میں ان کے درمیان کسی اختلاف کا علم نہیں ہے۔

نقد رقم اور مویشیوں کی زکوٰۃ میں فرق

(۹۹۰) **ابوعبیدؒ**: لیکن جب کسی شخص کے پاس ایک سال تک دو سو درہم رہیں پھر ان میں سے کچھ ضائع ہوجائیں تو اسے چاہئے کہ وہ بقیہ رقم سے اس کے حساب کے مطابق زکوٰۃ ادا کرے۔ اس مسئلہ کو ان پانچ اونٹوں کے مسئلہ سے کوئی مشابہت نہیں جن میں سے ایک سال گذر چکنے کے بعد مرجائے۔ اور یہ ہر دو مسئلہ باہم گر اس لئے مختلف ہیں کہ بے جان مال کی زکوٰۃ تو اس کا مالک اپنے مقررہ جا لے پہچانے میں ادا کرتا ہے۔ لیکن مویشیوں کے مالک کی یہ کیفیت نہیں ہوتی اس

---

[1] یہ روایت احمدؒ، ابوداؤد، نسائیؒ اور حاکم نے بیان کی ہے۔ ابن معین نے اسے صحیح بتایا ہے لیکن امام شافعی کہتے ہیں کہ علماء حدیث اسے صحیح نہیں سمجھتے۔ (از حاشیہ)

لئے کہ اس کا فیصلہ حاکم کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور وہی ہر سال اپنا ایک آدمی ان کی زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے بھیجتا ہے اور اس وجہ سے ان کے اوقات مختلف ہو جاتے ہیں۔ ایسے شخص کے پاس جب بھی سال گزرنے کے بعد زکواۃ وصول کرنے والا پہنچے۔ اسی وقت اس کے اوپر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ اسی بنا پر کسی کہنے والے نے کہا ہے: "مویشیوں کی زکوٰۃ اس وقت واجب ہوتی ہے، جب محصّلین صدقہ پہنچ جائیں" اور یہی وجہ ہے کہ لوگوں نے مویشیوں کی زکوٰۃ اور درہم و دینار (نقد رقوم) کی زکوٰۃ میں تفریق کی ہے۔

(۱۹۹) شریک بن عبد اللہ اور ان کے ساتھ ایک جماعت ان دونوں اقوال سے اختلاف کرتے ہوئے یہ فتویٰ دیتے ہیں: "اگر محصّل صدقہ کی آمد پر پانچ اونٹوں کے مالک کا ایک اونٹ تلف ہو چکا ہو تو بھی اسے پوری ایک بکری زکوٰۃ دینا پڑے گی۔ ان لوگوں نے ایک بکری کو لازمی قرضہ کی حیثیت دی ہے۔

ابو عبیدؒ: اس رائے کے رکھنے والے پر یہ لازم آتا ہے کہ وہ کہے: اگر سب مویشی ختم ہو جائیں تو بھی اس مالک پر اسی طرح پوری بکری کی ادائی لازم رہے گی اور اگر اس پر زکوٰۃ کے علاوہ اور قرضے بھی ہوں اور اس کے پاس اس بکری کے علاوہ کوئی اور مال نہ ہو تب بھی یہ زکوٰۃ قرض خواہوں کے ساتھ ان کے قرضوں میں حصہ دار ہو جائے گی (یعنی جتنے قرض خواہ ہوں گے ان میں ایک زکوٰۃ بھی مزید قرض خواہ بن کر حصہ دار بن جائے گی) حالانکہ یہ انتہائی بے قاعدہ بات اور انسانوں کے قول سے مستبعد ہے۔

باب

گائے بیلوں کی زکوٰۃ اور اُس کے قواعد

(۹۹۲) مسروق کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ بن جبل رضؓ کو یمن بھیجا اور انہیں حکم دیا کہ وہ ہر تیس گایوں پر ایک تبیع یا تبیعہ لیں، اور ہر چالیس گایوں پر ایک مُسِنّہ لیں[1]۔

(۹۹۳) یہی مضمون اعمش نے ابراہیم سے سُنا ہے۔

(۹۹۴) طاؤس یمانی نے بھی یہی مضمون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور معاذ رضؓ سے روایت کیا ہے۔

(۹۹۵) حسن کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر چالیس گایوں پر ایک مُسِنّہ مقرر فرمایا اور ہر تیس گایوں پر تبیع مقرر فرمایا۔

(۹۹۶) یونس نے حسن سے، مغیرہ نے ابراہیم سے، اجلح نے شعبی سے روایتیں بیان کی ہیں کہ ہر تیس گایوں پر ایک تبیع اور ہر چالیس گایوں پر ایک مُسِنّہ لی جائے۔

(۹۹۷) ابن شہاب کہتے ہیں کہ عمر بن عبد العزیز نے بھی ٹھیک یہی مضمون لکھا تھا۔

---

[1] اس حدیث پر محدثین نے کلام کیا ہے۔ ترمذی اور دارقطنی نے ازروئے اسناد اسے مرسل بتایا ہے! ابن حزم اس کی صحت پر زور دیتے ہیں۔ عبد الحق کہتے ہیں گایوں کی زکوٰۃ کے متعلق کوئی متفق علیہ صحیح روایت نہیں ہے۔ ابن عبد البر استذکار میں کہتے ہیں: علماء میں گایوں کی شرح زکوٰۃ کے سلسلے میں معاذ رضؓ کی حدیث پر کوئی اختلاف نہیں ہے اور گایوں کی زکوٰۃ کے سلسلے میں سب کا اس روایت پر اتفاق ہے۔ (از حاشیہ)

(نوٹ) عمروں کے عربی ناموں کی شرح آخری ضمیمہ میں ملے گی۔

ابوعبیدؒ: یہی قاعدہ ہے جس پر اہلِ حجاز و اہلِ عراق عمل پیرا ہیں اور مجھے آج کل بھی اِس بارے میں لوگوں کے اختلاف کا کوئی علم نہیں ہے۔ تاہم بعض آثار سے کچھ ایسی اطلاع ملی ہے جسے ہم غیر محفوظ خیال کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ لوگوں میں یہ بات غیر معروف ہے۔

(۹۹۸)۔ محمد بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقہ سے متعلق مکتوب گرامی میں نیز حضرت عمرؓ کے مکتوب میں یہ عبارت ہے: "گایوں پر اس طرح زکوٰۃ لی جائے گی جس طرح اُونٹوں پر لی جاتی ہے۔"

(۹۹۹)۔ راوی کہتا ہے کہ اس بارے میں ان کے علاوہ دوسروں سے دریافت کیا گیا تو انہوں نے بھی یہی کہا: "ان گایوں میں بھی وہی کچھ (واجب) ہے جو اونٹوں میں ہے۔"

(۱۰۰۰)۔ عمر بن عبدالرحمٰن بن خلدۃ انصاری روایت کرتے ہیں: "گایوں کی زکوٰۃ اونٹوں کی زکوٰۃ کی طرح ہوتی ہے، البتہ ان گایوں میں عمروں کا حساب نہیں ہوتا۔"

ابوعبید: یہ قول ہمیں صرف ان مذکورہ بالا دو حدیثوں میں ملتا ہے۔ لیکن تمام لوگ اس سے اختلاف کرتے ہیں اور عمل پہلے قول ہی پر ہوتا ہے۔ یہ تو ہُوا (افزائشِ نسل کے لئے ریوڑوں میں) چرنے والی گایوں، بیلوں کی زکوٰۃ کا بیان۔

محنت کرنے والی گائے بیل کی زکوٰۃ

اب اگر گائے بیل (کھیتی باڑی وغیرہ کے) کام پر لگے ہوں تو ان کا حساب جُدا گانہ ہوگا:۔

(۱۰۰۱)۔ حضرت علیؓ سے مروی ہے: "کام کرنے والے (زراعت یا حمل و نقل وغیرہ کے) بیلوں، گایوں پر صدقہ نہیں لیا جائے گا۔"

(۱۰۰۲)۔ ابراہیم و مجاہد سے مروی ہے کہ جوتے جانے والے بیلوں گایوں پر صدقہ نہیں لیا جائے گا۔"

(۱۰۰۳)۔ موسیٰ بن طلحہ کہتے ہیں: "کام کرنے والے بیلوں گایوں پر صدقہ نہیں لیا جائے گا۔"

(۱۰۰۴)۔ دو سندوں کے اختلاف کے ساتھ عمر بن عبدالعزیز سے مروی
(۱۰۰۵)۔ ہے: "کام کرنے والے بیل گایوں پر صدقہ نہیں لیا جائے گا۔"

(۱۰۰۶) ۔ عمرو بن دینار سے روایت ہے کہ انہیں یہ روایت پہنچی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہل جوتنے والے بیلوں پر زکوٰۃ نہیں لی جائے گی۔"

(۱۰۰۷) ۔ جابر بن عبداللہ رضؓ کہتے ہیں: "ہل جوتنے والے جانوروں پر زکوٰۃ نہیں لی جائے گی۔

(۱۰۰۸) ۔ جابر رضؓ کہتے ہیں: "کھیتی پر کام کرنے والے جانوروں پر زکوٰۃ نہیں لی جائے گی۔"

(۱۰۰۹) ۔ ابن شہاب کہتے ہیں: "پانی کے لئے کام میں لائے جانے والے اونٹوں اور گایوں بیلوں پر نیز کھیتی باڑی کے بیلوں پر زکوٰۃ نہیں لی جائے گی۔ اس لئے کہ یہ جانور تو کھیتوں کو سیراب کرتے اور زمین جوتنے کے کام آتے ہیں۔

(۱۰۱۰) ۔ سعید بن عبدالعزیز تنوخی کہتے ہیں: جو گائے بیل زمین جوتنے کے کام کرتے ہیں، ان پر زکوٰۃ نہیں لی جائے گی۔ اس لئے کہ گیہوں (غلّہ وغیرہ) پر زکوٰۃ لی جاتی ہے اور گیہوں گائے بیلوں (کی محنت) سے حاصل ہوتا ہے۔"

(۱۰۱۱) ۔ ہمیں ابن بکیر نے لیث بن سعد کے بارے میں بتایا کہ ان تمام احادیث کے مطابق ان کی رائے یہی تھی کہ ان (عمل کرنے والے محنت کش گائے بیلوں) پر زکوٰۃ نہیں لی جائے گی۔

(۱۰۱۲) ۔ وہ کہتے ہیں کہ مالک بن انس رضؓ یہ رائے رکھتے تھے کہ ان جانوروں پر زکوٰۃ لی جائے گی۔

ابو عبید رحؒ: مالک رحؒ سے پہلے ہمیں کوئی ایسا عالم نہیں معلوم جس نے بالخصوصیت گائے بیلوں کے بارے میں یہ بات کہی ہو، ہمارا خیال ہے کہ انہوں نے اُونٹوں کے بارے میں اپنی اس رائے کی بنا پر کہ بیلوں اور اونٹوں کے لئے مجمل الفاظ آتے ہیں، یہ مسلک اختیار کیا ہوگا، چنانچہ انہوں نے مجموعی طور پر سب جانوروں کے لئے یہ معنے عام کر دیئے۔ حتیٰ کہ کام کرنے والے اور کھیتی باڑی میں کام آنے والے جانوروں کو بھی انہوں نے اس مجموعہ میں شامل کر لیا اور اگر ہمارے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث

اور صحابہؓ و تابعینؒ اور آج تک اُن کے بعد آنے والوں کے آثار سے بالتواتر اس بارے میں خصوصی استثنار نہ پہنچتا تو بات وہی صحیح ہوتی (جو مالکؒ نے کہی ہے). پھر یہ کہ اہلِ عراق کا عمل بھی اس خصوصی استثنار کی تاکید میں ہے اور یہی خود سفیانؒ کی رائے ہے۔

(۱۰۱۳)۔ سفیانؒ سے منقول ہے کہ اُن کے سامنے مالکؒ کا یہ قول بیان کیا گیا تو انہوں نے کہا: مجھے یہ خیال نہ تھا کہ کوئی یہ بھی کہے گا۔"

ابو عبید: بایں ہمہ اگر آپ نظری طور پر اس مسئلہ کا تجزیہ کریں تب بھی بات وہی صحیح ہو گی جو اکثریت نے کہی ہے۔ اِس لئے کہ کام کرنے والے بیلوں پر دو سبب سے زکوٰۃ نہیں لی جائے گی۔ ایک تو یہ کہ جب انہیں کام میں لایا گیا اور ان سے استفادہ کیا گیا تو اُن کی حیثیت سواری کے جانوروں اور بار برداری کے خچروں اور گدھوں کی سی ہو گئی، اس طرح وہ غلاموں اور استعمال میں آنے والے ساز و سامان کے مشابہ ہو گئے چنانچہ اِس بنا پر ان کی حیثیت اور (افزائشِ نسل کے لئے) چرنے والے مویشیوں کی حیثیت جُدا جُدا ہو گئی۔

(۱۰۱۴)۔ دوسری وجہ وہی ہے جسے ابن شہاب اور سعید بن عبد العزیز نے بیان کر دیا ہے، یعنی یہ کہ چونکہ یہ جانور سیرابی اور کھیتی باڑی کے کام آتے ہیں اور وہ غلہ جس پر زکوٰۃ لگتی ہے، وہ انہی جانوروں کی جُتائی، سیرابی اور گاہنے کا نتیجہ ہوتا ہے، لہٰذا اگر غلّہ کے ساتھ ساتھ ان جانوروں کی زکوٰۃ بھی لی گئی تو لوگوں پر دوہری زکوٰۃ لگ جائے گی۔

یہ ہیں گائے بیلوں کی زکوٰۃ کے احکام۔ خلاصہ یہ کہ اس ضمن میں گائے بیلوں کو تین حصّوں میں تقسیم کیا جائے گا:۔

زکوٰۃ کے ضمن میں اُونٹوں گائے بیلوں کی تین قسمیں (۱) نسل کشی کیلئے پالی جانے والی	**قسم اوّل:۔** گلّہ کی گائیں۔ یہ وہ گائیں ہیں جو نسل کشی اور گا ہیں

بڑھانے کے لئے مجموعی شکل میں (ریوڑ ریوڑ) چرائی جاتی ہیں۔ ان کی زکوٰۃ ہمارے بیان کردہ طریقہ کے مطابق تبیع اور مُسنہ کی صورت میں ادا ہوگی (دیکھئے نمبر ۹۹۲ تا ۹۹۶)

(ii) تجارتی

قسم دوم: وہ گائیں جو تجارت کے سلسلے میں رکھی جائیں۔ ان کے لئے زکوٰۃ کا پہلا طریقہ نہیں ہوگا بلکہ ایسی گایوں کو بقیہ تجارتی اموال میں شامل کیا جائے گا۔ ان کا مالک سال ختم ہونے پر ان کی قیمت لگائے گا اور وہ قیمت اپنے دوسرے مال میں شامل کرے گا۔ اور جب یہ مجموعی قیمت دو سو درہم یا بیس مثقال یا اس کے اوپر پہنچ جائے گی تو وہ سونے چاندی کی زکوٰۃ کی طرح اس کی بھی زکوٰۃ ادا کرے گا۔ ہر دو سو درہم پر پانچ درہم اور ہر بیس مثقال پر نصف مثقال کے حساب سے۔ اور جو زکوٰۃ ہو اُس پر اس کے حساب سے۔

(iii) محنت کشی کرنے والی

قسم سوم: وہ کام کرنے والے جانور ہیں جن کا ہم نے ذکر کیا ہے اور ایسے جانوروں پر کوئی زکوٰۃ نہیں لی جائے گی۔

یہی صورت اونٹوں کی ہوگی ان میں سے جو ریوڑ نسل کشی اور اونٹ بڑھانے کے لئے رکھے جائیں گے ان کی زکوٰۃ ان مکاتیب کے مطابق لی جائے گی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عمرؓ سے ہم نے روایت کئے ہیں یعنی ہر پانچ اونٹ پر ایک بکری۔ الخ۔ اب اگر اونٹ تجارت کے لئے ہوں تو وہ ہمارے مذکورہ بالا طریقہ کے مطابق اموال تجارت میں شامل کئے جائیں گے اور اگر وہ کام کرنے والے ہوں تو ان پر کوئی زکوٰۃ نہیں ہوگی۔

بھیڑ بکریاں نسل کشی اور تجارتی اغراض میں اونٹوں اور گائے بیلوں سے مشابہ ہونگی ان کی تیسری قسم گھریلو پالتو بھیڑ بکریوں کی ہوگی

(۱۰۱۵) جہاں تک بھیڑ بکریوں کا تعلق ہے وہ صرف نسل کشی کے ریوڑ اور تجارتی اغراض میں اونٹوں اور گایوں سے مشابہ ہوں گی اس لئے کہ بھیڑ بکریوں میں کام کرنے

والے جانور نہیں ہوتے۔ البتہ بھیڑ بکریوں کی تیسری قسم جس پر زکوٰۃ نہیں لی جائے گی وہ ہے جو شہروں اور گاؤں میں گھروں میں پالی جاتی ہے اور ان کا دودھ لوگوں کے کھانے پینے کے کام آتا ہے ظاہر ہے کہ بکریوں کی یہ قسم نہ تو نسل کشی کے لئے ریوڑوں میں چرنے والی ہے اور نہ تجارت کے لئے، یہی وہ قسم ہے جس کے بارے میں ابراہیم (نخعی) اور مجاہد نے کہا ہے:

(۱۰۱۶) - مغیرہ کہتے ہیں کہ ابراہیم نے کہا: "گھریلو ضروریات کے لئے پالی ہوئی بھیڑ بکریوں پر زکوٰۃ نہیں لی جاتے گی"۔

(۱۰۱۷) - عبدالکریم کہتے ہیں کہ مجاہدؒ نے ایسے شخص کے بارے میں جس کے پاس شہر میں چالیس دودھ دینے والے جانور (اونٹنیاں، بکریاں وغیرہ) ہوں، کہا کہ اُن پر زکوٰۃ نہیں ہوگی۔

زکوٰۃ میں تجارتی مویشیوں کی تعداد نہیں بلکہ قیمت ملحوظ رکھی جائیگی جبکہ نسل کشی کے مویشیوں کی تعداد ملحوظ رہے گی

(۱۰۱۸) - ابوعبید: ہماری مذکورہ بالا اقسام کی تائید ان روایات سے بھی ہوتی ہے جو سفیان سے منقول ہیں۔ اور یہی اونٹوں، گایوں اور بھیڑ بکریوں وغیرہ سب میں اہل عراق کا قول ہے۔ اب اگر گائیں تجارت کی ہوں، اور ان کی تعداد ایسی درمیانی تعداد ہو جس میں زکوٰۃ نہیں لی جاتی تو اس درمیانی تعداد کا لحاظ کئے بغیر جملہ تعداد کو شمار کیا جائے گا اور جب ان کی قیمت دوسو درہم یا بیس مثقال تک پہنچ جائے گی تو سب پر زکوٰۃ دی جائے گی۔ اس لئے کہ اندریں صورت ان جانوروں کا شمار درہم و دینار کے زمرہ میں ہوگا۔ اور اگر یہ جانور نسل کشی کے لئے چرنے والے ہوں تو ایسی صورت میں اس درمیانی تعداد پر زکوٰۃ نہیں لی جائے گی۔

(۱۰۱۹) یہی سفیان اور اہل عراق کا قول ہے۔ ساتھ ہی اس مضمون کی روایات بھی ہیں:

(۱۰۲۰) سلمہ بن اسامہ روایت کرتے ہیں کہ معاذ بن جبلؓ نے کہا: "مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ یمن سے زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے بھیجا اور مجھے حکم دیا کہ میں ہر تیس گایوں پر ایک تبیع (دوسرے سال میں لگنے والا بچھڑا) لوں ــــ راوی کہتا ہے: تبیع سے مراد نر یا مادہ جَذَع ہے (پورے دو سال کا) اور ہر چالیس گایوں پر مُسِنّہ (تیسرے سال میں لگنے والی گائے) لوں، ساٹھ پر دو تبیع، ستر پر ایک مُسنّہ اور ایک تبیع، اسّی پر دو مسنّہ، نوّے پر تین تبیع، سو پر ایک مسنّہ اور دو تبیع، ایک سو بیس پر تین مسنّہ یا چار تبیع لوں۔ اور مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ میں ان عددوں کی درمیانی تعداد پر کچھ نہ لوں۔" پھر انہوں نے کہا۔ "دو مقررہ تعدادوں[1] کے درمیان میں جو تعداد ہو اس پر زکوٰۃ نہیں لی جاتی۔"

(۱۰۲۱) طاؤس کہتے ہیں کہ معاذ بن جبلؓ نے یمن میں کہا "میں گایوں کی زکوٰۃ وصول کرتے وقت اس درمیانی تعداد پر کچھ نہیں لونگا جو دو فرائض کے درمیان ہو، اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس بارے میں کچھ حکم نہیں دیا ہے۔"

(۱۰۲۲) یحییٰ بن الحکم کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "(گایوں کے) دو فرائض کے درمیان کی تعداد پر کوئی زکوٰۃ نہیں لی جائے گی۔"

(۱۰۲۳) شعبی کہتے ہیں: "(گایوں کے) دو فرائض کے درمیانی تعداد پر کوئی زکوٰۃ نہیں ہوتی۔"

(۱۰۲۴) ابن شہاب کہتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیز نے لکھا: "دو فرائض کے درمیان کی تعداد پر کوئی زکوٰۃ نہیں ہوتی۔"

ابو عبید: (گایوں کے) دو فریضوں کے درمیان کی تعداد کو عربی میں وَقص (جمع اوقاص) کہتے ہیں اور یہ اسی شرح کے مطابق ہے جو ہم ابن لہیعہ کی پہلی حدیث (نمبر ۱۰۲۰) میں لکھ آئے ہیں۔ اسی طرح اونٹوں کے دو فریضوں کے درمیان کی تعداد کیلئے

---

[1] مثلاً چالیس سے اوپر ساٹھ ہونے تک کی تعداد یا سو کے بعد ایک سو بیس ہونے تک کی درمیانی تعداد اسے عربی میں وَقص اور شَنَق کہتے ہیں۔ ابو عبید نے ان کی شرح نمبر ۱۰۲۴ کے تحت کر دی ہے۔ (مترجم)

شَنَق بولا جاتا ہے جمع اَشْنَاق۔

گایوں میں دو عمروں کے جانوروں کے سوا اور کسی عمر کا جانور زکات میں نہیں لیا جاتا اور وہ ہیں تبیع (دوسرے سال میں لگنے والا بیل) اور مُسِنّہ (تیسرے سال میں لگنے والی گائے)

(۱۰۲۵) شعبی کہتے ہیں کہ "تبیع" اس بچھڑے کو کہتے ہیں جس کے کانوں اور سینگوں کی لمبائی برابر ہو چکی ہو۔ اور مُسِن (یا مُسِنّہ وہ بیل یا گائے) جس کے دو اگلے دانت نکل آئے ہوں اور یہ تیسرے برس میں ہوتا ہے)

(۱۰۲۶) حضرت معاذؓ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم سے جو حدیث روایت کی ہے۔ اس میں ہے: تبیع (دوسرے سال میں لگنے والا بیل) نر ہو یا مادہ پورے دو سال کا (جَذَع یا جذعَۃ) ہو۔ (دیکھئے نمبر ۱۰۲۰)

ابو عبیدؒ: روایت میں تبیع اور مُسِنّہ کی اسی طرح تفسیر ہے لیکن علما لغتِ عرب کا کہنا ہے کہ "تبیع" کسی خاص عمر پر منحصر نہیں بلکہ جب بھی بچھڑا اتنا بڑا ہو جائے کہ وہ اپنی ماں کے پیچھے پیچھے چل سکے تو وہ بچھڑا "تبیع" کہلائے گا اور یہ تعریف روایت کے خلاف نہیں کیونکہ اس میں یہ استعداد بالعموم دوسرے سال کی تکمیل پر ہوتی ہے۔ اسی طرح اونٹوں کے بچوں میں "فصیل" کے لئے کسی عمر کی قید نہیں بلکہ جب بھی اسے اس کی ماں سے دودھ چھڑا کر الگ کر لیا جائے وہ "فصیل" کہلاتا ہے۔

گایوں اور بھینسوں کے لئے ایک قاعدہ ہے اور دونوں کو ملا کر شمار کیا جائیگا

ابو عبیدؒ: اگر گایوں میں بھینسیں ملی ہوں تو ان سب کو ایک قاعدہ میں شمار کیا جائے گا، اس ضمن میں روایات آئی ہیں:۔

(۱۰۲۷) ابن شہاب کہتے ہیں کہ عمر بن عبد العزیز نے لکھا: "جس طرح گایوں پر زکواۃ لی جاتی ہے۔ بھینسوں پر بھی اسی حساب سے زکوٰۃ لی جائے"۔

(۱۰۲۸) یہی مضمون اشعث نے حسن سے روایت کیا ہے۔

(۱۰۲۹) مالک بن انس کہتے ہیں: بھینس اور گائے ایک حکم رکھتی ہیں، اور بخاتی (لمبی گردنوں والے) اور عربی اونٹوں کا ایک حکم ہے اور بھیڑ بکری دونوں "غنم" میں یکساں شامل ہیں۔

ابو عبیدؒ: مطلب یہ ہے کہ اگر ان دونوں اقسام کے کچھ جانور ہوں تو ان دونوں اقسام کو ملا کر گنا جائے گا اور پھر ان دونوں کی مجموعی تعداد پر زکوٰۃ لی جائے گی۔

(۱۰۳۰) ابن بکیر کہتے ہیں کہ مالک نے کہا: اگر گلہ کی تعداد میں بھیڑ بکریاں مساوی ہوں تو زکوٰۃ وصول کرنے والے کی مرضی پر ہوگا کہ وہ ان دونوں قسموں میں سے جس کو چاہے زکوٰۃ میں لے۔ لیکن ان میں سے ایک قسم کی تعداد دوسری سے زیادہ ہو تو زکوٰۃ وصول کرنے والا اکثریت والی قسم میں سے زکوٰۃ لے گا۔

(۱۰۳۱) لیکن اہل عراق کا قول ہے کہ ہر قسم میں سے علیحدہ علیحدہ ان کے حساب کے مطابق انہی میں سے زکوٰۃ لی جائے گی۔

(۱۰۳۲) **ابو عبیدؒ:** بعض اہل رائے کا کہنا ہے کہ گایوں میں دو فریضوں کے درمیان کوئی ایسی تعداد نہیں جس پر زکوٰۃ نہیں لی جائے گی، بلکہ اگر وہ تیس سے ایک بھی زیادہ ہو تو اس پر بھی اس کے حساب کے مطابق زکوٰۃ لی جائے گی اور جوں جوں ان کی تعداد میں اضافہ ہوگا یہی عمل جاری رہے گا۔

(۱۰۳۳) اسی طرح ان کا قول یہ بھی ہے کہ دو سو درہم سے اوپر کی تعداد پر کوئی زکوٰۃ نہیں لی جائے گی تا آنکہ وہ چالیس نہ ہو جائیں۔ اس طرح بیس دینار سے زائد پر بھی زکوٰۃ نہیں لی جائے گی تا آنکہ وہ چوبیس نہ ہو جائیں۔

ابو عبیدؒ: اس طرح انہوں نے سونے اور چاندی میں تو دو فریضوں کی درمیانی تعداد کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دے دیا لیکن گایوں کے دو فریضوں کی درمیانی تعداد کو ساقط قرار دے دیا۔ حالانکہ سنت گایوں کے دو فریضوں کی درمیانی تعداد پر زکوٰۃ ساقط قرار دیتی ہے۔ گویا انہوں (اہل رائے) نے دونوں جگہ سنت کی مخالفت کی۔

باب

بھیڑ بکریوں کی زکوٰۃ اور اُن کے قواعد

(۱۰۳۴) محمد بن عبد الرحمٰن کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوب صدقہ[1] اور حضرت عمر رضؓ کے مکتوب میں درج ہے۔

چالیس سے کم تعداد بھیڑ بکریوں پر کچھ زکوٰۃ نہیں لگے گی۔ جب وہ چالیس ہو جائیں تو پھر ان پر ایک سو بیس ہونے تک ایک بکری (یا بھیڑ) لی جائے گی۔ پھر جب ایک سو بیس میں ایک کا بھی اضافہ ہو جائے تو ان پر دو سو تک دو بکریاں لی جائیں گی اور جب دو سو سے ایک بکری بھی بڑھ جائے تو تین سو تک تین بکریاں لی جائیں گی۔" راوی کہتا ہے" پھر اگر بکریاں تین سو سے بڑھ جائیں تو سو ہونے سے پہلے پہلے ان پر کوئی زکوٰۃ نہیں ہو گی خواہ ننانوے ہی کیوں نہ ہو جائیں تاآنکہ وہ پوری سو ہو جائیں۔ پھر ہر پوری سو تعداد پر ایک بکری لی جائے گی۔ زکوٰۃ میں نہ تو بہت بوڑھی بکری لی جائے گی اور نہ (نسل کشی کرنے والا) نر، الا یہ کہ صدقہ وصول کرنے والا[2] اسے منظور کرے۔

(۱۰۳۵) سالم بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مکتوبِ صدقہ میں جو آلِ عمر بن الخطاب رضؓ کے پاس تھا بکریوں (بھیڑوں) کے صدقہ کے بارے میں

---

[1] ابو داؤد کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ نے مکتوبِ گرامی لکھ کر رکھ تھا اور اپنے عاملوں کو بھیجنے نہ پائے تھے کہ وفات ہو گئی، اور آپ کے بعد ابوبکر، عمر رضی اللہ عنہما نے اسے نافذ کیا۔

[2] یہاں عربی میں مُصَدِّق ہے جس کے معنی ہیں، محصل صدقہ اگر دال کو مفتوح یا "ص" کو تشدید کے ساتھ مُصَّدِّق پڑھا جائے تو اس کے معنے "صدقہ دینے والا" ہوں گے۔

یہی مضمون تھا۔

(۱۰۳۶) سالم بن عبداللہ اور عبداللہ بن عبداللہ سے بھی بھیڑ بکریوں کے صدقہ کے سلسلے میں ایسی ہی روایت ہے۔

(۱۰۳۷) ابن جریج کہتے ہیں کہ عثمان بن عثمان نے انہیں ایک خط دیا۔ جو عبداللہ بن ابی بکر نے محمد بن ہشام کے نام لکھا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کے بارے میں لوگوں کا خیال ہے کہ یہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا وہ گرامی نامہ ہے جو آپ نے بھیڑ بکریوں کے صدقہ کے بارے میں عمرو بن حزم کو لکھا تھا اس کی عبارت بھی اس کے مطابق ہے۔

(۱۰۳۸) عکرمہ بن خالد سے روایت ہے کہ ابوبکر بن عبداللہ نے انہیں ایک مکتوب دیا جسے انہوں نے اس صحیفہ سے نقل کیا تھا جو حضرت عمر بن الخطابؓ کی تلوار کے غلاف سے بندھا ہوا تھا۔ اس مکتوب میں بھی بھیڑ بکریوں کی زکوٰۃ کا وہی مذکورہ بالا حساب درج ہے۔

(۱۰۳۹) لیث بن سعد کہتے ہیں کہ بھیڑ بکریوں کی زکوٰۃ سے متعلق یہی کچھ حضرت عمر بن الخطابؓ کے صدقہ نامہ میں درج ہے۔

لیث کہتے ہیں کہ مجھے نافع نے بتایا کہ انہوں نے یہ مکتوب صدقہ کئی بار عبداللہ بن عمرؓ کے سامنے پیش کیا تھا۔

(۱۰۴۰) مالک بن انس کہتے ہیں "میں نے صدقہ سے متعلق نامہ عمر بن الخطابؓ پڑھا ہے۔" پھر انہوں نے بھیڑ بکریوں کی زکوٰۃ کا وہی نصاب بیان کیا جو اوپر گزرا۔

(۱۰۴۱) **ابو عبیدؒ:** اسی مضمون کی روایت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے حضرت ابوبکرؓ کے واسطہ سے انس بن مالک نے کی ہے۔

اور اسی تفصیل کے مطابق، سفیان، مالک، اہل عراق اور اہل حجاز کے قول کے بموجب اس پر عمل کیا جاتا ہے اور مجھے اس بارے میں ان میں کسی اختلاف کا علم نہیں ہے۔

بڑی چھوٹی مخلوط بھیڑ بکریوں اور صرف چھوٹی بھیڑ بکریوں کی زکوٰۃ

(۱۰۴۲) بھیڑ بکریاں اگر چھوٹی اور بڑی عمر کی ملی جلی ہوں تو اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ زکوٰۃ کے لئے ان سب کو مجموعی طور پر شمار کیا جائے گا۔ لیکن اگر سب چھوٹی ہی ہوں تو پھر اس بارے میں اختلاف ہے جس کا تذکرہ ہم اونٹوں کی زکوٰۃ کے ضمن میں کر آئے ہیں۔ (دیکھئے، نمبر ۹۶۱ سے ۹۷۰ تک)

ان کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ ان سب کا مجموعی طور پر ایک ہی قاعدہ ہوگا۔ اور اس باب میں حضرت عمرؓ کی روایت بھی موجود ہے۔

(۱۰۴۳) مالک بن اوس بن حدثان راوی ہیں کہ سفیان بن عبداللہ ثقفی جو طائف میں گورنر تھے حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور ان سے کہا۔ یا امیرالمومنین! بھیڑ بکری والے ہم سے شکایت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم زکوٰۃ کے لئے ہمارے چھوٹے چھوٹے بچے شمار تو کرتے ہو لیکن ان میں سے کوئی چھوٹا بچہ زکوٰۃ میں قبول نہیں کرتے ہو، تو حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ "ان کے ریوڑ کے تمام چھوٹے بچے شمار کرو اور انہیں زکوٰۃ میں نہ لو، حتیٰ کہ اس بچہ کو بھی شمار کرو جسے چرواہا اپنے ہاتھوں پر اٹھا کر لے جا رہا ہو۔ اور ان (شکایت کرنے والوں) سے کہدو۔ "ہم تمہارے لئے گھر کے استعمال کے لئے دودھ دینے والی اور بچہ دینے والی بھیڑ بکری نیز گوشت کی بکری اور (نسل کشی کا) نر بھی تو چھوڑ دیتے ہیں اور تم سے ایک سال سے کم عمر کی بکری بھی لیتے ہیں تاکہ ہمارے اور تمہارے درمیان اعتدال باقی رہے۔

(۱۰۴۴) یہی مضمون ایک اور سند سے سفیان بن عبداللہ اور حضرت عمرؓ سے مروی ہے۔

(۱۰۴۵) مکحول نے بھی عمر بن الخطابؓ اور سفیان بن عبداللہ سے اسی مضمون کو روایت کیا ہے لیکن اس میں عبارت اس طرح ہے۔ "ان سے بہت بچے دینے والی دودھ کے لئے پالی جانے والی، گوشت کھانے کے لئے پالی جانے والی، بکریاں

نہ لو اور نہ ہی نر (جو نسل کشی کے لیئے ہو) بلکہ (ان سے) دوسرے سال میں لگنے والی بکری (جذع) یا تیسرے سال میں لگنے والی بکری (ثنیہ) لے لو۔ اور یہ ہمارے اور ان کے درمیان منصفانہ عمل ہو گا۔

(۱۰۴۶) یونس حسن سے اور مغیرہ ابراہیم سے، بھیڑ بکریوں کے متعلق روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں: (زکوٰۃ وصول کرنے والا) چھوٹے بچوں کو گنے گا۔ لیکن انہیں (زکوٰۃ میں) نہیں لے گا۔

(۱۰۴۷) مکحول کہتے ہیں۔ (تعداد گنتے وقت) لوگوں کی چھوٹی بھیڑ بکریوں کو گنا جائے گا۔ لیکن ان سے زکوٰۃ میں چھوٹی عمر کی بھیڑ بکری نہیں لی جائے گی۔

ابو عبیدؒ: ان تمام روایات میں دونوں احتمال ہیں ایک تو یہ کہ ریوڑ میں کوئی مُسنّہ (تیسرے سال کی بکری) ہی نہ ہو بلکہ سب چھوٹے بچے ہوں دوسرے یہ کہ چھوٹے اور بڑے مخلوط ہوں۔

زکوٰۃ میں لی جانے والی بھیڑ بکریوں کی عمر کا تعین

بھیڑ بکریوں میں بھی زکوٰۃ کے لیئے گائے بیلوں کی طرح دو عمروں کے جانور ہی لیئے جاتے ہیں۔ گائے بیلوں میں وہ عمریں، تبیع (دوسرے سال میں لگنے والا) اور مُسنّہ (تیسرے سال میں لگنے والی) کہلاتی ہیں۔ لیکن بھیڑ بکریوں میں یہ عمریں جذعۃ (دوسرے سال میں لگنے والی) بکری اور ثنیۃ (تیسرے سال میں لگنے والی) کہلاتی ہیں۔

اس ضمن میں روایات ہیں:۔

(۱۰۴۸) مکحول کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ بن الخطاب نے سفیان بن عبد اللہ سے بھیڑ بکریوں کے صدقہ کے بارے میں فرمایا: "دوسرے سال میں لگنے والی اور تیسرے سال میں لگنے والی بکری لو۔"

(۱۰۴۹) سالم بن عبد اللہ المحاربی سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ بن الخطاب نے محصلِ صدقہ کو روانہ کرتے ہوئے اسے حکم دیا کہ وہ دوسرے سال میں لگنے والی جذعہ

اور تیسرے سال میں لگنے والی (ثَنِیَّہ) بھیڑ بکری ہے۔

(١٠٥٠) مکحول کہتے ہیں: "بھیڑ بکریوں کی زکوٰۃ میں دوسرے سال میں لگنے والی اور تیسرے سال میں لگنے والی بکری (یا بھیڑ) لی جائے گی۔

(١٠٥١) **ابوعبیدؒ**: اور یہی آج کل لوگوں کا معمول ہے، اتنا ضرور ہے کہ مالک بن انس کو یہ پسند تھا کہ بھیڑوں میں سے دوسرے سال میں لگنے والی اور بکریوں میں سے تیسرے سال میں لگنے والی، لی جائے۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ اسے قربانی کے جانوروں سے مشابہ سمجھتے تھے، اور یہ اچھا مسلک ہے۔

گائے بکری میں نر و مادہ یا عمر کا تفاوت ملحوظ نہیں ہوگا

گایوں بیلوں اور بھیڑ بکریوں میں نر و مادہ میں تفریق نہیں ہوگی اور نہ اونٹوں کی طرح عمر کے تفاوت کے باعث ایک کو دوسرے پر ترجیح دی جائے گی۔

باب

جُدا جُدا جانوروں کو یکجا کرنا، یکجا جانوروں کو جُدا جُدا کرنا اور مویشیوں کے صدقہ میں شریکوں کی باہمی معاملہ فہمی کا بیان

(۱۰۵۲) سوید بن غفلہ کہتے ہیں: ہمارے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا محصلِ صدقہ آیا تو میں نے اسے یہ کہتے ہوئے سنا: "میرے عہد نامہ (فرائض منصبی) میں ہے کہ کوئی دودھ پیتا بچہ نہ لوں، نہ جدا جدا جانوروں کو یکجا کروں، نہ یکجا جانوروں کو جدا جدا کروں"۔ راوی کہتے ہیں: "ایک شخص ان کے پاس صدقہ میں ایک بڑی کوہان والی اونٹنی لایا تو انہوں نے اسے لینے سے انکار کر دیا"۔

(۱۰۵۳) محمد بن عبد الرحمٰن کہتے ہیں: "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے صدقہ نامہ میں یہ درج تھا کہ صدقہ میں نہ تو بوڑھی لی جائے اور نہ (نسل کشی کا) نر۔ الا یہ کہ مُصدّق[1] چاہے اور صدقہ دلگنے یا بڑھنے کے ڈر سے نہ تو اکٹھے جانوروں کو جدا جدا کیا جائے گا اور نہ جدا جدا جانوروں کو یکجا کیا جائے گا۔

ابو عبیدؒ: اوپر کی حدیث میں ہے الا یہ کہ مصدِّق چاہے۔" اس کے دو معنے ہوتے ہیں ایک تو دال کو زیر سے، جس کے معنے ہوتے ہیں محصل صدقہ اور محدثین اس لفظ کے یہی معنے لیتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ دال کے زبر

---

[1] مُصَدِّق کی بحث کے لئے ذیل میں ابو عبید کی شرح دیکھئے نیز ۱۰۴۴ کا حاشیہ ملاحظہ کریں۔

سے مصدِّق[1] ہے جس کے معنی ہیں مویشیوں کا مالک جو صدقہ ادا کر رہا ہے۔

(۱۰۵۴) ایک اور روایت میں یہی مضمون حضرت علیؓ سے مروی ہے لیکن اس میں یہ اضافہ ہے: "بوڑھی نہیں لی جائے گی اور نہ عیب دار۔"

(۱۰۵۵) حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت حضرت علیؓ کی روایت کے مطابق بیان کی ہے، اور اس میں یہ اضافہ ہے اور دونوں شریک اپنا اپنا حساب انصاف اور برابری کے ذریعہ سمجھ لیں گے۔

(۱۰۵۶) عکرمہ بن خالد کہتے ہیں کہ ابوبکر بن عبید اللہ نے انہیں ایک خط لکھا اور وہ اس صحیفہ صدقہ سے منقول تھا جو حضرت عمر کی تلوار کے غلاف سے بندھا ہوا تھا۔ اس کی عبارت پوری طرح حضرت صدیقؓ کی روایت کے مطابق ہے چنانچہ اس میں صدقہ کے ممنوعہ امور کے ضمن بوڑھی اور عیب دار اور (نسل کشی کا) نر لینا، اور جدا جدا جانوروں کو جمع کرنا اور اکٹھے جانوروں کو الگ الگ کر دینا، مذکور ہیں۔ نیز دونوں شریکوں کو انصاف و برابری کے اصول پر اپنے اپنے حساب سمجھنے کا ذکر ہے۔

(۱۰۵۷) نافع کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے صحیفہ زکوٰۃ میں بالکل وہی مضمون ہے جو حضرت ابوبکرؓ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے اور جسے ابوبکر بن عبد اللہ نے حضرت عمرؓ کے مکتوب سے روایت کیا ہے اور ان میں باہم کوئی فرق نہیں ہے۔

لیث کہتے ہیں کہ نافع نے انہیں بتایا کہ انہوں نے اس مکتوب کو کئی بار عبد اللہ بن عمرؓ کو دکھایا تھا۔

(۱۰۵۸) مالک بن انس کہتے ہیں کہ انہوں نے مذکورہ بالا تمام تفاصیل حضرت عمر بن الخطابؓ کے مکتوب صدقہ میں پڑھیں۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کے مطابق ہیں جو حضرت ابوبکرؓ سے مروی ہیں اور ان روایتوں سے

---

[1] یہ لفظ مُصَدِّق بھی اسی معنی میں ہوتا ہے۔

بھی جو حضرت عمرؓ کے مکتوب صدقہ سے ابوبکر بن عبید اللہ نے اور ابن عمرؓ سے نافع نے بیان کی ہیں۔

(۱۰۵۹) ابن شہاب کہتے ہیں کہ عمر بن عبد العزیزؒ نے مذکورہ بالا جملہ امور اپنے مکتوب میں تحریر کیے تھے۔

مویشیوں کے اشتراک یا انفصال کے لئے شرائط

(۱۰۶۰) ابن لہیعہ کہتے ہیں کہ مجھے یحییٰ بن سعید نے اپنے خط میں لکھا کہ انہوں نے سائب بن یزید کو یہ کہتے سنا: میں ایک زمانہ تک سعد بن ابی وقاص کی صحبت میں رہا اور میں نے انہیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث کے سوا کوئی حدیث روایت کرتے ہوئے نہ سنا، انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "زکوٰۃ میں یکجا (جانوروں) کو جدا جدا نہیں کیا جائے گا اور جدا جدا کو اکٹھا نہیں کیا جائے گا اور شریکوں کو اس وقت شریک مانا جائے گا جب ان کے جانوروں میں (نسل کشی کا) نر، چراگاہ اور گھاٹ مشترک ہوں۔

ابو عبیدؒ: فقہاء نے جدا جدا جانوروں کو یکجا کرنے اور یکجا جانوروں کو جدا جدا کرنے کی تفسیر کرتے ہوئے قدیم زمانہ میں بہت کچھ کہا ہے ان میں سے قابل ذکر اوزاعیؒ، سفیانؒ، مالک بن انسؒ اور لیث ابن سعد ہیں۔

(۱۰۶۱) شعیب کہتے ہیں کہ اوزاعی نے "یکجا جانوروں کو جدا جدا نہیں کیا جائے گا" کی تفسیر کرتے ہوئے کہا: صدقہ وصول کرنے والے کو تین ایسے شریکوں سے جن میں سے ہر ایک کی چالیس چالیس بکریاں ہوں۔ مجموعی طور پر (اس گلہ سے) ایک بکری سے زیادہ وصول نہیں کرنا چاہئے۔ وہ اس مجموعہ کو تین جدا جدا حصوں کو تقسیم کرکے ہر چالیس پر ایک بکری (کل تین بکریاں) نہیں لے گا۔ پھر وہ "جدا جدا جانوروں کو یکجا نہیں کیا جائے گا" کی تفسیر کرتے ہوئے کہتے ہیں: "ایسی صورت میں کہ (ان تینوں میں سے) ہر شخص کی جداگانہ چالیس چالیس بکریاں ہوں ان مالکوں کے لئے

یہ درست نہیں ہو گا کہ وہ انہیں یکجا کر لیں تاکہ محصلِ صدقہ انہیں یکجا پا کر ان سے ایک ہی بکری وصول کرے۔ جبکہ صدقہ میں ان پر تین بکریاں فرض ہوتی ہیں۔ یہ اوزاعی کا قول ہے۔

(۱۰۶۲) مالک بن انس "جدا جدا جانوروں کو یکجا نہیں کیا جائے گا۔" کی تفسیر میں اوزاعی سے پورا اتفاق کرتے ہیں۔ لیکن پہلے جملہ کی توجیہہ میں اختلاف کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

(۱۰۶۳) "اکٹھے جانوروں کو جدا جدا نہیں کیا جائے گا۔" کی صورت یہ ہو گی کہ جیسے دو شریکوں کی دو سو ایک بکریاں ہوں۔ اندریں صورت انہیں تین بکریاں دینا پڑیں وہ انہیں اس طرح دو حصوں میں بانٹ دیں کہ ان میں سے ہر شریک کو ایک ایک بکری ہی دینا پڑے۔" یہ مالک کا قول ہے۔

(۱۰۶۴) سفیان بن سعید سے ہمارے اصحاب نے جو روایت کی ہے اور وہی ان کی معروف رائے ہے اس میں وہ "جدا جدا جانوروں کو یکجا نہیں کیا جائے گا۔" کے بارے میں بغیر اختلاف اوزاعی سے متفق ہیں۔

(۱۰۶۵) لیکن "اکٹھے جانوروں کو جدا جدا نہیں کیا جائے گا۔" کی صورت میں وہ یہ بتاتے ہیں کہ کسی آدمی کی ایک سو بیس بھیڑ بکریاں ہوں تو صدقہ وصول کرنے والے کو یہ روا نہ ہو گا کہ وہ ان کو تین ٹکڑوں میں بانٹ کر ہر چالیس پر ایک بکری کے حساب سے (تین بکریاں) لے، بلکہ وہ تمام مجموعی ریوڑ پر ایک بکری لے گا اس لئے کہ وہ ایک انسان کی ملکیت ہیں، یہ سفیان کا قول ہے اور اس پر اہلِ عراق کا عمل ہے۔

(۱۰۶۶) لیث بن سعد "یکجا جانوروں کو جدا جدا نہیں کیا جائے گا۔" کی صورت یہ بتاتے ہیں کہ دو شریکوں کی چالیس بکریاں ہوں تو زکوٰۃ کے لئے انہیں جدا جدا نہیں کیا جائے گا بلکہ ان پر مجموعی طور سے ایک بکری لی جائے گی۔ کیونکہ وہ دونوں شریک ہیں۔

ابو عبید: جہاں تک میرا خیال ہے انہوں نے "جدا جدا جانوروں کو جمع نہیں کیا جائے گا" کی تفسیر میں دوسروں سے اتفاق کیا ہے اس طرح گویا اوزاعی سفیان، مالک اور لیث چاروں "جدا جدا جانوروں کو یکجا کرنے" کی تفسیر میں متفق ہیں اور "یکجا جانوروں کو جدا جدا کرنے میں باہمدگر اختلاف کرتے ہیں:

تنہا مالک اس طرف گئے ہیں کہ ان ہر دو ممانعتوں سے مویشیوں کے مالکوں کو منع کیا گیا ہے۔

لیکن دوسروں کی تفسیر کے مطابق ان دونوں ممانعتوں میں سے ایک ممانعت تو مویشیوں کے مالک کے لئے ہے اور دوسری صدقہ وصول کرنے والے سے متعلق۔

میری نظر میں صحیح توجیہہ وہی ہے جس پر اکثریت نے اتفاق کیا ہے اس لئے کہ جس طرح صدقہ وصول کرنے والے کی زیادتی سے بے خوف نہیں رہا جا سکتا اسی طرح مویشیوں کے مالکوں سے بھی مستبعد نہیں کہ وہ صدقہ بچانے کی کوشش کریں۔ لہذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کے لئے ہدایات جاری فرمائیں۔

سوید بن غفلہ کی حدیث (نمبر ۱۰۵۲) میں یہ نکتہ اُبھر کر سامنے آگیا ہے جس میں وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بھیجے جانے والے محصل صدقہ کی زبانی کہتے ہیں: میرے عہد نامہ (فرائض منصبی) میں ہے کہ میں یکجا جانوروں کو جدا جدا نہ کروں اور نہ جدا جدا جانوروں کو یکجا کروں۔"

اسی طرح اگلی روایت کے الفاظ "صدقہ (لگنے یا بڑھنے) کے ڈر سے" واضح کر رہے ہیں کہ یہ "نہی" مویشیوں کے مالکوں کے لئے ہے۔

ایسی صورت میں جبکہ مویشی دو شریکوں کے درمیان منقسم ہوں اس کی توجیہہ اور اس مسئلہ سے متعلق فتویٰ اہلِ حجاز اور اہلِ عراق و شام میں اختلاف ہے اور اس کی شرح و تفسیر میں کئی روایات آئی ہیں:

اشتراک کی شرائط

(۱۰۶۷) ابن لہیعہ کہتے ہیں کہ یحییٰ بن سعید نے مجھے لکھا کہ انہوں نے سائب بن یزید سے حضرت سعدؓ کے واسطہ سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ روایت سنی: "شریک وہ ہیں جن کے مویشی، (نسل کشی کے) نر چراگاہ اور گھاٹ میں ملے جلے رہیں۔

ابو عبیدؒ: ہر وہ روایت جو ابنِ لہیعہ یحییٰ سے کریں وہ اس مکتوب پر مبنی ہے جو یحییٰ نے انہیں لکھا تھا۔

(۱۰۶۸) عبداللہ بن صالح لیث سے اور وہ یحییٰ بن سعید سے راوی ہیں کہ دو شریک وہ ہوں گے جو چراگاہ، گھاٹ اور (نسل کشی کے) نر میں اکٹھے رہیں۔

(۱۰۶۹) محمد بن شعیب کہتے ہیں کہ میں نے اوزاعی کو یہ کہتے ہوئے سُنا: جب مویشی ایک چرواہے ایک (نسل کشی کے) نر اور ایک باڑے میں اکٹھے رہیں تو ان کے مالک شریک کہلائیں گے۔

(۱۰۷۰) مالک بن انس کہتے ہیں: مویشیوں میں شریک وہ کہلائیں گے جن کے مویشیوں کا ایک چرواہا ہو۔ ایک (نسل کشی کا) نر ہو۔ اور ایک باڑا ہو، اونٹوں میں بھی انہی شرائط پر شریک ملنے جائیں گے۔

ابو عبید: یہ اہل حجاز و اہل شام کا قول ہے کہ صدقہ وصول کرنے وقت شریکوں کے (مال) مویشیوں کو اکٹھا رکھا جائے گا۔

اداشدہ زکوٰۃ میں شرکاء اپنے مال کے مطابق حصہ دار ہوں گے بشرطیکہ ہر شریک بقدر نصاب رکھتا ہو

(۱۰۷۱) اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر دو شریکوں کے پاس اسّی بکریاں ہوں یا تین کے پاس ایک سو بیس بکریاں ہوں اور ان کے جانور چراگاہ، نر اور گھاٹ میں اکٹھے رہتے ہوں تو ان سب جانوروں پر ان سب کے نزدیک ایک ہی بکری لی جائے گی اور ان میں سے ہر ایک شریک اپنی بکریوں کی تعداد کے مطابق اس ایک بکری

کی قیمت میں حصہ دار ہوگا۔

یہ ہے ان حضرات کے نزدیک رسول اللہؐ کے ان ارشادات کا مفہوم کہ "اکٹھے جانوروں کو الگ الگ نہیں کیا جائے گا۔" نیز "دونوں شریک اپنے اپنے حصے باہمدگر انصاف و برابری کے اصول پر سمجھ لیں گے۔"

سفیانؒ اور اہلِ عراق کا اختلاف

لیکن ان کی مذکورہ بالا شرح و تفصیل سے سفیان اور اہلِ عراق نے اختلاف کرتے ہوئے کہا ہے۔

(۱۰۷۲) اکٹھے جانوروں کو جدا جدا کرنا، اور جدا جدا کو یکجا کرنا، بربنائے ملکیت ہوگا نہ بربنائے اختلاط و اشتراک، چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ دو شریکوں کی اسّی بکریوں پر دو بکریاں اور تین شریکوں کی ایک سو بیس بکریوں پر تین بکریاں (زکوٰۃ میں) لی جائیں گی۔

ابو عبیدؒ: ہماری رائے کے مطابق اس باب میں پہلی جماعت کی تاویل صحیح ہے اور اس بارے میں ہمارا دارومدار مذکورہ بالا ابن لھیعہ والی مرفوع روایت پر ہے جس میں شرکت کی تفصیل بتاتے ہوئے چراگاہ، گھاٹ اور نر میں اشتراک کی شرط رکھی گئی ہے اور اسی رائے کو یحییٰ بن سعید، اوزاعی، مالک اور لیث کی تفاسیر کی بھی تائید حاصل ہے۔

اور اس جملہ تفصیل کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو معاویہ بن حیدہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

(۱۰۷۳) بہز بن حکیم بن معاویہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا: (افزائش نسل کے لئے) چرنے والے ہر چالیس اونٹوں پر ایک تیسرے سال میں لگنے والی اونٹنی (بنت لبون) لی جائے گی۔ اس حساب سے گریز کرنے کے لئے انہیں

جُدا جُدا نہیں کیا جائے گا۔[1]

ابو عبیدؒ: اس بنا پر اگر چالیس اونٹ آٹھ شریکوں کے ہوں اور ان میں سے ہر ایک کے پانچ پانچ اونٹ ہوں تو جو شخص ملکیت کا حساب ملحوظ رکھے گا اس کے نزدیک فی کس ایک بکری کے حساب سے ان اونٹوں پر آٹھ بکریاں واجب ہوں گی۔ لیکن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا فرمان یہ ہے۔ "ہر چالیس پر ایک تیسرے سال میں لگنے والی اونٹنی لی جائے گی۔ اس حساب سے بچنے کے لئے انہیں جدا جدا نہیں کیا جائے گا۔" اب آپ ہی بتایئے کہ جدا جدا کر کے مذکورہ عمر کی اونٹنی لینے کے بجائے بکریاں لینے سے بھی زیادہ کوئی بدتر شکل ہو گی ؟ حالانکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنی حدیث میں ایک فرد یا زیادہ افراد کی مشترکہ ملکیت کی کوئی شرط نہیں لگا رہے بلکہ آپؐ نے تو اونٹوں کی مجموعی تعداد بیان فرما دی ہے۔ دراصل جو حضرات ملکیت کے تناسب کو مدنظر رکھتے ہیں انہوں نے ان مویشیوں کو سونے، چاندی، غلہ اور پھلوں سے مشابہت کی بنا پر ایسا کہا ہے۔ حالانکہ سنت میں دیگر اشیاء کے برخلاف مویشیوں کے لئے خصوصی احکام آئے ہیں، چنانچہ آپؐ نے دیکھ لیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مویشیوں کے علاوہ اور کسی مال میں خصوصی طور پر یہ شرط نہیں رکھی کہ انہیں جدا جدا کو یکجا نہ کیا جائے اور یکجا کو جدا جدا نہ کیا جائے اور یہ کہ شرکا رباہمدگر برابری سے اپنی حساب فہمی کر لیں۔ اب اگر ان مویشیوں کے قواعد دیگر اشیاء کے مطابق کر دیئے جائیں تو آپؐ کی یہ شرط لغو اور آپؐ کا مسنون طریقہ بے معنی ہو جائے گا۔

اور کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ آپؐ کی سنت کے اس فرمان کو بے کار کر دے۔ نہ سنتوں کا آپس میں ایک دوسری پر قیاس کیا جاتا ہے۔ بلکہ ہر سنت

---

[1] ابو داؤد اور نسائی میں اس کے آگے یہ الفاظ ہیں "جو خدا سے اجر چاہتے ہوئے یہ اونٹنی دیدے گا تو وہ اپنا بدلہ پائے گا اور جو انکار کرے گا تو ہم اس سے یہ وصول کر لیں گے، اور اس کا نصف مال بطور جرمانہ ضبط کر لیا جائے گا اللہ عزوجل کے جرمانوں میں، آل محمد کو اس میں سے کچھ نہیں ملے گا۔ (از حاشیہ)

اپنی مخصوص شکل میں زیر عمل لائی جاتی ہے۔

اب تک ہم نے شریکوں کے متعلق جو کچھ نقل کیا ہے اس تمام بحث کا تعلق ایسی صورت سے ہے جس میں ہر شریک کم از کم چالیس یا اس سے اوپر بکریوں کا مالک ہو۔

ادائیٔ زکوٰۃ کے سلسلہ میں اس شریک کا مسئلہ جس کے پاس چالیس سے کم بکریاں ہوں

(۱۰۷۴) لیکن اگر صورت یہ ہو کہ دونوں میں سے ایک شریک چالیس بکریوں سے کم کا مالک ہو تو اوزاعی سفیان اور مالک بن انس کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اس پر کوئی زکوٰۃ واجب نہ ہو گی۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ زکوٰۃ اس دوسرے شریک پر واجب ہو گی جو چالیس یا اس سے زائد بکریوں کا مالک ہے اور اسے اپنے دوسرے ساتھی سے کسی معاملہ فہمی یا لین دین کی ضرورت باقی نہیں رہیگی۔

۱۰۷۵ - ان حضرات کی مخالفت کرتے ہوئے لیث بن سعد کہتے ہیں: اگر دو شریکوں کی بکریوں کی مجموعی تعداد چالیس ہو جائے تو ان دونوں کے ذمے ایک بکری واجب ہو جائے گی۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان "یکجا جانوروں کو جدا جدا نہیں کیا جائیگا" کا یہی مفہوم ہے، اور اس زکوٰۃ میں دی ہوئی بکری کی قیمت کو وہ اپنی اپنی بکریوں کی تعداد کے تناسب سے باہم تقسیم کریں گے۔

شرکاء کے درمیان حساب فہمی کی مختلف توجیہات

ابو عبیدؒ: - اس کے معنے یہ ہوں گے کہ اگر ان میں سے ایک کی تیس بکریاں ہوں اور دوسرے کی دس، تو ان بکریوں پر دونوں کے ذمے ایک بکری واجب ہو گی اور وہ آپس میں اپنا اپنا حساب سمجھ لیں گے۔ صورت یہ ہو گی کہ دس بکریوں والا تیس بکریوں والے کو بکری کی چوتھائی قیمت دے گا تاکہ یہ

واضح ہو جائے کہ اپنے مویشیوں کے تناسب سے اس پر چوتھائی قیمت واجب تھی۔ اور دوسرے پر تین چوتھائی (۳/۴) قیمت۔ اب اگر زکوٰۃ میں دی ہوئی بکری دس بکریوں والے کی بکری ہو تو وہ تیس بکریوں والے سے (۳/۴) قیمت لے گا اور اگر تیس بکریوں والے کی ہو تو وہ دس بکریوں والے سے (۱/۴) قیمت لے گا۔ یہ ہے لیث کا مسلک۔ ان کی نظر میں فرمانِ رسول اللہؐ " دو شریک اپنا باہمی حساب برابری کے اصول پر طے کریں گے " کا یہی مفہوم ہے۔

(۱۰۷۶)۔ اوزاعی اور مالک نے اس فرمانِ رسولؐ کے معنے یہ سمجھے ہیں کہ حساب فہمی کی ضرورت اس وقت ہوگی جب کہ ان میں سے ہر شریک کی ملکیت میں چالیس یا اس سے زائد بکریاں ہوں۔ اور اس کی مثال یہ ہوگی کہ جیسے دو شریکوں کی سو بکریاں ہوں، ایک کی ساٹھ اور دوسرے کی چالیس، تو ان بکریوں پر ان دونوں حضرات کے قول کے مطابق ایک بکری واجب الادا ہوگی اور چالیس بکریوں والے کے ذمے بکری کی قیمت کا ۲/۵ حصہ اور ساٹھ بکریوں والے کے ذمے ۳/۵ حصہ ہوگا۔

(۱۰۷۷)۔ سفیان اور اہلِ عراق کا ان ہر دو مسائل میں بالکل جدا قول ہے۔ وہ کہتے ہیں، دو شریکوں کے درمیان جن کی مجموعی بکریاں چالیس ہوں، ان میں سے کسی کو ان پر زکوٰۃ نہیں دینا ہوگی۔ اس طرح اس مسئلہ میں انہوں نے لیث کی مخالفت کی۔

پھر وہ کہتے ہیں کہ دو شریکوں کی سو بکریوں پر دو بکریاں (زکوٰۃ میں) واجب ہوں گی ایک بکری چالیس کا مالک دے گا اور دوسری بکری ساٹھ کا مالک۔ اور انہوں نے شریکوں کی باہمی حساب فہمی کا ذکر چھوڑ دیا۔ اس طرح اس باب میں انہوں نے اوزاعی اور مالک سے اختلاف کیا۔

ابو عبیدؒ: اب میں ان دونوں مسلکوں میں سے ہر ایک کی تفصیل بیان کروں گا۔ ان شاء اللہ

اوزاعی اور مالک نے (دو شریکوں کی) چالیس یا اس سے کم بکریوں کے مسئلہ

کو بلحاظ ملکیت دیکھا ہے اور مویشیوں کے اختلاط و اشتراک کو مدِنظر نہیں رکھا۔ لیکن چالیس سے زیادہ تعداد کو اُنہوں نے اختلاط و اشتراک کے لحاظ سے دیکھا ہے، اور اس میں ملکیت ملحوظ نہیں رکھی اور اس قول میں بعض امور قابلِ غور ہیں۔

لیکن اہلِ عراق نے یہ مسئلہ از اوّل تا آخر بلحاظِ ملکیت دیکھا ہے اور وہ (مویشیوں کے) اختلاط و اشتراک کو ملحوظ نہیں رکھتے۔ لیکن اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت اور قولِ عمر بن الخطاب رضؓ کی رعایت نہیں ہوتی جس میں وہ شریکو کو باہمی حساب فہمی کے لئے کہہ رہے ہیں۔ اور کسی کو ترکِ سنّت کا حق حاصل نہیں ہے۔

جہاں تک لیث کا قول ہے میرے نزدیک وہ دو شریکوں والی باہمدگر حساب فہمی والی حدیث کا اتباع کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ان کے قول کے اجزاء باہمدگر ہم آہنگ ہیں اور تھوڑی یا زیادہ ملکیت کو مدِنظر نہ رکھنے، اور چالیس یا اس سے زائد (مویشیوں) کے اختلاط و اشتراک پر اعتماد کرنے کے باوجود ان کا قول تضاد سے پاک ہے۔

(۱۰۷۸) ان کے قول کو حضرت عمر رضؓ کی بکریوں کی زکواۃ والی وہ روایت اور حسن بخشتی ہے جس میں انہوں نے حکم دیا ہے کہ چھوٹے بچے بھی اس بناء پر گنے جائیں کہ (مالکوں کے پاس) جننے والی، دودھ کے لئے پالی جانے والی (نسل کشی کا) نر، اور گوشت (کھانے کے لئے پالی جانے) والی بکری چھوڑ دی جاتی ہیں۔ بناء بریں ان کا خیال تھا کہ جس طرح مالکان کو رعایات دی ہیں اسی طرح ان پر سختی بھی ہونا چاہیئے۔

لیث —— یا ان کے مویدین —— کا کہنا ہے کہ اسی طرح ان دو شریکوں پر جن کے پاس چالیس بکریاں ہو جائیں سختی لازم ہے اور ان پر زکواۃ عائد کی جائے جیسے کہ دوسری طرف انہیں سہولت ہے کہ وہ مزید اسّی بکریوں تک ایک ہی بکری دیتے رہیں۔ اسی طرح ان تین شریکوں کا حال ہے جن کے پاس ایک سو بیس

بکریاں ہوں کہ وہ ان پر ایک ہی بکری دیں گے اور ان میں سے ہر شریک بکری کی قیمت کا تہائی (⅓) حصہ اپنے ذمہ لے گا چنانچہ ایک طرف یہ آسانی ہے جس کے مقابلے میں دوسری طرف وہ سختی ہے۔

اس باب میں طاوس و عطاء سے ان جملہ اقوال سے جُداگانہ قول مروی ہے:

شریک کی تعریف

(۱۰۷۹) عمرو بن دینار روایت کرتے ہیں کہ طاوس نے کہا: "اگر دو شریک اپنے اپنے مویشیوں کو جانتے پہچانتے ہوں تو زکواۃ میں انہیں اکٹھا نہیں رکھا جائے گا۔"

وہ کہتے ہیں کہ جب میں نے عطاء سے یہ بات کہی تو اُنہوں نے کہا: "جہاں تک میرا خیال ہے یہ ٹھیک ہے۔"

ابو عبیدؒ:۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی چالیس بکریاں جو دو مالکوں کی ہوں۔ ان دونوں حضرات کے قول کے بموجب اگر وہ بکریاں غیر منقسم اور باہمد گر اس طرح ملی جُلی ہوں کہ انہیں جُدا کرنا ممکن نہ ہو تو (مجموعی طور پر) دونوں مالکوں سے زکواۃ لی جائے گی۔ اس لئے کہ ایک شریک کے مال کا دوسرے کے مال سے امتیاز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اگر دونوں کے مویشی باوجود مشترک و مخلوط

خلیط و شریک کا فرق

ہونے کے ایک دوسرے سے پہچان کر الگ کئے جا سکیں تو ان دونوں میں سے کسی پر بھی زکواۃ واجب نہیں ہوگی۔ اس طرح ہر دو حضرات نے خلیطوں[۱] اور شریکوں کی تعریف میں فرق کر دیا۔ اور میرے علم میں آج کل اس قول کا کوئی قائل موجود نہیں۔

(۱۰۸۰) ابو عبیدؒ:۔ مذکورہ بالا جملہ اقوال کے علاوہ بھی بعض اہلِ عراق سے یہ ایک قول اور منقول ہے "دو خلیطوں سے مراد وہ دو شریک ہیں جو اپنے مجموعی مال میں اس طرح شریک ہوں کہ ان میں سے ایک دوسرے کے مال کو پہچان کر الگ نہ کر سکے مثلاً

---

[۱] ۔ خلیط سے مُراد ہے ایسے شریک جن کا مال اس طرح یکجا ہو کہ اسے الگ الگ نہ کیا جا سکے اور شریک وہ ہوں گے جن کے مال باہم اس طرح ملے ہوں کہ انہیں جُدا جُدا کیا جا سکے۔

دو شخص مجموعی طور پر ایک سو بیس بکریوں کے مالک ہوں ایک کی دو تہائی اور دوسرے کی ایک تہائی بکریاں ہوں اور وہ اس طرح ملی ہوئی ہوں کہ ان کو پہچان کر علیحدہ نہ کیا جا سکے تو زکواۃ وصول کرنے والا ان میں سے دو بکریاں لے گا۔ اب دو تہائی بکریوں کا مالک اس بناء پر کہ وہ اسی بکریوں کا مالک ہے تہائی بکریوں کے مالک کی طرف رجوع کرے گا اس لئے کہ اس کی ملکیت چالیس بکریاں ہیں، اور وہ اس سے تین بکریاں[1] لے گا۔ اس طرح کہ وہ اس سے کہے گا کہ میرے مویشیوں میں سے ایک بکری اور ایک تہائی بکری لی گئی ہے اور تجھ سے دو تہائی بکری لی گئی ہے۔ حالانکہ جتنی زکواۃ تجھ پر واجب ہے ٹھیک اتنی ہی مجھ پر بھی واجب ہے۔ یعنی ایک بکری تجھ پر واجب ہے اور ایک مجھ پر۔ چنانچہ وہ ساجھی اس پر (بکری کی) تہائی (قیمت) پلٹا دے گا۔

---

[1] - یہاں اصل میں "ثلاث شیاہ" ہے۔ اغلباً یہ عبارت "ثلث شیاہ" ہے یعنی بکریوں کی تہائی قیمت۔
———— واللہ اعلم

باب

محصّلِ زکوٰۃ کو اپنے کام کی انجام دہی میں عدل سے متعلق کن امور کا خیال رکھنا چاہیئے نیز عدل سے کام لینے پر فضیلت اور زیادتی و ظلم پر گناہ کا بیان

محصلِ زکوٰۃ کو حق کے ساتھ فرض انجام دینے کی ہدایت

(۱۰۸۱) رافع بن خدیجؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: "حق کے ساتھ زکات وصول کرنے والا جب تک اپنے فرائض ادا کر کے واپس نہ ہو جائے، راہِ خدا میں جہاد کرنے والے کی طرح ہے۔"

سختی اور ظلم کی ممانعت

(۱۰۸۲) انس بن مالکؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: "زکواۃ (وصول کرنے) میں زیادتی وظلم کرنے والا ایسا ہی ہے جیسے زکواۃ روکنے والا۔"

(۱۰۸۳) حسنؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: "زکواۃ (وصول کرنے) میں زیادتی وظلم کرنے والا ایسا ہی ہے جیسے زکواۃ روکنے والا۔"

(۱۰۸۴) ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے معاذؓ کو یمن

بھیجتے وقت اُن سے فرمایا: "میں تمہیں اہلِ کتاب کی طرف بھیج رہا ہوں، تم انہیں دعوت دینا کہ وہ لا الٰہ الا اللہ (ایک اللہ کے سوا کسی الٰہ کو نہ ماننے) کی شہادت دیں۔ اگر وہ تمہاری دعوت کو قبول کرلیں تو ان کو بتانا کہ ان پر ہر روز وشب میں پانچ نمازیں فرض ہیں۔ پھر اگر وہ انہیں بھی قبول کرلیں تو انہیں بتانا کہ انہیں ان کے اموال پر زکوٰۃ دینا ہوگی۔ پھر اگر وہ اس کا بھی اقرار کرلیں تو ان سے (زکوٰۃ) وصول کرنا۔

لوگوں کے عمدہ وپسندیدہ اموال لینے کی ممانعت

اور دیکھو لوگوں کے عمدہ وپسندیدہ اموال کو ہاتھ نہ لگانا اور رنجیدار مظلوم کی پکار سے بچتے رہنا۔ اس لئے کہ اس کی پکار کے اللہ تک پہنچنے میں کوئی حجاب نہیں ہوتا۔

(۱۰۸۵) عروۃ رض کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ایک محصل زکوٰۃ بھیجا تو اس سے فرمایا: "لوگوں کے محبوب ودل پسند مال میں سے کچھ نہ لینا۔ ان سے زکوٰۃ میں معمر اونٹ یا نوعمر اونٹ یا عیب دار اونٹ لے لینا۔" راوی کہتے ہیں کہ وہ محصل روانہ ہوکر کسی عرب کے پاس پہنچا تو اس (عرب) نے کہا: "میرے پاس تیرے سوا اللہ کے لئے مانگنے والا کوئی سائل نہیں آیا۔ تجھے ان جانوروں میں سے بہترین ہی ملے گا۔" اس محصل نے اس واقعہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلّم سے بیان کیا تو آپ صلعم نے اس (عرب) کے حق میں دعا فرمائی۔

ابوعبید رح:- اس روایت میں معمّر اونٹ اور عیب دار جانور لے لینے کی اجازت ہے، حالانکہ تمام روایت میں ان دونوں اقسام کو مکروہ قرار دیا گیا ہے۔ میری نظر میں اس حدیث کی اس کے سوا کوئی توجیہ نہیں کہ ممکن ہے آغازِ اسلام میں جب لوگوں کو زکوٰۃ ادا کرنے میں بوجھ محسوس ہوتا تھا یہ رعایت کی گئی ہو۔ اور جب مسلمان قلبی میلان اور حسنِ نیّت کے ساتھ اسلام پر عمل پیرا ہوگئے تو پھر زکات اپنے معینہ دستور کے مطابق نافذ ہوگئی۔ اور مذکورہ دستور کے مطابق زکوٰۃ میں وہی چار عمروں کے اونٹ لئے جانے لگے اور انہیں معمّر اور عیب دار جانور زکوٰۃ میں دینے سے منع کردیا گیا۔ اس کی تائید میں متواتر احادیث موجود ہیں۔

(۱۰۸۶) قاسم بن محمد سے روایت ہے کہ حضرت عمر رض کے سامنے سے زکوٰۃ میں ادا

کی ہوئی بھیڑ بکریاں گذریں تو انہوں نے اس ریوڑ میں ایک موٹے تھنوں والی بکری دیکھی اور کہا: "میرا خیال ہے کہ اس کے مالک نے بخوشی اسے نہیں دیا ہوگا۔ خبردار! مسلمانوں کی پسند کی چیزیں نہ لیا کرو۔"

(۱۰۸۷) یحییٰ نے اپنی روایت میں مذکورہ بالا الفاظ میں اتنا اضافہ کیا ہے: "لوگوں کو آزمائش میں نہ ڈالو۔ کھانے[5] سے بچتے رہو۔"

(۱۰۸۸) یہی روایت حضرت عائشہ رضؓ نے بھی حضرت عمر رضؓ سے روایت کی ہے۔

مویشیوں کی زکوٰۃ لینے کا طریقہ

(۱۰۸۹) محمد بن یحییٰ کہتے ہیں کہ اشجع (قبیلہ) کے دو بزرگوں نے اسے بتایا کہ حضرت عمر رضؓ نے محمد بن مسلمہ کو زکواۃ کا محصل بنا کر بھیجا۔ چنانچہ (وہ) محمد ہمارے پاس آتے اور بیٹھتے۔ ان کے پاس جب بھی ہماری طرف سے کوئی ایسی بکری پہنچتی جس سے ان کا حق پورا ادا ہو جاتا، تو وہ اسے (زکواۃ میں) قبول کر لیتے تھے۔

(۱۰۹۰) قبیلہ کنانہ کے سعر الدیلی کہتے ہیں کہ میں اپنی بھیڑ بکریوں میں تھا کہ ایک اُونٹ پر دو سوار مرد میرے پاس آئے۔ میرا خیال ہے کہ ان میں سے ایک انصاری تھا۔ ان دونوں نے کہا: "ہمیں وصولی صدقہ کے لئے رسول اللہ ﷺ نے بھیجا ہے۔" اس پر میں نے کہا: "اور "صدقہ" کیا ہوتا ہے؟" ان دونوں نے کہا: "تمہاری بھیڑ بکریوں میں سے ایک بکری (یا بھیڑ)۔" چنانچہ میں نے اُٹھ کر ان دونوں کے لئے ایک عمدہ نسل کی بہت دودھ دینے والی بکری نکالی۔ وہ دونوں بولے: "ہمیں ایسے جانور لینے کا حکم نہیں ملا ہے۔" تب میں ایک قریب الولادت بکری لایا۔ انہوں نے: "ہمیں اس کا حکم نہیں ملا ہے۔ ہمیں حاملہ لینے کا بھی حکم نہیں ہے اور نہ دودھ دینے والی کا۔" پھر میں نے ایک بکری لی جو دوسرے یا تیسرے برس میں ہو گی جسے انہوں نے قبول کر لیا اور اسے اپنے سامنے رکھ کر انہوں نے میرے لئے برکت کی دُعا کی اور پھر چلے گئے۔

---

[5] یہاں عربی لفظ طعام ہے جس کے معنے "غلہ، کھانا" ہیں۔ یہاں اس سے مراد واجبات سے زائد وصول کرنا اور رشوت لینا بھی ہو سکتے ہیں۔ اگر یہ لفظ "غ" سے طغام ہو تو اس کے معنے فضول بات اور بیہودہ آدمی ہوں گے۔

(۱۰۹۱) ابو عبیدؒ:- میں نے ہُشیم کو ابو وائل سے ایک حدیث بیان کرتے سُنا ہے۔ وہ کہتے ہیں: "ہمارے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا محصّلِ زکواۃ پہنچا۔ وہ ہر پچاس اونٹوں پر ایک اونٹنی لیتا تھا۔" میں اس کے پاس ایک مینڈھا لایا اور میں نے کہا: "اس کی بھی زکواۃ لے لو۔" تو اُس نے کہا: "اس پر کوئی زکواۃ نہیں ہے۔"

ابو عبیدؒ:- ہشیم نے ابو وائل سے پہلے ایک شخص کا نام لیا تھا جو میں اُن کی زبانی نہ سمجھ سکا۔ پھر میں نے دوسروں سے اس نام کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ نام "مُغیرہ" تھا۔

(۱۰۹۲) عطاء بن ابی رباح کہتے ہیں کہ فتح مکہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: "اسلام میں نہ جَلَب[1] ہے نہ جَنَب[2] اور نہ شِغار[3]۔ اور (مسلمانوں کے مویشیوں) کی زکات ان کے گھاٹوں اور (ان کے مکانوں سے ملے ہوئے باڑوں میں لی جائے گی۔"

ابو عبیدؒ:- جَلَب کے دو معنے کئے گئے ہیں۔ ایک تو گھڑ دوڑ سے متعلق ہے جس کا مطلب یہ ہوگا کہ گھوڑے کو تیز دوڑانے کے لئے شور مچانا۔ دوسرے کا تعلق مویشیوں کی زکواۃ سے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ محصّلِ زکواۃ کو یہ نہیں چاہیئے کہ وہ کسی ایک جگہ پر پڑاؤ ڈال لے اور مویشیوں کے مالکان کو حکم دے کہ اپنے اپنے جانوروں کو لے کر وہاں پہنچیں اور پھر وہ ان سے زکواۃ وصول کرے۔ بلکہ اس کا فرض ہے کہ وہ مویشیوں کے گھاٹوں پر پہنچ کر وہاں ان کی زکواۃ وصول کرے۔ یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشاد "ان کے گھاٹوں اور ان کے مکانوں سے ملے ہوئے باڑوں میں" سے مترشح ہوتا ہے۔

اور ایسی ہی روایت عمر بن عبدالعزیز سے بھی مروی ہے:-

---

[1] جَلَب سے مراد ہے محصّلِ زکواۃ کا کسی جگہ پڑاؤ ڈال کر وہاں زکواۃ دینے والوں کے جانوروں کو طلب کرنا۔ [2] جَنَب سے مراد ہے نصاب سے کم جانوروں کو زکواۃ وصول کرنے کے لئے دوسرے جانوروں میں ملانا یا پھر محصّلِ زکواۃ کو ستانے کے لئے جانوروں کے مالک کا جانوروں کو لے کر دُور چلا جانا۔ [3] شِغار آنٹے سانٹے کو کہتے ہیں یعنی دو شخصوں کا بغیر مہر کے ایک دوسرے کو اپنی اپنی زیر نگرانی عورت سے نکاح کرا دینا۔

(۱۰۹۳) عمر بن عبدالعزیز نے لکھا: "لوگوں سے ان کے گھاٹوں پر اور ان کی رہائش گاہوں سے ہٹے ہوئے باڑوں میں زکواۃ وصول کرو۔"

(۱۰۹۴) ابراہیم کہتے ہیں: "جب محصّلِ زکواۃ گھاٹ پر پہنچے تو وہ بھیڑوں بکریوں کو دو حصوں میں تقسیم کردے، پھر مالک کو اختیار دے (کہ ان میں سے ایک حصہ کو چُن کر الگ کرلے) پھر دوسرے حصہ میں سے زکواۃ (کے جانور) لے۔

(۱۰۹۵) یحییٰ بن سعید کہتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیز کے عاملوں کا صدقہ وصول کرنے میں یہ دستور تھا کہ وہ مویشیوں کو تین ٹکڑیوں میں بانٹ دیتے۔ پھر ان میں سے دو حصے مالک چُن کر علیحدہ کرلیتا۔ اور بقیہ تہائی حصّہ میں سے محصلِ صدقہ اپنا حق لیتا تھا۔

(۱۰۹۶) لیث کہتے ہیں کہ اسی دستور پر عمل ہوتا ہے۔

ابو عبید: حضرت عمر بن الخطابؓ سے بھی ایسی ہی روایت ہے:

(۱۰۹۷) جسے عبداللہ بن شہاب یا شہاب بن عبداللہ نے حضرت عمرؓ سے روایت کیا ہے۔

(۱۰۹۸) میمون بن مہران کہتے ہیں: زکواۃ میں نہ لاغر جانور لیا جائے گا نہ خارشتی، نہ عیب دار اور نہ ایسی لنگڑی جو ریوڑ کے ساتھ نہ چل سکے۔ راوی کہتا ہے کہ وہ ایسے جانور کو قربانی کے لئے بھی ناپسند کرتے تھے۔

باب

وہ پسندیدہ طرزِ عمل جس کا مظاہرہ محصلِ زکوٰۃ کی آمد پر مالکانِ مویشی کو کرنا چاہیئے

(۱۰۹۹) جریر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: "محصلِ زکوٰۃ جب تمہارے پاس سے واپس جائے تو وہ تم سے خوش ہو کر جائے۔"

(۱۱۰۰) جریر بن عبداللہ اپنے بیٹوں سے کہتے تھے: "میرے بیٹو! جب محصّلِ زکوٰۃ تمہارے پاس آئے تو اپنے چوپایوں میں سے کچھ بھی اس سے نہ چھپانا۔ اب اگر وہ تمہارے ساتھ انصاف کرتا ہے تو تمہارے لئے اور خود اپنے لئے بہتر کرے گا۔ اور اگر وہ تم پر زیادتی کرتا ہے تو یہ اُس کے حق میں بُری اور تمہارے لئے بہتر ہے۔ اور دیکھو جب وہ زکوٰۃ وصول کر چکے اور مویشی چلے جائیں، تو اس سے یاد کر کے یہ درخواست ضرور کرنا کہ وہ تمہارے لئے برکت کی دعا مانگے۔

(۱۱۰۱) مرثد (یا ابومرثد) اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ میں ابوذر رضؓ کے ساتھ جرۂ وسطیٰ کے پاس بیٹھا تھا کہ ایک شخص ان کے پاس آیا اور اس نے کہا: "ہمارے پاس فلاںؓ کے محصلینِ زکوٰۃ آئے ہیں اور انہوں نے ہم پر زیادہ زکوٰۃ لگائی ہے کیا جتنا انہوں نے زیادہ لیا ہے اسی اندازے سے میں ان سے مال چھپالوں؟" اس پر ابوذر رضؓ نے کہا: "ایسا نہ کرو، بلکہ ان کے سامنے اپنا تمام مال اکٹھا کر دو پھر ان سے کہہ دو، تمہارا اس میں سے جو حق ہو وہ لے لو اور جو ناحق ہو وہ چھوڑ دو۔ اس پر بھی اگر وہ تم پر زیادتی کریں گے تو

لہ مسند امام احمد کی ایک روایت (ج ۱ : ۱۴۱) سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد حضرت عثمان رضؓ ہیں۔

تمہاری زکوٰۃ اور جو کچھ انہوں نے زیادتی سے لیا ہے وہ سب روزِ قیامت تمہارے میزان میں ڈالی جائے گی۔

(۱۱۰۲) زاہر بن یربوع کہتے ہیں کہ ایک شخص حضرت ابوہریرہؓ کے پاس آیا اور اُس نے دریافت کیا: "کیا میں ان (محصلین زکوٰۃ) سے اپنے عمدہ و پسندیدہ مال کو پوشیدہ رکھ سکتا ہوں؟" تو انہوں نے کہا: "نہیں، جب وہ تمہارے پاس آئیں تو ان کی نافرمانی نہ کرو۔ اور جب وہ چلے جائیں تو انہیں گالیاں نہ دو۔ اس طرح تم نافرمانی کے مرتکب ہو کر ظالم پر ہونے والے عذاب کو ہلکا کر دو گے۔ تمہیں ان سے کہنا چاہیئے: "یہ میرا مال ہے اور اس پر یہ حق ہوتا ہے۔ تم حق لے لو اور ناحق چھوڑ دو۔ اب اگر وہ حق لے لیتے ہیں تو ٹھیک ہے اور اگر وہ اس سے ہٹ کر زیادتی کرتے ہیں تو وہ (حق و ناحق) دونوں، روزِ قیامت تیرے میزان میں یکجا کر دیئے جائیں گے۔

(۱۱۰۳) عمرو بن حُبشی کہتے ہیں کہ مجھ سے عبداللہ بن عمرو نے کہا: "اے عمرو بن حُبشی! اس وقت تم پر کیا گزرے گی جب محصلینِ صدقہ تم سے حق سے زائد مطالبہ کریں گے؟" پھر وہ بولے: "جو کچھ وہ تجھ سے مانگیں انہیں دے دینا ورنہ وہ تیرا سر اڑا دیں گے پھر تیرا سر اِدھر پڑا ہوگا اور دھڑ اُدھر۔ اور تمہارے بارے میں کوئی زبان بھی نہ ہلا سکے گا۔"

(۱۱۰۴) ابوالزبیر کہتے ہیں کہ میں نے جابر بن عبداللہ کو یہ کہتے سُنا: "جب تمہارے پاس محصّل زکوٰۃ آئے تو اسے اپنی زکوٰۃ دے دو۔ اور اس کے ساتھ کوئی احسان نہ جماؤ۔ اور زکوٰۃ کی وصولی کے سلسلہ میں جو کچھ وہ کرے اس کی ذمہ داری اُسی کو سونپ دو۔"

(۱۱۰۵) ابوہریرہؓ کے مولیٰ ابویونس کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے دو صحابیوں ابوہریرہؓ اور ابواسیدؓ کو یہ کہتے سُنا ہے: "لوگوں کا یہ فریضہ ہے کہ جب ان کے پاس محصلِ صدقہ آئے تو اُسے خوش آمدید

کہیں اور اسے اپنے تمام اموال سے باخبر کر دیں اور کوئی چیز بھی اس سے پوشیدہ نہ رکھیں۔ اب اگر وہ عدل سے کام لیتا ہے تو اس کی یہی راہ ہے اور اگر وہ اس سے ہٹ کر ظلم و زیادتی کرتا ہے تو وہ اپنا ہی بُرا کرے گا۔ اور اللہ (ان زکواۃ ادا کرنے والے) لوگوں کو بہتر بدلہ دے گا۔

باب

سونے اور چاندی کی زکوٰۃ اور اُس کے قواعد

سونے چاندی کا نصاب

(۱۱۰۶) محمد بن عبدالرحمٰن انصاری کہتے ہیں کہ زکات سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اور حضرت عمرؓ کے مکاتیب میں یہ درج ہے: سونے پر اس وقت تک کوئی زکواۃ نہیں لی جائے گی تا آنکہ وہ بیس دینار نہ ہوجائے۔ جب وہ بیس دینار ہوجائے تو اس پر نصف دینار لیا جائے گا۔ اور چاندی پر دوسو درہم ہونے سے پہلے کوئی زکواۃ نہیں لی جائے گی۔ جب دوسو درہم ہوجائے تو اس پر پانچ درہم لئے جائیں گے [1]

(۱۱۰۷) حضرت علیؓ سے مروی ہے: "ہر بیس دینار پر نصف دینار اور ہر چالیس دینار پر ایک دینار۔ اور ہر دوسو درہم پر پانچ درہم زکواۃ لی جائے گی۔

(۱۱۰۸) عکرمہ بن خالد کہتے ہیں کہ انہیں ابوبکر بن عبیداللہ نے اس صحیفہ کی ایک نقل لکھ کر بھیجی جو حضرت عمرؓ کی تلوار کے تھیلے سے بندھا تھا۔ اس میں درج تھا: چاندی میں سے چالیسواں حصّہ لیا جائے گا جبکہ کسی شخص کی چاندی کی مقدار پانچ

---

[1] - یہ حدیث ابوداؤد نے موقوف اور ترمذی نے مرفوع روایت کی ہے۔ امام شافعی نے الرسالہ میں "باب فی الزکاۃ" کے تحت لکھا ہے کہ رسول اللہؐ نے چاندی پر زکواۃ مقرر فرمائی اور آپؐ کے بعد مسلمانوں نے سونے پر زکواۃ لی۔ مسلمانوں نے ایسا یا تو کسی حدیث رسولؐ کی وجہ سے کیا تھا جو ہم تک نہیں پہنچی یا پھر چاندی پر قیاس کرتے ہوئے ایسا کیا تھا۔ ابن عبداللہ کہتے ہیں کہ ثقہ آحاد راویوں سے سونے کی زکواۃ کے سلسلہ میں حضورؐ سے کچھ ثابت نہیں۔ (از حاشیہ)

اوقیہ (یعنی دوسو درہم) ہو جائے۔

(۱۱۰۹) نافع کہتے ہیں کہ مذکورہ بالا عبارت حضرت عمرؓ کے زکواۃ نامہ میں ہے۔

(۱۱۱۰) لیث کہتے ہیں کہ مجھ سے نافع نے کہا کہ اُنہوں نے اس صحیفہ (کی نقل شدہ تحریر) کو کئی بار عبداللہ بن عمرؓ کو دکھایا تھا۔

(۱۱۱۱) مالک بن انس کہتے ہیں کہ اُنہوں نے حضرت عمرؓ کے زکواۃ نامہ میں مذکورہ بالا عبارت پڑھی۔

(۱۱۱۲) حضرت ابوبکر صدیقؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: "چاندی میں چالیسواں حصّہ لیا جائے گا۔"

ابوعبیدؒ:۔ بعض مرفوع احادیث میں سونے کا ذکر بھی آیا ہے:

(۱۱۱۳) عمرو بن شعیب اپنے باپ سے وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: "بیس مثقال سے کم سونے پر زکواۃ واجب نہیں ہوتی اور نہ دوسو درہم سے کم چاندی پر۔"

ابوعبیدؒ:۔ مسلمانوں میں اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں کہ جب کسی کے پاس شروع سال میں اتنی مقدار مالیت ہو جائے جس پر زکواۃ واجب ہو جاتی ہے۔ مثلاً دوسو درہم (چاندی)، بیس دینار (سونا)، پانچ اُونٹ، تیس گائیں، چالیس بکریاں

بقدر نصاب مال کا سال بھر تک مالک رہنے پر زکواۃ واجب ہو گی

بھیڑیں۔ تو ان اصناف میں سے کسی ایک کا شروع سال سے آخر تک مالک رہنے کی صورت میں تمام لوگوں کے قول کے مطابق اس مالک پر زکواۃ واجب ہوتی ہے اور یہ مقدار جس پر زکواۃ عائد ہو جاتی ہے

نصاب المال یا اصل المال

اسے مالک بن انس اور اہل مدینہ "نصاب المال" (مال کا نصاب) کہتے ہیں۔ ابن بُکیر نے مالک سے ایسی ہی روایت مجھ سے بیان کی ہے۔

(۱۱۱۴) لیث کے ہاں بھی اسی طرح یہ مقدار "نصاب" کہلاتی ہے۔ مجھ سے یہ روایت ان کی طرف سے عبداللہ بن صالح نے بیان کی ہے۔

(۱۱۱۵) اہلِ عراق اس مقدار کو "اصل المال" (مال کا اصل) کہتے ہیں۔

درہم و دینار اور مویشیوں میں فرق

اب اگر پورا سال گذر جائے اور ریالی اس نصاب یا اصل سے زائد ہو تو بقول مالک بن انس رح اسے اپنے قبضہ کے تمام مویشیوں کی زکواۃ دینا ہوگی۔

(۱۱۱۶) ان کا یہ قول مجھ سے ابن بکیر نے بیان کیا اور مویشیوں کے بارے میں یہی لیث کا بھی قول ہے۔ ہمیں ان کے قول کی بابت عبداللہ بن صالح نے بتایا۔

ابو عبیدؒ :۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ یہ دونوں بزرگ مویشیوں کے علاوہ دیگر (بے جان) املاک کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں ؟

(۱۱۱۷) جہاں تک عراقیوں کا تعلق ہے تو وہ ایسے مالک کی جملہ ملکیت پر خواہ وہ مویشی ہوں یا بے جان مال، زکواۃ واجب سمجھتے ہیں، اور یہ اس لئے کہ ان کے نزدیک اصل المال وہ مقدار ہے کہ اس پر زکواۃ واجب ہو جاتی ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ (اصل مال کے بعد) اس پر جو اضافہ ہوگا وہ اسی کی طرح ہوگا۔

(۱۱۱۸) یہ حضرات اپنے اس قول پر حضرت عمرؓ کی وہ روایت بطور حجت پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے بھیڑ بکریوں میں ان کے چھوٹے چھوٹے بچے بھی شمار کئے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ انہیں معلوم تھا کہ ان چھوٹے چھوٹے بچوں پر پورا سال نہیں گذرا تھا تاہم جب وہ ایک ایسی مقدار میں شامل ہو گئے جس پر زکواۃ واجب ہوتی ہے تو انہیں بھی اسی میں شامل کر لیا گیا۔ اس طرح اہلِ عراق نے حضرت عمرؓ کے بھیڑ بکریوں کے چھوٹے بچّوں کو زکواۃ میں شامل کرنے پر بے جان مال کو قیاس کیا۔

(۱۱۱۹) ابو عبیدؒ :۔ لیکن میری رائے یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کی یہ رائے صرف مویشیوں تک محدود رہے گی اور درہم و دینار دو وجوہ کی بناء پر دگرگوں ہونے کی وجہ سے ان سے مشابہ نہیں قرار دئیے جائیں گے۔ یہ دو وجوہ دو مراعات ہیں

جو سنت نے صرف مالکان مویشی کو دی ہیں اور ان میں سے ایک بھی رعایت سونے چاندی والوں کو نہیں دی گئی۔

(۱۱۲۰) پہلی رعایت تو یہ ہے کہ مویشیوں میں دو فرائض کے درمیان فاضل تعداد پر مالکان مویشی سے زکواۃ معاف کر دی جاتی ہے۔

(۱۱۲۱) اور دوسری رعایت وہ ہے جس کی شرح خود حضرت عمرؓ نے یہ کہکر دی ہے "کہ ہم مویشیوں کے مالکوں کے لئے گھر میں دودھ کے لئے پالی جانے والی بکری، قریب الولادت (حاملہ) بکری، نسل کشی کا نر اور گوشت (کھانے کے لئے پالی جانے) والی بکری چھوڑ دیں گے۔ اور اس طرح انہوں نے یہ سہولت بتا کر بھیڑ بکریوں کے چھوٹے بچوں کو گنے جانے کا جواز پیدا کر دیا۔ گویا ایک آسانی کے بدلہ میں ایک سختی رکھی گئی۔ لیکن سونے اور چاندی کے مالکان کو ان میں سے کوئی مراعات حاصل نہیں ہتو ہیں ان کا تو تمام مال شامل کیا جاتا ہے۔ ان کے لئے یہ بھی جائز نہیں کہ وہ کھرے دینار کے بجائے ناقص یا عیب دار دے دیں۔ اور ان کے لئے کوئی ایسی درمیانی فاضل مقدار بھی نہیں جس پر زکواۃ نہ لگائی جائے۔ دوسو دراہم یا بیس مثقال (دینار) سے جو کچھ زائد ہوگا اس پر بھی انہیں اسی حساب سے زکواۃ ادا کرنا ہوگی۔ اس بارے میں صرف ایک اختلافی قول منقول ہے جس پر عمل نہیں ہوتا۔ اب آپ ہی بتائیں کہ ان ہردو اموال میں کیا مشابہت ہے جبکہ سنت اور عقل ورائے کے اعتبار سے بھی وہ ایک دوسرے سے جداگانہ ہیں۔؟!

تاہم حضرت عمرؓ نے اپنی روایت میں خصوصیت صرف مویشیوں تک محدود رکھی۔ حالانکہ وہ بے جان اموال کی بھی زکواۃ لیا کرتے تھے مگر اس بارے میں ہم تک ان کی کوئی روایت نہیں پہنچی۔ لہذا جس کو انہوں نے خصوصیت بخشی ہم بھی اسے خصوصی حیثیت

مویشیوں کے علاوہ دیگر اموال پر سال گذرنے سے قبل زکواۃ واجب نہیں ہوگی

دیں گے اور جسے انہوں نے عام رکھا اسے ہم بھی عمومی حیثیت دیں گے۔ چنانچہ مویشیوں کے علاوہ ہم کسی چیز میں اس

پر حصول کے وقت سے پورا سال گذرنے سے پہلے زکواۃ واجب نہیں سمجھیں گے۔ اور اسی کی تائید میں آثار متواترہ ملتے ہیں:

(۱۱۲۲) حضرت علیؓ سے روایت ہے: "فائدہ اُٹھائے جانے والے مال پر اسی وقت زکواۃ عائد ہوگی جبکہ اس پر پورا سال گذر جائے۔

(۱۱۲۳) نافع نے ابن عمرؓ سے بھی اسی مضمون کی روایت کی ہے۔

(۱۱۲۴) جابر بن زید نے بھی ابنِ عمرؓ سے اسی مضمون کی روایت کی ہے۔

(۱۱۲۵) محمد بن عقبہ کہتے ہیں میں نے اپنے ایک غلام سے معین رقم لے کر اسے آزاد کرنے کا معاملہ طے کیا۔ تو میں نے قاسم بن محمد سے (اس رقم پہ) زکواۃ کے بارے میں دریافت کیا۔ اُنہوں نے کہا: "حضرت ابوبکرؓ کا طرزِ عمل یہ تھا کہ جب وہ کسی شخص کا وظیفہ دینا چاہتے تو اس سے دریافت کر لیتے کہ آیا اس کے پاس اتنا مال ہے جس پر زکات واجب ہو؟ اگر وہ بتاتا کہ اس کے پاس زکواۃ کے قابلِ مال ہے تو وہ اس کے وظیفہ میں سے اتنی رقم کاٹ لیتے جو وہ بطور زکواۃ دینا چاہتا تھا، لیکن اگر وہ بتاتا کہ اس کے پاس زکواۃ کے قابل مال نہیں ہے تو وہ اسے اس کا وظیفہ (پورا) ادا کر دیتے۔

(۱۱۲۶) ایک اور سند سے بھی محمد بن عقبہ ابوبکرؓ سے یہی مضمون روایت کرتے ہیں البتہ اس میں اس غلام کا ذکر نہیں جس سے معینہ رقم کے عوض آزادی کا معاملہ طے کیا گیا تھا۔

(۱۱۲۷) عائشہ بنت قدامہ بن مظعون کہتی ہیں: "حضرت عثمان بن عفانؓ جب وظیفہ اجراء کرتے تو میرے باپ کو کہلا بھیجتے کہ اگر تمہارے پاس اتنا مال ہو جس پر زکواۃ واجب ہے تو ہم تمہارے وظیفہ میں سے اس کا حساب کر لیں گے۔"

(۱۱۲۸) ہبیرۃ بن یریم کہتے ہیں کہ عبداللہ بن مسعودؓ ہمیں وظیفہ (کی رقم) تھیلیوں (یا ٹوکریوں) میں دیا کرتے تھے پھر اس میں سے زکواۃ منہا کر لیتے تھے۔

ابو عبیدؒ: میرے نزدیک عبداللہ بن مسعودؓ کی اس روایت کی وہی توجیہ ہے جو حضرات ابوبکر و عثمان رضی اللہ عنہما کی روایات کی ہے۔ یعنی یہ کہ وہ دونوں بزرگ

اس مال کی زکوٰۃ لیتے تھے جو ماضی میں ان پر واجب الادا تھی نہ کہ وہ زکوٰۃ جو مستقبل میں ان پر واجب ہونے والی تھی۔

(۱۱۲۹) اس امر کی وضاحت ان کی ایک اور روایت کر رہی ہے: عبداللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں: "جو شخص کوئی مال حاصل کرے تو اس پر پورا سال گذرنے سے پہلے اسے کوئی زکوٰۃ ادا کرنا نہیں ہوگی۔

ابو عبیدؒ:۔ اسی مضمون کی ایک حدیث طارق بن شہاب سے مروی ہے۔

(۱۱۳۰) طارق کہتے ہیں: ہمارے وظائف حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اس طرح جاری ہوتے تھے کہ ان کی زکوٰۃ نہیں لی جاتی تھی۔ تا آنکہ ہم خود ہی اس کی زکوٰۃ نکالتے تھے۔

ابو عبیدؒ:۔ اس سے ظاہر ہو رہا ہے کہ وظائف میں سے جو زکوٰۃ لی جاتی تھی وہ اس مال کی ہوتی تھی جو ان کے پاس پہلے سے موجود ہوتا تھا۔ اگر وظائف کی زکوٰۃ ہوتی تو اس میں سے زکوٰۃ لی جاتی۔[1]

اور ان (طارق) کے اس قول میں: "کہ ہم خود ہی اس کی زکوٰۃ نکالتے تھے"۔ احتمال ہے کہ وہ یہ کہنا چاہتے ہوں کہ ہم ہی انہیں بتاتے تھے کہ ہم پر کتنی زکات واجب ہے۔

اس کی تائید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابہؓ کی متواتر روایات ملتی ہیں اور ان میں سے کوئی بھی یہ نہیں بیان کرتا کہ جو مال مزید شامل کیا جائے اسے پرانے مال میں ملاکر (ان دونوں کی مجموعی طور پر) زکوٰۃ دی جائے۔ اور اگر وہ یہ صورت چاہتے تو لوگوں کو ان کے وظائف دے دیتے تا آنکہ وہ ان کے مال میں

---

[1] یہ عربی عبارت کا ترجمہ ہے جو بات صاف نہیں کرتا شاید مطلب یہ ہے کہ لی جانے والی زکوٰۃ پہلے سے موجود مال پر لگتی تھی۔ اگر وظائف پر ہوتی تو نہ لی جاتی کیونکہ اس پہ تو ابھی سال گذرا ہی نہیں، لیکن ایسی صورت میں عربی جملہ میں حرف نفی ہونا ضروری تھا۔ اس عبارت سے دوسرا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ وظائف دیتے وقت ہی ان پر واجب زکوٰۃ وصول کر لی جاتی تھی۔ شاید یہ اس لئے ہوتا ہو کہ وظائف سال گذرنے کے بعد ملتے ہوں اور خود ان پر بھی زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہو، یا پھر یہ صورت ہو کہ وظائف پر وصولی کے وقت ہی وظیفہ لے لیا جاتا ہو۔ واللہ اعلم۔ (مترجم)

شامل ہو جائے پھر ان دونوں مالوں کے مجموعے میں سے زکواۃ لیتے۔

ابو عبیدؒ :۔ اسی قسم کا مضمون آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم سے مروی ہے لیکن اس کی سند میں کچھ کلام ہے :۔

(۱۱۳۱) حضرت عائشہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے روایت کرتی ہیں کہ آپؐ نے فرمایا : "جب تک کسی مال پر پورا سال نہ گذرے اس پر زکواۃ واجب نہیں ہوتی"۔

ابو عبیدؒ :۔ اگر اس کی کوئی اصل ہے تو یہی سنّت ہے ورنہ پھر ہم نے جن صحابہؓ کا نام لیا ہے ہمارے لئے ان میں بھی قابلِ اتباع نمونہ اور قدوہ ہے۔

لیکن اس باب میں حضرت ابن عباسؓ سے ایک قول مروی ہے جو مذکورہ بالا تمام اقوال سے مختلف ہے :

(۱۱۳۲) عکرمہ کہتے ہیں کہ ایسے شخص کے متعلق جسے کچھ مال حاصل ہو جائے ابن عباسؓ کہتے ہیں : "وہ اس وقت اس کی زکواۃ ادا کرے گا جس وقت اسے وہ مال حاصل ہو"۔

(۱۱۳۳) ایک دوسری سند میں ابن عباسؓ سے یہی مضمون جابر بن زید سے مروی ہے :

ابو عبیدؒ :۔ کچھ لوگ حضرت ابن عباسؓ کے اس قول کی شرح میں کہتے ہیں کہ اس سے حضرت ابن عباسؓ کی مراد "سونا چاندی" تھی۔ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اُن کا مقصود یہ ہو۔ میری نظر میں وہ اس سے زیادہ فقیہ ہیں کہ ایسی بات کہیں۔ اس لئے کہ ان کا یہ قول اُمت میں کسی عالم کے قول سے نہیں ملتا بلکہ سب سے الگ ہٹا ہوا ہے۔ بنا بریں میرا خیال ہے کہ اُنہوں نے اس قول سے "زمین کی پیداوار" مراد لی ہوگی۔ اس لئے بھی کہ اہلِ مدینہ زمینوں کو بھی "اموال" کہہ دیتے ہیں۔ نیز اس لئے کہ ہمیں سنت میں زرعی پیداوار کے علاوہ کوئی ایسا مال نہیں ملتا جس پر مالک کو ملکیت میں آتے ہی زکواۃ دینا پڑے۔ اب اگر حضرت ابن عباسؓ نے اس قول سے یہی مراد نہ لی ہو تو پھر میں نہیں سمجھ سکتا کہ ان کی اس روایت کی کیا توجیہ کی جا سکتی ہے ؟۔

ابو عبیدؒ :۔ یہ ہیں وہ روایات جو اس مال سے متعلق ہیں جو شروع ہی سے اتنا ہو کہ اس پر زکواۃ واجب ہو اور اسی مقدار کو "نصاب" اور "اصل" کہا جاتا ہے۔

ایسے مال کی زکوٰۃ جو شروع سال میں نصاب سے کم ہو لیکن آخر میں بڑھ جائے

(۱۱۳۴) اب اگر مال "نصاب" اور "اصل" کی مقدار سے کم ہو جس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوتی ہو مثلاً ایک آدمی شروع سال میں پانچ دینار یا چار اونٹوں کا مالک بنتا ہے تو اس سلسلہ میں مالک بن انس کہتے ہیں کہ اگر وہ ان پانچ دیناروں کو تجارت میں لگا دیتا ہے۔ اور وہ بڑھ کر سال پورا ہونے تک بیس یا اس سے زائد دینار ہو جاتے ہیں یا اونٹوں میں ایک بچہ پیدا ہو کر وہ پانچ یا اس سے زائد ہو جاتے ہیں تو ان سب پر زکات واجب ہو جائے گی۔

ابو عبیدؒ:۔ اس طرح مالکؒ کا مسلک یہ ہے کہ مال سے ہونے والا نفع بھی اس کے اصل مال میں شامل ہوگا اور ماؤں کے بچے بھی انہی میں شامل کئے جائیں گے۔

موجودہ مال میں سے ہونے والے اضافے اور دیگر ذرائع کے اضافہ میں فرق رکھا جائے گا یا نہیں

(۱۱۳۵) ان (مالکؒ) کا کہنا ہے کہ اگر یہ اضافہ منافع یا اولاد کی جہت سے نہ ہو بلکہ کسی اور ذریعہ سے آمد ہو مثلاً ہبہ اور میراث وغیرہ سے حاصل ہوا ہو تو اندریں صورت نہ سابقہ مال پر زکوٰۃ لگے گی نہ جدید حاصل ہونے والے مال پر۔ بلکہ جس دن وہ نیا مال حاصل ہوا ہو اس دن سے از سرِ نو سال شمار کیا جائے گا۔

اس طرح مالکؒ دیگر آمدنیوں اور مویشیوں کے پیدائشی اضافہ یا مال کے منافع سے حاصل ہونے والی آمدنی کو ایک دوسرے سے جدا کر دیتے ہیں۔

ابو عبیدؒ:۔ یہی بات یا اس کے ہم معنی بات مجھے ابن بکیر نے بھی امام مالکؒ سے منسوب کر کے بتائی۔ ان سے قبل ہمیں کوئی ایسا عالم نہیں ملتا جو ان دونوں (آمدنیوں) میں فرق کرتا ہو۔

(۱۱۳۶) جہاں تک سفیان واہلِ عراق نیز اہلِ حجاز کی اکثریت کا تعلق ہے مالکؒ اور ان کے ہم خیال حضرات کو چھوڑ کر، یہ سب ان تمام اموال میں کوئی فرق نہیں کرتے اور ان

میں سے کسی مال پر اس وقت تک وہ زکوٰۃ واجب نہیں سمجھتے جب تک کہ زائد حاصل ہونے والی ملکیت پر از سرِ نو سال پورا نہ گذرے خواہ وہ ملکیت جانوروں کی پیدائش سے بنے ہو یا منافع کے ذریعہ حاصل ہوئی ہو یا ہبہ اور میراث وغیرہ کے ذریعہ اور یہ بھی اس صورت میں کہ وہ زائد آمدنی اس مقدار میں ہو جس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہو۔

ایسی ہی ایک روایت ابراہیم سے مروی ہے:

اضافہ کے بعد بقدر نصاب ہو تب سے پورا سال گذرنا چاہیئے

(۱۱۳۷) مغیرہ کہتے ہیں کہ ابراہیم نے ایسے شخص کے بارے میں جسے پچاس درہم ملیں پھر سو درہم ملیں، پھر بقیہ درہم ملیں جن سے وہ پورے دوسو درہم یا اس سے زائد ہو جائیں، کہا کہ اس پر زکوٰۃ اس وقت واجب ہو گی جب دوسو ہونے کے بعد سے ان پر پورا سال گذر جائے۔

(۱۱۳۸) **ابو عبیدؒ**:- اور یہی ہماری بھی رائے ہے۔ دولت میں خواہ منافع سے اضافہ ہو یا مویشیوں کی پیدائش سے ان اضافوں میں اور دیگر آمدنیوں سے حاصل ہونے والے اضافوں میں کوئی فرق ملحوظ نہیں ہو گا۔ یہ سب اضافے اللہ تعالےٰ کی دین اور اس کی بخشش کا فیضان ہیں جن سے وہ اپنے بندوں کو نوازتا ہے۔

(۱۱۳۹) اور یہ تمام اضافی آمدنیاں اس مال سے متعلق ہیں جس کے ملنے پر صاحبِ مال اپنی ملکیت پر از سرِ نو پورا سال گذارے گا۔ پھر دیگر آمدنیوں کا اس میں اضافہ ہو گا۔

اب اگر اضافی مال سے پہلے کا بقیہ مال اتنی مقدار تھا جس پر پہلے ہی سے زکوٰۃ واجب ہوتی ہو پھر اس باقیماندہ مال میں دوسرا مال اضافہ کیا گیا تو یہ مال وہ ہو گا جس کے بارے میں ابراہیم کہتے ہیں: "اس مال کے پہلے اور بعد (ہر دو) کے مجموعہ پر زکوٰۃ دی جائے گی۔

بقدر نصاب مال کی موجودگی میں ادائی زکوٰۃ کے وقت سے ایک دو ماہ قبل حاصل ہونے والے مال کی زکوٰۃ

(۱۱۴۰) حجاج بن ارطاۃ کہتے ہیں کہ حکم ابن عُتَیبہ

کے گھر میں ہم اس مسئلہ پر بحث کرنے لگے کہ ایسے شخص کو کیا کرنا ہوگا جسے زکوٰۃ کا وقت پورا ہونے سے ایک ماہ یا دو ماہ یا تین ماہ قبل کچھ رقم ہاتھ لگ جائے؟ تو ہمیں فضیل ابن عمرو نے ابراہیم کا یہ قول بتایا: "ایسا شخص اپنے مال کے ساتھ اس نئے اضافہ کی بھی زکوٰۃ دے گا"۔ راوی کہتا ہے: "میں نے دیکھا کہ وہ سب لوگ اس جواب پر متفق ہو گئے"۔

(۱۱۴۱) حسن کہتے ہیں: "اگر اس کے پاس اس کے علاوہ اور مال ہو تو وہ اس کی زکوٰۃ کا وقت آنے پر اس (نئے اضافہ) کی زکوٰۃ بھی دے گا۔"

(۱۱۴۲) حسن کہتے ہیں: "جب وہ ماہ آجائے جسے کسی شخص نے اپنی زکوٰۃ ادا کرنے کے لئے مقرر کیا ہو تو وہ اپنے تمام مال کی زکوٰۃ ادا کرے گا۔"

اضافی آمدنی میں تعیّن وقت اور عدمِ تعیّن وقت کا فرق

(۱۱۴۳) ابو عبیدؒ: - اہلِ عراق کے نزدیک اس قول کی صورت یہ ہوگی کہ دوسرا مزید ملنے والا مال جو ایسے مال میں اضافہ کیا جائے جس پر زکوٰۃ واجب ہو چکی ہو تو اندریں صورت وہ ایک مال کو دوسرے میں شامل کریں گے۔ میری نظر میں ابراہیم اور حسن کے اس قول کے یہ معنے تمام حالات میں نہیں لئے جائیں گے بلکہ ان کا یہ مسلک صرف ایسی صورت میں ہوگا جبکہ مال باہم گڈمڈ ہوا ہو اور یہ معلوم نہ ہو سکے کہ وہ کب حاصل ہوا تھا جیسا کہ تاجروں وغیرہ کے ساتھ ہوتا ہے کہ مختلف زمانوں میں مختلف منافع وغیرہ انہیں حاصل ہوتے رہتے ہیں۔ اور جب سال کا آخری دن آتا ہے تو انہیں یہ متعین کرنا ممکن نہیں ہوتا کہ کتنا فائدہ کن کن اوقات میں حاصل ہوا۔ تو وہ ایسا تمام مال جمع کر کے اس کے مجموعہ کی زکوٰۃ دے گا۔ اس لئے کہ اس کے سوا کوئی اور صورت نہیں کہ وہ پہلے مال کی زکوٰۃ دے سکے۔ بناء بریں اسے حکم دیا گیا کہ وہ احتیاطاً تمام مال کی زکوٰۃ ادا کرے۔ رہا وہ شخص جسے وضاحت سے معلوم ہو کہ اس نے کتنا کتنا مال، کب کب سال پورا ہونے سے قبل حاصل کیا ہے تو ایسے شخص کو کونسی مجبوری ہے کہ وہ بعد کی آمدنی کو پہلی آمدنی میں ملائے؟ جبکہ سنت یہی ہے کہ سال پورا گذرنے سے قبل کسی مال پر زکوٰۃ نہیں لی جاتی۔ یہ کونسا قاعدہ ہے کہ ایک مال پر جو حق

واجب ہوتا ہو وہ دوسرے مال پر چسپاں کر دیا جائے؟ قاعدہ اور صحیح فیصلہ تو یہی ہے کہ ہر مال پر جو اس کا حق ہو وہی اس پر لازم قرار دیا جائے۔

منافع پر زکوٰۃ میں اختلاف

اسی مضمون کی تفسیر عمر بن عبدالعزیزؒ سے مروی ہے:
(۱۱۴۴) قطن کہتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہد میں میرا واسط سے گذر ہوا، تو وہاں لوگوں نے کہا: ہمیں امیرالمومنین کا خط پڑھ کر سُنایا گیا اس میں تھا: "تاجروں کے منافع سے اس وقت تک کچھ نہ لو تا آنکہ اس پر پورا سال نہ گذر لے۔"

(۱۱۴۵) عون کہتے ہیں کہ میں مسجد پہنچا تو وہ خط پڑھا جا چکا تھا۔ اس پر میرے ایک قریبی ساتھی نے کہا: "کیا اچھا ہوتا کہ تم عمر بن عبدالعزیزؒ کا تاجروں کے منافع سے متعلق خط سُن لیتے۔ جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ سال پورا ہونے سے قبل منافع پر کچھ نہ لیا جائے۔"

ابو عبیدؒ: ملاحظہ فرمایا آپ نے، عمر (بن عبدالعزیزؒ) منافع پر از سرِ نو پورا سال گذرنے کی قید لگا رہے ہیں اور اسے اصل مال میں شامل کر کے اس مجموعہ پر زکوٰۃ لینے کے لئے نہیں کہتے؟۔ اب جبکہ وہ مال کی بڑھوتری اور منافع کو بھی اس میں ضم نہیں کر رہے حالانکہ وہ اس میں شامل ہوتی ہے تو الگ سے حاصل ہونے والا مال شامل کر لینا تو اور بھی مستبعد ہے۔

(۱۱۴۶) اور یہ بات مالک کے قول کے خلاف ہے۔ اس لئے کہ وہ منافع کو اصل مال میں شامل کر لینے کے قائل ہیں اور وہ نفع اور دیگر آمدنیوں میں فرق کرتے ہیں لیکن ہماری تائید عمر بن عبدالعزیزؒ کے قول کو حاصل ہے اور وہ یہ کہ سال گذرنے سے قبل نفع پر قطعاً زکوٰۃ نہیں لی جائے گی۔

اور لیث سے بھی ایسا ہی قول منقول ہے:۔

(۱۱۴۷) لیث کہتے ہیں: "نصابِ مال میں مویشیوں کے اضافہ پر تو زکوٰۃ دی جائے گی لیکن جہاں تک درہم و دینار کا تعلق ہے ان کی زکوٰۃ ان کے حصول کے دن سے سال پورا ہونے پر ہی دی جائے گی۔

ابو عبیدؒ:۔ اس باب میں مذکورہ بالا تمام اقوال کے علاوہ زہریؒ سے ایک بالکل مختلف قول منقول ہے:

(۱۱۴۸) اوزاعی روایت کرتے ہیں کہ زُہری نے کہا: "اگر اس کے پاس پہلے کا باقیماندہ مال زیادہ ہو اور نفع (نئی آمد) کمتر ہو تو وہ اس کی زکواۃ دے گا اور اگر نفع (نئی آمد) زیادہ ہو تو وہ اس کی زکواۃ نہیں دے گا۔

ابو عبیدؒ:۔ یہ ہیں وہ اقوال جو دو صد دراہم اور بیس دینار کے پورا سال گذرنے پر ان کی زکواۃ سے متعلق ہمیں ملے ہیں۔

سونے یا چاندی کے جُداگانہ مقدار نصاب سے کم ہونے پر زکواۃ ادا کرنے کی صورت

اگر دراہم و دینار اس تعداد سے کم ہوں تو اُن کی زکواۃ سے متعلق پانچ اقوال ہیں:۔

(۱۱۴۹) پہلا قول: عبیدہ کہتے ہیں کہ میں نے ابراہیم سے دریافت کیا: "اس شخص کی زکواۃ کے متعلق کیا حکم ہے جس کے پاس سو درہم ہوں اور دس دینار؟" تو اُنہوں نے جواب دیا: "وہ ہر صنف میں سے بقدر حصّہ اس کی زکواۃ ادا کرے گا۔"

(۱۱۵۰) دوسرا قول: اور یہی سوال شعبی سے کیا تو اُنہوں نے کہا: "جو صنف کمتر ہو اسے زیادہ والی کے مطابق (قیمت کا اندازہ لگا کر) حساب کرے گا اگر وہ بقدر نصاب بن جائے تو اس کی زکواۃ ادا کرے گا۔

ابو عبیدؒ:۔ مطلب یہ ہے کہ (چاندی یا سونے میں سے) جو صنف کمتر ہوگی بازار کے موجودہ بھاؤ سے اس کی قیمت متعین کرکے (زیادہ مقدار والی صنف کی قیمت میں ملا کر) حساب کیا جائے گا۔

(۱۱۵۱) تیسرا قول: یہ کہ جب دینار کی قیمت درہم میں شامل کرے تو ہر دینار کو دس درہم کے مساوی قرار دے خواہ (موجودہ) بھاؤ اس سے کمتر یا بیشتر ہو۔

(۱۱۵۲) چوتھا قول:۔ ہر حال میں دیناروں کی قیمت لگا کر دراہم میں جوڑی جائے

خواہ دینار دراہم سے کم ہوں یا زیادہ۔

(۱۱۵۳) پانچواں قول: دونوں قسم کے مالوں پر سے زکواۃ ختم کردی جائے گی اور ان پر اُس وقت تک کوئی زکواۃ نہیں لگے گی تا وقتیکہ وہ جُداگانہ (اپنے نصاب کی مقدار میں یعنی) دراہم دو صد، اور دینار بیس نہ ہوجائیں۔

ابو عبیدؒ:۔ ان میں سے ہر قول کا قائل اپنے لئے ایک وجہ استدلال رکھتا ہے:۔

(i) وہ شخص جو ہر صنف میں سے بقدر حصّہ ادائی زکواۃ کا قائل ہے کہتا ہے: کسی مال پر اس کی انفرادی اور ذاتی حیثیت سے زکواۃ واجب ہوتی ہے اور یہ نہیں ہوگا کہ اس پر جو حق واجب ہوتا ہو وہ اس سے منتقل ہوکر دوسرے پر واجب ہو جائے۔ بنا بریں دونوں قسموں میں سے کسی ایک کو دوسری میں ضم نہیں کیا جائے گا۔ یہ ہے ابراہیمؒ کی دلیل اور یہی مالک بن انسؒ کا قول ہے۔

(ii) وہ شخص جو تھوڑی مقدار والی صنف کو زیادہ مقدار والی صنف میں ملانے کا قائل ہے وہ ان دونوں کو ایک مال قرار دیتے ہوئے کہتا ہے: "میری رائے میں درہم و دینار اشیاء کی قیمت ہیں۔ اشیاء کو ان دونوں کی قیمت نہیں کہا جاتا لیکن بایں ہمہ میں دیکھتا ہوں کہ یہ دونوں اصناف ایک دوسرے کے عوض اُدھار (نسئی) فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔ اس سے مجھے یہ ثبوت ملتا ہے کہ یہ دونوں چیزیں ایک ہی نوع ہیں بنا بریں میں کمتر صنف کی قیمت اس کے بھاؤ کے مطابق لگا کر زیادہ مقدار والی صنف میں شامل کروں گا۔ جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں۔ یہ شعبی کا استدلال ہے اور ابن بکیر کی روایت کے مطابق یہی اوزاعی کا بھی قول تھا۔

(۱۱۵۴) اور یہی سفیان اور اہلِ عراق کا مسلک بھی ہے۔

(iii) وہ شخص جو ملے جُلے دینار و دراہم کو بہر حال درہموں میں شامل کرنے کا قائل ہے۔ خواہ دینار دراہم سے زائد ہی کیوں نہ ہوں وہ اپنے مسلک پر یہ استدلال کرتا ہے کہ سنت میں تو صرف درہموں کی زکواۃ ہی مذکور رہے اور یہی سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے ثابت ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مسلمانوں نے دراہم سے مشابہت

کی بناء پر ہی سونے پر زکواۃ واجب کر دی ہے۔ بنا بریں میں دیناروں کو مالِ تجارت قرار دیتے ہوئے ان کی قیمت لگا کر اسے دراہم میں شامل کروں گا۔ یہ حدیث واثر کے قائلین میں سے بعض کا مسلک ہے۔

(۱۱۵۵) اس سے کچھ ملتا جلتا قول عطاء اور زہری سے مروی ہے کہ وہ دونوں دیناروں کو بمنزلہ مالِ تجارت قرار دیتے تھے۔

(iii) رہا وہ شخص جو ہر دینار کو دس درہم کے مساوی قرار دیتا ہے اور اس کے موجودہ نرخ کے مطابق قیمت کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتا وہ اپنے مسلک پر یہ ثبوت پیش کرتا ہے کہ اصل نصاب میں ہر دینار دس درہم ہی کے مساوی رکھا گیا ہے۔ آپ نہیں دیکھتے کہ جب تک دینار کی تعداد بیس نہ ہو جائے اس پر زکواۃ واجب نہیں ہوتی۔ بالکل اسی طرح جیسے دراہم کی تعداد دو سو ہونے سے قبل ان پر زکواۃ واجب نہیں ہوتی۔ چنانچہ ان (دونوں کی مذکورہ تعداد کے بعد) یہ دونوں باہمدگر مساوی ہو جاتے ہیں لہٰذا ان میں سے ہر ایک پر چالیسواں حصہ واجب کیا گیا۔

(۱۱۵۶) محمد بن حسن کے سوا یہ قول میں نے کسی اور سے نہیں سُنا۔ اُنہوں نے بتایا کہ اس مسئلہ میں میری رائے یہی ہے، لیکن ان کے ساتھی اس رائے میں ان سے اختلاف کرتے ہیں۔

(V) اب رہ جاتا ہے وہ شخص جو اس طرح کے دونوں مالوں پر سے زکواۃ اُڑانے کا قائل ہے اور کہتا ہے کہ زکواۃ اسی وقت دی جائے گی جبکہ درہم دو صد، اور دینار بیس ہو جائیں۔ وہ بھی خود سنت سے استنباط کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ خود سنت نے ان دونوں اصناف میں فرق قائم رکھا ہے اور ان دونوں کو دو مختلف نوع قرار دیا ہے۔

(۱۱۵۷) اس لئے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے چاندی کو چاندی کے عوض ربا قرار دیا ہے الا یہ کہ وہ مساوی ہو۔ چنانچہ آپؐ نے دونوں چاندیوں کو برابر قرار دیا کیونکہ وہ دونوں ایک نوع ہیں۔ اسی طرح آپؐ نے سونے کو سونے

کے عوض ربا قرار دیا (اِلّا یہ کہ وہ مساوی ہوں) پھر آپؐ نے سونے کو اس سے کئی گنا زیادہ چاندی کے عوض جائز قرار دیا اس لئے کہ وہ دونوں دو مختلف انواع ہیں۔

اس کا کہنا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے سونے اور چاندی کو دو دو جنس قرار دیا تو میں ان دونوں کو کیونکر اکٹھا کر کے ایک جنس بنا ڈالوں؟۔

(۱۱۵۸) یہ ہے ابن ابی لیلی، شُریک اور حسن بن صالح کا قول۔

اور یہی قول میرے نزدیک احادیث و آثار سے زیادہ قریب اور نظری طور پر زیادہ صحیح ہے۔ اس میں ایک دلیل تو یہی ہے کہ صرافی میں یہ دونوں مختلف جنسیں ہیں اور دوسری دلیل خود زکواۃ میں بھی ہے:۔

اور وہ اس طرح کہ اگر ایک آدمی کے پاس بغیر درہم کے صرف بیس دینار ہوں اور اس وقت ایک دینار کا بھاؤ نو درہم یا اس سے کم کے برابر ہو تو بھی اس شخص پر زکواۃ واجب ہوگی۔ اگرچہ یہ شخص دو سو دراہم کا مالک نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر اس شخص کے پاس دس دینار ہوں اور ایک دینار کی قیمت بیس یا بیس سے زائد درہم کے مساوی ہو تو بھی اس شخص پر زکواۃ واجب نہ ہوگی حالانکہ وہ دو سو درہم یا اس سے زائد کا مالک ہوگا۔ ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ ان صورتوں میں درہم کی حیثیت کس طرح ابھر کر سامنے آگئی اور وہ دینار سے بالکل الگ ہو گیا؟ پھر کون سی وجہ ہے کہ دیناروں کو دراہم میں شامل کر لیا جائے؟ اور انہیں اس موقع پر جب وہ بیس سے کم ہوں مالِ تجارت کی حیثیت دے دی جائے اور دوسری صورت میں جبکہ وہ پورے بیس ہوں نقدی قرار دیا جائے؟! اس بارے میں میری پوری تائید ابن ابی لیلی شریک، اور حسن کے قول کو حاصل ہے جس کی رو سے یہ دونوں دو جداگانہ مال ہیں جیسے اونٹوں کے ساتھ بھیڑ بکریاں یا گیہوں کے ساتھ کھجور۔ ان میں سے ایک کو بھی دوسری میں داخل نہیں کیا جائے گا۔

یہ ہیں وہ اقوال جو درہموں کے دو سو سے کم اور دینار کے بیس سے کم ہونے پر کہے گئے ہیں۔

(۱۱۵۹) اب اگر صورت یہ ہو کہ دراہم دو صد ہوں اور دینار بیس۔ تو اس باب میں سب کی ایک رائے ہے اور کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا۔

نصاب سے زائد سونے چاندی پر زکواۃ لینے کا طریقہ

لیکن ایسی صورت میں کہ یہ ہر دو جنس اپنے اپنے نصاب سے بڑھ جائیں تو اس بارے میں تین اقوال ملے ہیں:۔

(۱۱۶۰) قول اوّل: حضرت علیؓ کہتے ہیں: "ہر بیس دینار پر نصف دینار اور ہر چالیس پر ایک دینار، اور ہر دو سو درہم پر پانچ درہم کے حساب سے زکواۃ دی جائے گی، اور اس سے زائد مقدار پر اسی حساب سے زکواۃ ادا کی جائے گی۔

(۱۱۶۱) ایک دوسری سند سے بھی یہی مضمون حضرت علیؓ ہی سے مروی ہے۔

(۱۱۶۲) ابنِ عمرؓ کہتے ہیں: "ہر دو سو درہم پر پانچ درہم (زکواۃ) ہیں۔ اور جو زائد مقدار ہو اس پر اسی حساب سے (مزید رقم ادا کی جائے گی)

(۱۱۶۳) ابراہیم کہتے ہیں: "ہر دو سو درہم پر پانچ درہم زکواۃ لی جائے گی اور جو اس سے بڑھے گا اس پر اسی حساب سے لی جائے گی۔

(۱۱۶۴) رُزَیق بن حیان دمشقی (یا بقول اہلِ عراق، اہلِ مصر جو اس نام کو زیادہ جاننے والے ہیں اسے زُرَیق کہتے ہیں) جو ولید، سلیمان نیز عمر بن عبدالعزیز کے عہد ہائے خلافت میں مصر میں مسافروں کے کاغذات وغیرہ کی دیکھ بھال پر مامور تھے، کہتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے انہیں لکھا تھا: "مسلمانوں میں سے جو تمہاری حدود سے گذریں ان کا معائنہ کرو اور ان کے اس ظاہر مال میں سے جو انھوں نے تجارت میں لگا رکھا ہے۔ ہر چالیس دینار میں سے ایک دینار لے لو اور جو کم ہو اس میں سے بھی بیس دینار تک اسی حساب سے لے لو، لیکن اگر وہ اس (بیس دینار) سے تہائی (⅓) دینار بھی کم ہو جائے تو پھر اس کو بغیر زکواۃ لئے چھوڑ دینا۔

(۱۱۶۵) ایک اور سند سے بھی یہی رُزَیق بن حیان، عمر بن عبدالعزیز سے ایسا ہی مضمون روایت کرتے ہیں۔

(۱۱۶۶) قول ثانی :۔ انس بن مالک کہتے ہیں کہ مجھے اور ابو موسیٰ اشعری رضؓ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عراق بھیجا : ابو موسیٰ کو نماز (کی امامت) پر اور مجھے زکوٰۃ (وغیرہ) کی تحصیل پر اور فرمایا: "جب مسلمان کا مال دو سو درہم ہو جائے تو اس میں سے پانچ درہم لے لو۔ اور جو دو سو سے زائد ہو اس میں سے ہر چالیس درہم پر ایک درہم کے حساب سے لے لو۔

(۱۱۶۷) انس رضؓ کہتے ہیں: "مجھے عمر بن الخطاب رضؓ نے زکوٰۃ کی وصولی پر مامور کیا اور حکم دیا کہ میں ہر بیس دینار پر نصف دینار لوں اور اگر ان کے بعد وہ بڑھ کر چار ہو جائیں تو ان (میں سے ہر چار) پر ایک درہم۔ نیز یہ کہ دو سو درہموں پر پانچ درہم لوں۔ اگر اس مقدار سے بڑھ کر وہ مزید چالیس تک پہنچ جائیں تو ان پر ایک درہم لوں۔

(۱۱۶۸) ہشام، حسن سے روایت کرتے ہیں: "اگر دو سو سے اُوپر اُنتالیس دراہم بڑھ جائیں تو اس زائد حصہ پر کچھ زکوٰۃ نہیں لی جائے گی تا آنکہ وہ پورے چالیس نہ ہو جائیں۔ پھر اسّی ہونے تک ان پر کوئی زکوٰۃ نہیں لی جائے گی۔ وقس علی ذلک

(۱۱۶۹) ابن شہاب کہتے ہیں: "دو سو (درہموں) سے اُوپر جو اضافہ ہو جب تک وہ چالیس درہم پورے نہ ہو جائیں ان پر کوئی زکوٰۃ نہیں لی جائے گی۔

(۱۱۷۰) قول ثالث :۔ طاؤس کہتے ہیں: "دو سو سے اُوپر درہموں پر کوئی زکوٰۃ نہیں لی جائے گی تا آنکہ وہ چار سو نہ ہو جائیں اس وقت ان پر دس درہم لئے جائیں گے۔ پھر اس سے بڑھنے پر اس وقت تک کچھ نہیں لیا جائے گا تا آنکہ وہ چھ سو درہم نہ ہو جائیں اور یہی سلسلہ جاری رہے گا۔

(۱۱۷۱) ابو عبیدؒ :۔ میرا خیال ہے کہ اُن کی یہ رائے ان احادیث کے مطالب پر مبنی ہے۔

(i) جب چاندی دو سو درہم ہو جائے تو اس پر چالیسواں حصّہ لیا جائے گا۔

(ii) ہر دو سو پر پانچ درہم (زکوٰۃ کے) ہوں گے۔

ان میں دو سو ایک معین مقدار ہے اور اس سے کمتر کو شمار میں نہیں رکھا گیا ہے

جیسے مویشیوں میں ہے "ہر پانچ اونٹوں پر ایک بکری اور ہر دس اونٹوں پر دو بکریاں"۔
لیکن ہمارے علم میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جس نے اس قول میں طاوس کی موافقت کی ہو۔

(۱۱۷۲) اب اُس قول (ثانی) کو لیجئے جو حضرت عمرؓ، حسن اور ابن شہاب سے مروی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان حضرات نے "اوقیہ" کی رعایت سے ایسا کہا ہے، کیونکہ حدیث میں آیا ہے: "پانچ اوقیہ سے کم پر کوئی زکواۃ نہیں پھر (پانچ اوقیہ پورے ہونے پر) ان پر پانچ درہم لئے جائیں گے۔ بنا بریں ان حضرات نے یہ خیال کیا کہ ہر اوقیہ پر ایک درہم لیا جائے گا۔ اور اس سے کم (کسور) پر کچھ نہیں لیا جائے گا۔ اس لئے کہ حدیث میں اس بارے میں کچھ مذکور نہیں ہے۔

(۱۱۷۳) ہمیں ابن کثیرؒ نے بتایا ہے کہ یہی اوزاعی کا قول بھی تھا۔:

ابو عبیدؒ۔ اس امر کا احتمال ہے کہ حضرت عمرؓ کا یہ کہنا: "ہر چالیس درہم پر ایک درہم"۔ محض لوگوں کو حساب سمجھانے کی غرض سے ہو اور اس سے یہ بتانا مقصود ہو کہ ہر اوقیہ پر ایک درہم لیا جائے گا۔ لیکن بایں ہمہ وہ اس بات کے قائل ہوں کہ دو سو درہم اور بیس دینار سے اوپر جو بھی اضافہ ہو اس پر اسی حساب سے زکواۃ لی جائے گی۔

(۱۱۷۴) اب رہ جاتا ہے قول اول جو حضرت علیؓ، ابن عمرؓ، ابراہیم اور عمر ابن عبدالعزیزؒ سے منسوب ہے تو اسی پر ہمارے ہاں عمل ہو رہا ہے اور مسلمانوں کی بڑی اکثریت اسی کی قائل ہے۔ یہی ابن ابی لیلیٰؒ، سفیانؒ اور مالکؒ کا قول ہے اور یہ سب اس پر متفق ہیں کہ یہ مفہوم (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی) اس مرفوع حدیث کے مفہوم کے مطابق ہے:

(۱۱۷۵) ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:
"پانچ اوقیہ سے کم میں کوئی زکواۃ نہیں اور پانچ اونٹوں سے کم پر کوئی زکواۃ نہیں اور پانچ وسق سے کم پر کوئی زکواۃ نہیں۔

(۱۱۷۶) ایک اور سند سے بھی یہی مضمون ابو سعید خدری ہی کے واسطہ سے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے مروی ہے۔

ابو عبیدؒ:۔ آپ غور نہیں فرماتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے یہ بتا کر کہ پانچ سے کم اوقیہ پر کوئی زکواۃ نہیں۔ پانچ کے عدد کو زکواۃ کے واجب ہوتے یا نہ واجب ہونے کے سلسلہ میں حدِّ فاصل قرار دے دیا ہے؟۔

(۱۱۷۷) چنانچہ آپؐ کے اس فرمان سے ہمارے لئے یہ بات کھل کر واضح ہوگئی کہ پانچ کے عدد سے جو کچھ بھی زائد ہو خواہ وہ تھوڑا ہو یا زیادہ اس پر زکواۃ واجب ہو گی۔ اس لئے کہ آپؐ نے پانچ کے بعد کسی اور عدد کو متعین نہیں فرمایا جیسے کہ آپؐ نے مویشیوں کی زکواۃ کے سلسلہ میں مختلف عدد متعین فرماتے ہوئے فرمایا: "ہر پانچ (اونٹوں) پر ایک بکری اور ہر دس پر دو بکریاں۔" چنانچہ آپؐ نے مویشیوں کی زکواۃ کو مختلف خصوصی تدریجی مراتب میں تقسیم فرمایا اور ہر دو عدد کی درمیانی زائد تعداد[1] کو بے زکواۃ لئے چھوڑ دیا۔ دوسری طرف آپؐ نے بے جان اموال نیز زمین کی جملہ پیداوار کو ایک حیثیت دے کر ان پر قید لگائی کہ وہ پانچ تک یا اس سے زائد ہو جائیں۔ پھر اس کی تشریح حضرات علیؓ و ابن عمرؓ و ابراہیمؒ و عمر ابن عبد العزیزؒ نے اپنے اس قول سے کر دی۔ "اور جو اس سے زائد ہو تو اس پر اسی حساب سے زکواۃ لی جائے گی۔" پھر ان کی اسی شرح کا اتباع ابن ابی لیلیؒ، سفیانؒ اور مالکؒ نے بھی کیا۔

ابو عبیدؒ:۔ اور یہی ہمارا قول بھی ہے۔

---

[1] یعنی پانچ اونٹوں کے بعد دس ہونے تک چھٹے، ساتویں، آٹھویں اور نویں اونٹ پر کوئی اضافہ نہیں فرمایا۔

باب

تجارتی سامانوں اور قرضوں پر زکوٰۃ، نیز ان پر واجبات کا بیان

تاجروں کے تمام سامانِ تجارت کا حساب لگا کر اُس قیمت پر زکواۃ لی جائے گی

(۱۱۷۸) عبدالرحمٰن بن عبد قاریؒ کہتے ہیں۔ میں حضرت عمر بن الخطابؓ کے عہد میں بیت المال پر مامور تھا۔ ان کا یہ دستور تھا کہ جب وظائف دئے جاتے تو تاجروں کا تمام مال جمع کر کے موجود و غیر موجود سب کا حساب کرتے۔ پھر موجودہ مال میں سے موجود و غیر موجود مال کی زکواۃ لے لیتے۔

(۱۱۷۹) حماس کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ میرے پاس سے گذرے تو اُنھوں نے کہا: "اے حماس! اپنے مال کی زکواۃ ادا کرو"۔ اس پر میں نے کہا: "میرے پاس ترکشوں اور دباغت دی ہوئی کھالوں کے علاوہ کوئی مال نہیں ہے۔" اس پر انہوں نے کہا: "ان اشیاء کی قیمتوں کا تعین کر کے اس قیمت کے لحاظ سے زکواۃ ادا کرو۔"

(۱۱۸۰) ایک اور سند سے بھی حماس حضرت عمرؓ سے یہی مضمون روایت کرتے ہیں۔

(۱۱۸۱) موسیٰ بن عقبہ (نافع یا کسی اور درمیانی راوی کے واسطہ سے جو مجھے معلوم نہیں) ابن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں: "تجارتی اغراض کے تحت رکھے جانے والے غلاموں اور کپڑوں پر زکواۃ دی جائے گی۔"

(۱۱۸۲) جابر بن زید سے مروی ہے کہ انہوں نے اسی قسم کے مسئلہ میں کہا "جب تمہارا زکوٰۃ نکالنے کا وقت آئے تو ایسے (تجارتی) سامان کی قیمت لگا کر اس کی زکوٰۃ ادا کر دو۔"

(۱۱۸۳) اگرچہ حضرت ابن عباسؓ کہا کرتے تھے: "اتنا انتظار کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ وہ اس سامان کو بیچ دے (اور پھر زکوٰۃ دے دے اور اس عرصہ میں) زکوٰۃ بہر حال واجب رہے گی۔"

قرض دی ہوئی رقم پر زکوٰۃ ادا کی جائے گی اور قرض لی ہوئی رقم منہا کی جائے گی

(۱۱۸۴) میمون بن مہران کہتے ہیں: "جب تمہارا زکوٰۃ نکالنے کا وقت آجائے تو اپنی نقدی اور تجارتی سامان کا جائزہ لو، اور جملہ سامان تجارت کی نقدی میں قیمت متعین کر لو۔ پھر اس رقم میں اس قرض کو بھی شامل کر لو جو تم نے کھاتے پیتے آسودہ حال کو دے رکھا ہو۔ پھر اس مجموعی رقم میں سے وہ قرضہ جات جو تم پر واجب الادا ہوں منہا کر کے بقیہ رقم کی زکوٰۃ ادا کر دو۔"

(۱۱۸۵) حسن کہتے ہیں: "جب وہ مہینہ آجائے جسے کسی شخص نے اپنی زکوٰۃ نکالنے کے لئے متعین کیا ہو تو وہ اپنے تمام مال کی زکوٰۃ ادا کرے۔ اس میں تمام تجارت کے لئے

ڈوبا ہوا قرض شمار نہیں ہوگا

خریدا ہوا مال اور تمام قرض دی ہوئی رقوم شامل ہیں بجز ان قرض رقوم کے جو ڈوبی ہوئی ہوں اور ان کے واپس ملنے کی اُمید نہ ہو۔

تجارتی سامان کی قیمت متعیّن کر کے اُسے نقد رقم میں جوڑ کر جملہ رقم پر زکوٰۃ ادا کی جائے گی

(۱۱۸۶) ابراہیم کہتے ہیں: "زکوٰۃ کا وقت آنے پر آدمی اپنے جملہ تجارتی سامان کی قیمت متعین کرے گا پھر اُسے اپنے (نقد) مال کے ساتھ جوڑ کر اس کی زکوٰۃ ادا کرے گا۔

تجارت کے لئے موتی جواہرات پر زکواۃ

(۱۱۸۷) مجاہد کہتے ہیں: "جواہرات اور موتی نیز اس قسم کی چیزوں پر زکواۃ نہیں ہوتی - الّایہ کہ یہ اشیاء تجارتی اغراض کے لئے خریدی ہوں"

(۱۱۸۸) حماد ابراہیم سے، اور سالم سعید بن جُبیر سے روایت کرتے ہیں کہ ان دونوں حضرات نے بھی مذکورہ بالا روایت کے مطابق بات کہی۔

(۱۱۸۹) عطاء سے بھی ایسی ہی روایت منقول ہے۔

(۱۱۹۰) **ابوعبیدؒ**:- مذکورہ بالا جملہ روایات کے بموجب سفیان بن سعید اور اہلِ عراق اس بات کے قائل ہیں کہ تجارتی سامان کی قیمت متعین کرکے اسے بقیہ مال میں ملایا جائے گا (پھر سب کی زکواۃ ادا کی جائے گی)

(۱۱۹۱) مالک بن انس بھی ایسے مالِ تجارت کے لئے جس کو گھمایا جائے اور اُس سے اُس کے مالک کو قابلِ ادائی زکواۃ نقد رقم[۱] کی یافت نہ ہوتی ہو ایسی ہی رائے رکھتے ہیں،

برسوں رُکے ہوئے سامانِ تجارت کی زکوٰۃ

تاہم ان کا کہنا ہے: "رہا وہ سامانِ تجارت جو برسوں سے اُس کے مالک کے پاس پڑا ہو تو اس پر اس کے بیچنے سے پہلے اسے کچھ زکواۃ نہیں ادا کرنا ہوگی۔ اور جب وہ فروخت ہوجائے تو اس کی قیمت پر صرف ایک (سال ہی کی) زکوٰۃ دے گا۔ یہ اس لئے کہ اس مالک پر یہ ضروری نہیں کہ وہ کسی مال کی زکوٰۃ اس مال کے علاوہ کسی اور مال میں سے دے۔

ابوعبیدؒ: مجھے یحییٰ بن بکیر نے ان کی یہ تمام تفصیلی رائے بتائی۔

(۱۱۹۲) **ابوعبیدؒ**:- اس بارے میں ہمارا عندیہ وہی ہے جو سفیان اور اہلِ عراق کا ہے یعنی یہ کہ تجارتی سودے کے رقم میں تبدیل ہونے یا (تبدیل) نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اسی کی تائید صحابہؓ و تابعینؒ کی بالتواتر روایات سے ہوتی ہے۔

---

[۱] - اس سے مطلب یہ ہے کہ سامان کے عوض سامان ہی آتا رہتا ہو۔

ان سب کا اجماع ہے کہ موجودہ مال کو تمام بقیہ نقدی میں شامل کیا جائے گا۔ پھر اگر یہ مجموعہ اتنا ہو جائے کہ اس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہو تو وہ اس کی زکوٰۃ ادا کرے گا۔ اور ہمارے علم میں ایسا کوئی عالم نہیں ہے جس نے مالکؒ سے قبل تجارتی سامان کے نقدی میں تبدیل، سونے یا نہ تبدیل ہونے میں فرق کیا ہو۔

(۱۱۹۳) ایک فقہ میں کلام کرنے والے نے کہا ہے کہ تجارتی اموال پر زکوٰۃ نہیں لگے گی۔ اس پر اس کا استدلال یہ ہے کہ جو حضرات مالِ تجارت پر زکوٰۃ کے قائل ہیں وہ اسی وقت زکوٰۃ واجب قرار دیتے ہیں۔ جب اس مال کی قیمت (کا تعین) ہو جائے۔ پھر وہ کہتا ہے: "ہر مال پر خود اسی میں سے زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اور قیمت سامان کے علاوہ اور کچھ چیز ہے۔" اور اس تاویل کی بناء پر وہ اُس (مالِ تجارت) سے زکوٰۃ کا لعدم قرار دیتا ہے۔

(۱۱۹۴) ہمارے خیال میں اس نے تاویل (نتیجہ نکالنے) میں غلطی کی ہے۔ اس لئے کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اور آپؐ کے صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کی سنت میں یہ ملتا ہے کہ زکوٰۃ کا حق تو یہی ہے کہ وہ جس مال پر عائد ہو اسی میں سے لی جائے لیکن پھر وہ ایسی صورت میں منتقل ہو جاتی ہے جس کی ادائی زکوٰۃ دینے والے کو اصل مال کی نسبت زیادہ آسان ہو جائے۔

زکوٰۃ اصل مال کے علاوہ متبادل اشیاء یا نقدی کی صورت میں لی جا سکتی ہے

(۱۱۹۵) اسی مضمون کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا وہ مکتوب گرامی واضح کر رہا ہے جو آپؐ نے جزیہ کے سلسلہ میں حضرت معاذؓ کو یمن بھیجا تھا: "ہر بالغ مرد سے ایک دینار یا اس کے مساوی یمنی کپڑا" (جزیہ میں لیا جائے)

اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے نقد رقم کے بجائے (جزیہ میں) مالِ تجارت بھی لے لیا۔

(۱۱۹۶) پھر آپؐ نے اہلِ نجران کے لئے یہ لکھ بھیجا: "ان لوگوں کو سالانہ

دو ہزار جوڑے دینے ہوں گے یا اس کے مساوی اوقیہ"۔ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے مالِ تجارت کے بجائے نقد رقم بھی لے لی۔

(۱۱۹۷) حضرت عمرؓ جزیہ میں اونٹ لے لیا کرتے تھے۔ حالانکہ بنیادی طور پر سونے یا چاندی کی صورت میں وصول کیا جانا چاہیئے۔

(۱۱۹۸) اور حضرت علیؓ نے بھی جزیہ میں سوئیاں، رسیاں اور رسوئے لئے ہیں۔

(۱۱۹۹) اور حضرت معاذؓ سے خود زکواۃ کے بارے میں یہ مروی ہے کہ انہوں نے زکواۃ (کو بجائے نقد لینے کے اس) کے عوض مالِ تجارت لے لیا۔ اس کا اظہار ان کے اس قول سے ہو رہا ہے "تم میرے پاس یمنی کپڑے، چادریں یا دھسے لے آؤ تو میں بجائے نقد زکواۃ کے تم سے یہ چیزیں لے لوں گا۔ اس لئے کہ تمہیں ان کے دینے میں آسانی ہوتی ہے اور یہ اشیاء مدینہ میں مہاجرین کے لئے زیادہ نفع بخش ہیں۔"

سونے کی زکواۃ چاندی کی صورت میں

(۱۲۰۰) حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ ان کی بیوی نے ان سے کہا "میرے پاس ایک گلوبند ہے جس میں بیس مثقال (سونا) ہے۔" تو انہوں نے کہا "اس کی زکواۃ پانچ درہم ادا کر دو۔"

(۱۲۰۱) **ابو عبیدؒ**:- یہ تمام مثالیں ایسی چیزوں کی ہیں جن پر زکواۃ واجب ہوتی ہے اور پھر ان کی زکواۃ بجائے ان اموال کے دوسرے اموال میں سے لی گئی ہے۔ اور اس بناء پر کہ خود ان چیزوں میں سے زکواۃ نہیں دی جاسکی ان سے زکواۃ ساقط نہیں کی گئی، اس لئے کہ زکواۃ تو ایک نہ ٹلنے والا حق ہے جسے کوئی چیز بھی زائل نہیں کر سکتی۔ یہ الگ بات ہے کہ زکواۃ دینے والا ان اشیاء کو محفوظ و سالم رکھنے کی غرض سے ان میں سے نہیں بلکہ دیگر اموال سے ان پر واجبی حق ادا کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ یہ صورت اس شخص کے لئے جس سے زکواۃ لی جاتی ہے زیادہ آسان ہوتی ہے۔ بس یہی صورت اموال تجارت کی ہے کہ بنیادی طور پر تو ان کی زکواۃ خود انہی میں سے لینا چاہیئے لیکن اندریں صورت اس مال کے کٹنے ٹوٹنے اور کچھ اجزاء کم ہونے کی وجہ سے مالکان کو نقصان پہنچنے کا امکان ہے لہٰذا انہیں اجازت دے دی گئی کہ

وہ قیمت کا تعین کر کے اس کے لحاظ سے زکواۃ نکال دیں۔

(۱۲۰۲) اب اگر ایسی صورت ہو کہ کسی شخص کے مالِ تجارت پر زکواۃ واجب ہوتی ہو اور اس کی قیمت کا تعین پورے ایک بیل یا ایک جانور یا ایک غلام کی قیمت کے برابر ہو جائے اور وہ بعینہ اس پوری چیز کو اپنے مال کی زکواۃ میں ادا کر دے تو ہماری نظر میں وہ زکواۃ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ محسن بھی ہوگا۔ اور اگر اس پر یہ آسان ہوتا ہو کہ وہ اس متعینہ رقم کے عوض سونا یا چاندی دے دے تو اسے اس کی بھی اجازت ہوگی۔

یہ ہے تاجروں کے اموال پر زکواۃ نکالنے کے بارے میں ہماری رائے، اور اسی پر تمام مسلمانوں کا اتفاق و اجماع ہے کہ اموالِ تجارت پر زکواۃ اٹل فریضہ ہے۔

(۱۲۰۳) اب رہا دوسرا (اس کے برخلاف) قول، سو ہمارا خیال یہ ہے کہ علماء میں سے کسی نے بھی وہ مسلک اختیار نہیں کیا۔

زکواۃ صرف تجارتی مال پر لگے گی

(۱۲۰۴) یہ واضح رہے کہ زکواۃ سامان اور غلام وغیرہ پر صرف اسی وقت لگے گی جبکہ یہ برائے تجارت ہوں اور دیگر صورتوں میں ان پر زکواۃ نہیں لگے گی۔ اس لئے کہ سنت سے ثابت ہے کہ جب غلام یا سامان اپنے فائدہ کے دیگر کاموں میں استعمال ہوں تو ان پر زکواۃ معاف ہو جاتی ہے۔ اسی بناء پر مسلمانوں نے حمل و نقل اور کھیتی وغیرہ کا کام کرنے والے اونٹوں اور بیلوں کو زکواۃ سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔

تجارتی مال کی تعریف

یاد رکھئے تجارتی مال وہ کہلائے گا جسے بڑھایا اور پھیلایا جائے اور جس سے اضافہ و منافع مقصود ہو۔ اندریں صورت یہ مالِ تجارت ان مویشیوں کے ریوڑوں سے مشابہ ہوتا ہے جو مویشی بڑھانے (افزائشِ نسل) اور ان سے دیگر اضافی فوائد و منافع چاہنے کے لئے پالے جاتے ہیں، اور اس لئے ان پر زکواۃ واجب ہو جاتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مویشیوں میں سے ہر قسم کی جداگانہ اُن کے قاعدوں کے مطابق زکواۃ دی جائے گی۔ مطلب یہ ہے کہ تجارتی اموال خواہ کتنی ہی مختلف قسموں کا ہو ان سب کی مجموعی قیمت متعین کر کے اس پر زکواۃ دی جائے گی۔ لیکن مویشیوں کی زکواۃ ان کے مذکورہ فرائض کے مطابق ادا کی جائے گی۔ اس طرح یہ دونوں

(مویشی اور اموال تجارت)، ایک اصل پر مل جاتے ہیں اور وہ ہے "ہر دو پر زکواۃ کا واجب ہونا" پھر فروع میں ہر اصل اپنے اصول و قواعد کی طرف پلٹے گی۔

یہ ہے ان تجارتی اموال کی زکواۃ کا بیان جو ان کے مالکوں کے پاس موجود ہوں۔

قرض دینے والے پر زکواۃ ادا کرنے کے سلسلہ میں مختلف اقوال (۱)، وہ قرضے جو قابلِ اعتماد لوگوں پر ہوں اور اُن کی وصولی کی اُمید ہو

(۱۲۰۵) لیکن اگر اس کے ساتھ ساتھ قرضے بھی ہوں تو قرضوں کی زکواۃ کے بارے میں ـــــ خواہ وہ تجارتی ہوں یا غیر تجارتی ـــــ اب تک نئے اور پُرانے زمانہ میں اسلاف سے پانچ مختلف اقوال منقول ہیں:

(۱۲۰۶) **پہلا قول**:۔ اگر قرض آسودہ حال اشخاص پر ہو تو موجودہ مال کے ساتھ اس قرض کی بھی زکواۃ فوراً ہی ادا کر دے۔

(۱۲۰۷) **دوسرا قول**:۔ اگر اس قرض کے ملنے کی اُمید نہ ہو تو وصولی تک اس کی زکواۃ ملتوی کر دے۔ پھر وصولی کے بعد تمام گذشتہ سالوں کی زکواۃ ادا کر دے۔

(۱۲۰۸) **تیسرا قول**:۔ اس قرض کی وصولی کے بعد صرف ایک سال کی زکواۃ ادا کرے خواہ اس قرض پر کئی سال گذر چکے ہوں۔

(۱۲۰۹) **چوتھا قول**:۔ قرض کی زکواۃ قرض لینے والے پر واجب ہوگی اور مالکِ رقم (قرض دینے والے) سے اس کی زکواۃ نہیں لی جائے گی۔

(۱۲۱۰) **پانچواں قول**:۔ قرض کی رقم پر کلی طور سے زکواۃ ساقط کر دی جائے گی اور قرض دار یا قرض خواہ دونوں میں سے کسی پر اس کی زکواۃ واجب نہ ہوگی۔ خواہ یہ قرض آسودہ حال اور قابلِ اعتماد ہی کو کیوں نہ دیا گیا ہو۔

ان میں سے ہر قول کی تائید میں روایات ملتی ہیں:۔

(۱) پہلے قول سے متعلق:۔

(۱۲۱۱) عبدالرحمٰن بن عبد قاری حضرت عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ جب وظائف کا اجراء ہوتا تو حضرت عمرؓ اُس کے حاصل کرنے والے کے موجودہ مال میں سے اس موجودہ مال

(وظیفہ) اور اس کے سوا اس کے غیر حاضر مال کی زکوٰۃ لے لیا کرتے تھے۔

(۱۲۱۲) عبدالملک بن ابی بکر راوی ہیں کہ حضرت عمرؓ بن الخطاب نے کہا: "جب زکوٰۃ ادا کرنے کا وقت آئے تو اپنا (لوگوں کو دیا ہوا) قرض اور اپنے پاس موجودہ مال کا حساب کر کے سب کو جمع کر کے اس مجموعہ کی زکوٰۃ ادا کردو۔"

(۱۲۱۳) سائب بن یزید راوی ہیں کہ حضرت عثمانؓ کہا کرتے تھے: "ایسے قرض پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے جسے تم قرض دار سے جب چاہو مطالبہ کر کے لے سکو اور ایسے قرض پر بھی جو آسودہ شخص پر ہو اور تم شرم یا رواداری کی وجہ سے اسے چھوڑے رکھو۔"

(۱۲۱۴) حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں: "ہر وہ قرض جس کی وصولی کی تمہیں اُمید ہو اس پر پورا سال گذرنے پر تمہیں زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے۔"

(۱۲۱۵) ابوالزبیر کہتے ہیں کہ میں نے جابرؓ بن عبداللہ سے اس سوال کے جواب میں کہ آیا وہ شخص جس کا دوسرے پر قرض ہو اپنی قرض دی ہوئی رقم پر زکوٰۃ ادا کرے گا؟ یہ جواب سُنا ہے: "ہاں۔"

(۱۲۱۶) جابر بن زید کہتے ہیں: "ہر اس قرض کی زکوٰۃ ادا کی جائے گی جس کی وصولی کی تمہیں اُمید ہے۔"

(۱۲۱۷) عثمان بن اسود کہتے ہیں کہ اُنھوں نے مجاہد سے اس بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے کہا: "ہر اُس چیز کی زکوٰۃ ادا کرو جو تمہارے خیال میں ملنے والی ہو۔"

(۱۲۱۸) یونس، حسنؒ سے اور مغیرہ، ابراہیمؒ سے روایت کرتے ہیں کہ یہ دونوں حضرات کہا کرتے تھے: "اس قرض کی زکوٰۃ ادا کی جائے گی جو آسودہ حال پر ہو۔"

(۱۲۱۹) میمون بن مہران کہتے ہیں: "جب تمہارا زکوٰۃ ادا کرنے کا وقت آجائے تو اپنے تمام مال اور جملہ ایسے قرضہ جات کا جائزہ لو جو آسودہ حالوں پر ہوں۔ پھر حساب کے بعد اس رقم کو جمع کر کے اس میں سے وہ قرض جو تمہارے اُوپر ہو منہا کر دو پھر جو رقم باقی بچے اس کی زکوٰۃ ادا کر دو۔

ابو عبیدؒ: یہ ہیں وہ روایات جو اس قرض کے متعلق آئی ہیں جس کی وصولی کی اُمید ہو

اور جسے اپنے مال کے ساتھ ملاکر اس رقم کا مالک اس مجموعہ پر زکواۃ دے گا۔ اور یہ جملہ روایات پہلے قول سے متعلق ہیں۔

(ii) دوسرے قول یعنی اس قرض سے متعلق روایات جس کے ملنے کی اُمید نہ ہو۔

(۱۲۲۰) ابن سیرین عَبیدہ کی وساطت سے راوی ہیں کہ حضرت علیؓ نے اس قرض کے بارے میں جس کی وصولی غیر یقینی (مشکوک و مشتبہ) ہو، کہا: "اگر وہ (شخص جو قرض کی رقم کی وصولی سے ناامید ہو چکا ہو) سچا ہے تو جب وہ اسے وصول کرلے تو اس تمام مدت کی زکواۃ ادا کرے جو اس پر گذری ہو۔"

(۱۲۲۱) ایک اور سند سے بھی یہی مضمون ابن سیرین، عبیدہ کی وساطت کا ذکر کئے بغیر حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں۔

(۱۲۲۲) ابوالنضر راوی ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ نے قرض کے متعلق کہا: "اگر تمہیں اس کی وصولی کی اُمید نہ ہو تو وصولی تک اس کی زکواۃ نہ ادا کرو۔ لیکن جب اسے وصول کرلو تو اس پر جتنی زکواۃ واجب ہو اسے ادا کردو۔"

(iii) تیسرے قول سے متعلق روایات:-

(۱۲۲۳) حسن کہتے ہیں: "اگر کسی شخص کا ایسا قرض ہو جس کی وصولی کی اُمید وہ منقطع کر چکا ہو۔ اور بعد میں وہ رقم اسے مل جائے تو وہ اس کی ایک سال کی زکواۃ ادا کردے۔"

(۱۲۲۴) میمون بن مہران کہتے ہیں: "مجھے عمر بن عبدالعزیزؒ نے میرے اس مال کے بارے میں ایک خط لکھا جو ایک شخص نے مجھے واپس پلٹا دیا تھا۔ (اپنے خط میں) انہوں نے مجھے حکم دیا کہ میں اس مال پر گذشتہ سالوں کی زکواۃ ادا کردوں۔ لیکن اس کے پیچھے ہی ایک دوسرے خط میں انہوں نے لکھا؛ "وہ ڈوبا ہوا مال تھا لہٰذا اس میں سے صرف ایک سال کی زکواۃ نکالو۔"

(۱۲۲۵) میمون بن مہران کہتے ہیں، مجھے عمر بن عبدالعزیزؒ نے (دجلہ و فرات کے درمیان) جزیرہ کے بیت المال کی ان رقوم کی بابت لکھا جو وہاں لوگوں کے تلف شدہ حقوق کے

ضمن رکھی ہوئی تھیں۔ پھر روایت کی بقیہ عبارت ویسی ہی ہے جو اُوپر کی روایت میں گذر چکی۔

(۱۲۲۶) جعفر کہتے ہیں میں نے میمون اور یزید بن یزید کو زکواۃ کے بارے میں مذاکرہ کرتے سُنا۔ یزید نے کہا: "عمر بن عبدالعزیز جب کسی آدمی کو اس کی مزدوری دیتے تھے تو اس میں سے زکواۃ لے لیا کرتے تھے۔ اور جب تلف شدہ حقوق واپس دیتے تھے تو ان میں سے زکواۃ لے لیا کرتے تھے۔ اور جب اہلِ وظائف میں وظائف تقسیم ہوتے تو ان پر بھی زکواۃ لے لیا کرتے تھے۔

(iv) چوتھے قول سے متعلقہ روایات :-

(۱۲۲۷) ابراہیم ایسے قرض کے متعلق جس کی ادائی کے بارے میں مالک کے ساتھ ٹال مٹول کیا جائے اور وہ اسے حساب میں شمار کرتا رہے۔ کہتے ہیں: "اس کی زکواۃ وہ شخص ادا کرے گا جو اس سے مزے اُڑا رہا ہے۔"

(۱۲۲۸) عطاء سے بھی ایسی ہی روایت منقول ہے۔

(v) پانچویں قول سے متعلق روایات :

(۱۲۲۹) عکرمہ کہتے ہیں : "قرض پر کوئی زکواۃ نہیں ہے۔"

(۱۲۳۰) عطاء کہتے ہیں: "نہ وہ شخص قرض کی زکواۃ دے گا جو مقروض ہے اور نہ اس رقم کا مالک اسے وصول کرنے سے قبل اس کی زکواۃ دے گا۔"

(۱۲۳۱) عثمان بن اسود کہتے ہیں: "میں نے عطاء سے اس (قرض) کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے کہا: "جب تک وہ (مالک) اسے وصول نہ کرلے اس کی زکواۃ نہیں دے گا

(۱۲۳۲) اوزاعی عطاء سے روایت کرتے ہیں: "جہاں تک ہم مکہ والوں کا تعلق ہے ہم لوگ تو قرض کو ڈوبی ہوئی رقم تصوّر کرتے ہیں۔"

اس روایت کے ایک راوی ابن کثیر (اس جملہ کی شرح کرتے ہوئے) کہتے ہیں: "اس سے مراد ہے کہ قرض پر کوئی زکواۃ نہیں ہوتی۔"

ابو عبیدؒ :- یہ پانچ اقوال ہیں۔ (قرض پر) زکواۃ لینے کے بارے میں اہلِ حجاز و

اہلِ عراق میں اختلاف ہے۔

(۱۲۳۳) مجھے ابنِ بکیر نے مالکؒ کے متعلق بتایا کہ وہ کہتے تھے: "قرض رقم دینے والے پر۔ خواہ اس کی رقم سالوں تک اس کے پاس نہ رہی ہو۔ رقم کی وصولی کے بعد ایک ہی سال کی زکواۃ واجب الادا ہوگی اور یہ اس لئے کہ مالکِ رقم پر یہ واجب نہیں کہ وہ ایک مال کی زکواۃ اس کے علاوہ کسی اور مال میں سے دے۔" وہ کہتے ہیں "یہی حال اس تاجر کا ہے جس کے پاس سامانِ تجارت برسوں پڑا رہے پھر وہ اسے بیچ دے تو ایسے سامان پر بھی اس کی فروخت کے بعد اسے ایک ہی سال کی زکواۃ دینا ہوگی۔

(۱۲۳۴) مالک کہتے ہیں: "اگر اسے قرض کی رقم میں سے اتنی رقم ملے جس پر زکواۃ واجب نہ ہوتی ہو اور اس کے پاس اس کے علاوہ کچھ اور مال بھی ہو تو اگر اس مال کو ملانے کے بعد بھی اس کے پاس نصاب پورا ہوجاتا ہے تو وہ سب کی زکواۃ ادا کرے گا۔ اگر قرض کے ملے ہوئے اور موجودہ مال کے مجموعہ سے بھی بقدر نصاب نہیں بنتا لیکن بعد ازاں قرض کی کچھ اور رقم وصول ہونے پر تکمیل نصاب ہوجائے تو اس وقت وہ اس کی زکواۃ دے گا۔

(۱۲۳۵) ابو عبیدؒ: لیکن سفیان اور اہلِ عراق کے قول کے مطابق جب بھی قرض دی ہوئی رقم وصول ہو اس پر تمام گذشتہ سالوں کی زکواۃ واجب ہوجاتی ہے، بشرطیکہ قرض آسودہ و قابلِ اعتماد جگہ پر ہو، لیکن اگر قرض کی وصولی کی اُمید نہ ہو مثلاً قرضدار اپنے قرض کا انکار کردے، یا مال اس طرح ضائع ہوجائے کہ مالک کی اس تک رسائی نہ ہو یا وہ اس کی جگہ نہ پہچان سکے اور پھر بعد ازاں وہ مال اسے واپس مل جائے تو ایسی صورت میں مجھے ٹھیک سفیان کا قول تو یاد نہیں البتہ اہلِ عراق کے قول کا خلاصہ یہ ہے: "ایسے مال پر نہ تو گذشتہ سالوں میں سے کسی زمانہ کی زکواۃ واجب ہوگی اور نہ موجودہ سال کی۔ ان کی نظر میں یہ ایسا حاصل شدہ مال ہوگا جس پر اس کا مالک اب سے از سر نو سال شمار کرے گا۔"

(۱۲۳۶) ابو عبیدؒ:۔ ان اقوال میں سے میں ان بلند روایات کو انتخاب کروں گا

جو اولاً ہم نے حضرات عمر و عثمان و جابر و ابن عمر جیسے صحابہ کرام رضؓ سے نقل کی ہیں اور بعدازاں حضرات حسن، ابراہیم، جابر بن زید، مجاہد اور میمون بن مہران پر مشتمل تابعینؒ کا قول ہے اور وہ یہ کہ ایسے مال کو اپنے موجودہ مال میں ملاکر (اس کی قیمت کے لحاظ سے) زکوٰۃ ادا کرے بشرطیکہ قرض آسودہ حالوں اور بھروسہ والوں پر ہو، کیونکہ اندریں صورت اس مال کی حیثیت ہاتھ میں، یا گھر میں موجود مال کی سی ہو جاتی ہے۔

اور ان حضرات نے یا ان میں سے جس نے بھی ایسے قرض کو نقد مال میں ملاکر زکوٰۃ دینے کو پسند کیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جو وصولی تک اس کی زکوٰۃ موقوف رکھتا ہے وہ اپنے قرض کی زکوٰۃ روکے رکھنے کا کوئی متعین وقت مقرر نہیں کر سکے گا اور نہ ہی وہ اسے ادا کرے گا۔ اس لئے کہ لبسا اوقات قرض دینے والا اپنی رقم کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے مانگ لیتا ہے یعنی پانچ درہم یا دس درہم یا اس سے کم و بیش، اندریں صورت اسے ضرورت لاحق ہو گی کہ وہ ہر مانگے ہوئے درہم وغیرہ کا سال، مہینہ اور دن وار حساب رکھے۔ پھر اس کے مطابق اس کی زکوٰۃ نکالے حالانکہ اس سے بھی آسان پابندی و ذمہ داری کے ادا کرنے میں جو دل برداشتگی اور کوتاہی کا سامان ہے وہ ظاہر ہے۔ بناءبریں ان حضرات نے ازرہ احتیاط قدم اٹھاتے ہوئے کہہ دیا: "ایسے قرض کی زکوٰۃ اپنے جملہ مال میں ملاکر سال کے خاتمہ پر ادا کر دے" میرے نزدیک یہی اس مسئلہ کا عمدہ حل ہے۔ لیکن اگر کوئی مشکل پسند دوسری مشکل صورت پر اس حد تک قابو پا سکے کہ کوئی رقم حساب سے رہ نہ جائے تو اس پر یہ دروازہ کھلا ہوا ہے۔ ان شاء اللہ۔ اور یہ تمام بحث اس قرض سے متعلق ہے جس کی وصولی کی اُمید ہو اور جو قابل اعتماد لوگوں پر ہو۔

(ز) ایسے قرض جن کی واپسی کی اُمید کسی حد تک منقطع ہو گئی ہو

(۱۲۳۷) لیکن اگر صورت اس کے برخلاف ہو اور قرض دینے والا اپنے قرض کی بازیابی سے دیگسر) نا اُمید یا تقریباً نا اُمید ہو تو اندریں حالت میری رائے میں حضرت علی رضؓ کے اس قول پر عمل ہو گا جو انہوں نے غیر یقینی اور مشکوک و مشتبہ قرض کے بارے میں کہا ہے نیز حضرت ابن عباس رضؓ کے قول کے مطابق

جوانہوں نے اس قرض کے بارے میں کہا ہے جس سے مالک ناامید ہوچکا ہو یعنی فوری طور پر تو اس پر کچھ زکوٰۃ نہیں دی جائے گی، لیکن جب وہ اسے وصول کرلے تو تمام گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ دے۔

ابو عبید رح:- ان فقہاء کے مقابلہ میں جو ایسے قرض پر کوئی زکوٰۃ واجب نہیں سمجھتے یا جو اس پر صرف ایک سال کی زکوٰۃ واجب سمجھتے ہیں مجھے یہ قول زیادہ پسند ہے۔ اس لئے کہ یہ قرض دی ہوئی رقم، خواہ اس کا مالک اس سے ناامید ہوچکا ہو اور اسے اس کی وصولی کا کوئی امکان نہ نظر آتا ہو، بہرحال ہے تو اسی کا مال، اور جب بھی دلائل و ثبوت سے وہ اپنے مال کو ثابت کردے، یا قرضدار ناداری کے بعد تونگر ہوجائے تو قرض خواہ از سرِ نو اس کا مالک ہوجائے گا۔ اور اگر دنیا میں وہ اسے نہ مل سکا تو آخرت میں تو بہرحال وہ اسی کا ہوگا۔ اسی طرح اگر ضائع ہوچکنے کے بعد وہ مال مل جاتا ہے تو دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں وہی مالک اس کا زیادہ حقدار ہوگا۔ بنا بریں میں نہیں سمجھتا کہ کسی حالت میں بھی اس مال سے اس (مالک) کی ملکیت زائل ہوتی ہو۔ اور اگر زائل ہوجاتی ہو تو پھر ملنے پر اس کا زیادہ استحقاق بھی ختم ہوجاتا ہے، پھر کس بناء پر اس مال سے اللہ کا حق ساقط قرار دے دیا جائے جبکہ مالک کی ملکیت برقرار رہتی ہے۔ اور اگر وہ اس مال کا مالک نہیں رہا تو پھر کس بناء پر وہ اس کا زیادہ مستحق ہوگا؟ میرے خیال میں یہ قول اس شخص کے خلاف بھی اثر انداز ہوگا جو ایسے مال کو (ملنے پر نیا) حاصل ہونے والا مال تصور کرتا ہے۔

ایسے شخص سے جو اس پر ایک سال کی زکوٰۃ واجب قرار دیتا ہے کہا جائے گا کہ اس مال کی مندرجہ ذیل دو صورتوں میں سے ایک ممکن ہے یا تو بقول اہلِ عراق یہ ایسا مال ہوگا جو ابھی ملا ہو اس بناء پر تمہیں بھی وہی قول کہنا پڑے گا جو وہ کہہ رہے ہیں یا پھر اس مال کی وہی حیثیت ہوگی جو اس مالک کے دیگر اموال کی ہو اندریں صورت حضرات علی رض اور ابن عباس رض کے قول کے مطابق اس پر جملہ گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

(۱۲۳۸) جہاں تک ایک سال کی زکوٰۃ ادا کرنے کا قول ہے ہمیں اس کی کوئی صحیح توجیہ نہیں ملتی لہٰذا ہمارا فیصلہ ان دو صحابہ رض کے قول کے مطابق ہے کہ اس مال کا مالک اس مال کی تمام گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا کرے گا۔ اسے صرف اتنی رعایت ہوگی کہ وہ اپنے مال

میں سے فوری طور پر اس مال کی سالانہ زکواۃ نہ ادا کرے اس لئے کہ وہ اس سے مایوس ہو چکا ہے۔ رہا یہ مسئلہ کہ (اس دوران میں) زکواۃ اس پر واجب رہی سو یہ اپنی جگہ قائم ہے اور رجب تک وہ اس مال کا مالک رہے گا کوئی چیز اس پر سے اس کی زکواۃ کو معاف نہ کرے گی۔

یہ ہیں وہ اقوال جو قرض کی وصولی سے قبل یا وصولی کے بعد زکواۃ دینے سے متعلق ہیں۔

قرض دی ہوئی رقم کو زکواۃ میں منہا کرنا

(۱۲۳۹) اب اگر صورت یہ ہو کہ مالک اپنی رقم میں سے کچھ بھی لینے کا خواہش مند نہ ہو بلکہ وہ قرض دار کو ادائی رقم معاف کر دینا چاہتا ہو اور پھر اس رقم کو اپنے موجودہ مال کی زکواۃ میں منہا کرنا چاہتا ہو تو بعض تابعینؒ نے اس کی اجازت دی ہے۔

(۱۲۴۰) عبدالواحد بن ایمن کہتے ہیں کہ میں نے عطاء بن ابی رباح سے دریافت کیا: "میرا ایک شخص پر قرض ہے اور وہ شخص تنگ حال ہے کیا یہ ہو سکتا ہے کہ میں اس سے وہ قرض معاف کر دوں اور اس رقم کو اپنے مال کی زکواۃ میں شمار کر لوں؟ تو اُنھوں نے جواب دیا: "ہاں"۔

(۱۲۴۱) حسن سے مروی ہے کہ وہ ایسا کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے بشرطیکہ یہ قرض کی رقم ہو۔ اگر تجارتی معاملات سے متعلق ہو تو پھر نہیں۔

(۱۲۴۲) ابو عبیدؒ:۔ ہمارا خیال ہے کہ حسنؒ اور عطاءؒ نے اس بارے میں جو رخصت دی ہے اس کا تعلق ان کے زکواۃ کے مسلک سے ہے۔ بات یہ ہے کہ عطاء قرض پر زکواۃ واجب قرار نہیں دیتے خواہ وہ آسودہ و قابلِ اعتماد شخص پر ہی کیوں نہ ہو اور حسن کی یہی رائے اس قرض کے بارے میں تھی جس کی وصولی کی اُمید نہ رہی ہو، اور اُن کی نظر میں یہ قرض جو تنگ حال پر ہے، یہی حیثیت رکھتا ہے کہ اس کی وصولی کی اُمید نہیں، اس طرح ان دونوں کے اقوال میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ جب ان دونوں حضرات نے یہ سمجھ لیا کہ اس غیر موجود مال پر زکواۃ نکالنا مالک کے لئے واجب نہیں تو انہوں نے

اس مال کو ایسی زکواۃ قرار دے دیا جیسے مالکِ مال نے نکال کر اس تنگ حال کو دے دی ہو اور اس طرح یہ رقم مالک کی رقم سے نکل کر الگ ہو گئی۔ اب اس کے سوا کوئی صورت ہی نہ رہی کہ وہ اپنے دل میں اسے زکواۃ سمجھ لے اور یہی نیت کر لے اور مقروض کو اس (قرض) سے بری الذمہ کر دے چنانچہ ان دونوں حضرات نے اس قرض کی رقم کو اس سے زکواۃ ادا کرنے کے لئے کافی سمجھا۔ اس لئے کہ بیک وقت اس عمل میں نیّت اور ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی صورت موجود ہے، لیکن جہاں تک میرا علم ہے مجھے نہ تو اس مسلک پر کوئی عمل کرنے والا ملا اور نہ اہل اثر و اہل رائے میں سے کوئی اس مسلک کو اختیار کرنے والا ملا۔

(۱۲۴۳) اور سفیان بن سعیدؒ سے جو روایات ملتی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ عمل ناپسند کرتے تھے اور اسے کافی نہ سمجھتے تھے۔ پھر میں نے یہ مسئلہ عبدالرحمٰنؒ سے دریافت کیا تو میں نے دیکھا کہ وہ بھی سفیان کی رائے پر قائم تھے اور مجھے یاد نہیں شاید اُنھوں نے اس مسلک کی تائید میں مالکؒ کا نام بھی لیا تھا۔

خود میری بھی یہی رائے ہے کہ ایسا قرض مندرجہ ذیل چند وجوہ کی بناء پر اس کے مالک کو بطور زکواۃ کفایت نہیں کرے گا۔

(۱۲۴۴) پہلی وجہ تو یہ ہے کہ زکواۃ سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی سنت اس عمل کے خلاف چلی آرہی ہے۔ آپؐ کا طریقہ یہ تھا کہ آپؐ مالداروں کے موجودہ مال پر زکواۃ لے کر اسے فقراء میں منتقل کر دیتے تھے۔ اور یہی دستور آپؐ کے بعد خلفاء کا رہا۔ اور ان میں سے کسی ایک سے بھی ہمیں یہ روایت نہیں ملتی کہ اس نے قرض کو زکواۃ میں شمار کر لینے کی اجازت دی ہو۔ حالانکہ ہم سب جانتے ہیں کہ لوگ اس زمانہ میں باہمی قرض کے معاملات کرتے رہتے تھے۔

(۱۲۴۵) دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ رقم ڈوبی ہوئی اور غیر موجود ہے جو بہرحال قرض کی شکل میں مالک کے ہاتھ سے نکل چکی ہے۔ بعد ازاں وہ چاہ رہا ہے کہ ڈوبنے اور تباہ ہونے کے بعد بذریعہ نیت اس رقم کو دوسری طرف منتقل کر دے اور یہ شکل

لوگوں کے باہمی لین دین کے معاملات میں بھی جائز نہیں —— تا آنکہ وہ قرض وصول کر کے پھر از سرِ نو دوسرے کو دے —— چہ جائیکہ اسے اللہ عزوجل اور بندوں کے درمیان جائز کر دیا جائے۔؟!

(۱۲۴۶) تیسری وجہ یہ ہے کہ اندریں صورت مجھے خطرہ ہے کہ یہ شخص اس ڈوبے ہوئے قرض سے اپنے مال کا بچاؤ کرنا چاہتا ہے اور اس ڈوبے سرمایہ کو اس بناء پر کہ یہ اس کی وصولی سے ناامید ہو چکا ہے اپنے مال کے بچاؤ کے لئے سہارا بنا رہا ہے۔ حالانکہ اللہ تبارک و تعالیٰ تو صرف وہی مال قبول فرماتا ہے جو بغیر کسی آمیزش کے خالصتہً دیا جاتا ہے۔

ابو عبید رح :۔ یہاں تک ہم نے ان قرضوں کی زکوٰۃ کے متعلق بیان کیا ہے جو رقم کا مالک (قرض خواہ) دوسروں کو دیتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص خود مقروض ہے تو اس کے قرض کے احکام اس سے جداگانہ ہیں اور اس ضمن میں بھی روایات ہیں :۔

مقروض سے زکوٰۃ لینا

(۱۲۴۷) سائب بن یزید کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عثمان ابن عفان رض کو یہ کہتے سُنا "یہ تمہاری زکوٰۃ نکالنے کا مہینہ ہے، سو جس شخص پر قرض ہو وہ اپنا قرض ادا کر دے تاکہ تم لوگ اپنے اموال کی زکوٰۃ نکال سکو، اور جس کے پاس اموال نہیں ان سے زکوٰۃ نہیں مانگی جائے گی تا آنکہ وہ رضا کارانہ لے آئے۔ اور جس شخص سے (زکوٰۃ) لے لی جائے اس سے آئندہ سال اسی ماہ سے قبل کچھ نہیں لیا جائے گا۔

(اس روایت کی سند کے ایک راوی) ابراہیم کہتے ہیں کہ روایت میں مذکور مہینہ سے مراد ماہ رمضان ہے۔

ابو عبید رح :۔ ایک روایت کی رو سے جس کے راوی کو میں نہیں جانتا حضرت عثمان رض کی مراد اس مہینہ سے ماہِ محرّم ہے۔

(۱۲۴۸) میمون بن مہران کہتے ہیں، جب (زکوٰۃ) کی ادائی کا وقت آ جائے تو اپنے جملہ مال کا جائزہ لو، پھر اس میں سے جو قرض تمہارے اُوپر ہو وہ منہا کر دو اور پھر جو باقی بچے اس کی زکوٰۃ ادا کرو۔"

(۱۲۴۹) ابراہیم کہتے ہیں کہ زکوٰۃ تو اس شخص پر واجب ہو گی جو کسی مال سے

فائدہ اٹھا رہا ہے :"

(۱۲۵۰) عطاء سے بھی اسی مضمون کی روایت منقول ہے۔

(۱۲۵۱) یزید بن خصیفہ نے سلیمان بن یسار سے اس شخص کے بارے میں دریافت کیا جس کے پاس مال ہو اور ساتھ ہی مقروض بھی ہو آیا اس پر زکوٰۃ واجب ہو گی ؟ تو انہوں نے کہا " نہیں "۔

(۱۲۵۲) ایسے شخص (کی زکوٰۃ) کے متعلق، جس کے پاس ہزار درہم نقد ہوں، اور ہزار درہم کا وہ مقروض ہو اور ہزار درہم کا (اس کے پاس) سامانِ تجارت ہو، لیث کہتے ہیں: اندریں صورت اس ایک ہزار پر جو اس کے پاس نقد ہیں زکوٰۃ واجب نہیں ہو گی۔

(۱۲۵۳) لیکن مالک کہتے ہیں: " ان پر اسے زکوٰۃ دینا ہو گی۔"

(۱۲۵۴) ابو عبیدؒ :۔ سفیانؒ کی رائے لیثؒ کے مطابق ہے اور یہی اہل رائے حضرات کا قول ہے۔

(۱۲۵۵) ابو عبیدؒ :۔ وہ شخص جو ایسی رقم پر زکوٰۃ واجب نہیں سمجھتا وہ نقد رقم کو قرض کے مقابلہ میں رکھ لیتا ہے اور مالِ تجارت کو یہ کہتے ہوئے شمار نہیں کرتا کہ بنیادی طور پر یہ کوئی ایسی چیز نہیں جس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہو۔

(۱۲۵۶) دوسرا کہتا ہے کہ اگرچہ بات ایسی ہی ہے تاہم یہ سامانِ تجارت اس کے مملوکہ اموال میں سے کچھ مال ہے۔ بنا بریں وہ اسے قرض کے مقابلہ میں رکھ دیتا ہے اور پھر کہتا ہے کہ وہ جو نقد رقم ہے اس پر اسے زکوٰۃ دینا ہو گی۔ میرے نزدیک بھی یہی صحیح قول ہے۔ اس لئے کہ بہر صورت یہ شخص فی الحال اپنے قرض کی رقم ایک ہزار سے زائد رقم کا مالک ہے۔ فرض کیجئے کہ اس کے پاس یہ نقد ہزار نہ ہوتے تو کیا قرضخواہ کو یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ اپنے قرض کی رقم کے عوض اس کو گرفت میں لے کر اس کا سامان فروخت کرا دے ؟

(۱۲۵۷) بعض حضرات جو قرض پر زکوٰۃ کے قائل نہیں کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت زکوٰۃ کے بارے میں یہ تھی کہ آپؐ قرض مویشیوں کو چھوڑ کر موجود مویشیوں پر زکوٰۃ لیتے تھے۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ اونٹوں میں کچھ قرض بھی ہوتے تھے مثلاً دیتوں اور دیگر

قرضہ جات کی صورت میں۔ لیکن ان پر زکواۃ نہیں لی جاتی تھی۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ یہی صورت نقد مال کی زکواۃ پر بھی باقی رہنا چاہیئے اور بناء بریں قرض پر زکواۃ نہیں لی جائے گی۔

بے جان نقد مال اور جانوروں کی زکواۃ میں فرق

(۱۲۵۸) **ابو عبیدؒ**:۔ جہاں تک یہ حضرات مویشیوں کا ذکر کرتے ہیں کہ ان کے قرضوں پر زکواۃ نہیں لی جاتی تھی تو ان کا یہ قول بجا ہے، اور اس بارے میں مسلمانوں میں کبھی کوئی اختلاف واقع نہیں ہوا۔ لیکن یہ حضرات اپنے اس اضافہ کو فراموش کر دیتے ہیں جو اس بارے میں یہ جانوروں پر بے جان مال کے قیاس سے پیدا کر دیتے ہیں۔ انہیں یہ یاد نہیں رہتا کہ سنت نے بے جان مال اور جاندار (مویشیوں) میں فرق کیا ہے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اپنے محصلینِ زکواۃ کو مویشیوں کے پاس بھیجدیا کرتے تھے اور وہ ان کے مالکوں سے طوعاً وکرہاً زکواۃ وصول کرتے تھے۔ اور یہی دستور آپؐ کے بعد (جملہ خلفاء و) ائمہ کا رہا۔ اور مویشیوں کی زکواۃ روکنے پر ہی حضرت ابو بکرؓ نے مانعینِ زکواۃ سے جنگ کی تھی۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم یا آپؐ کے بعد کسی امام سے یہ منقول نہیں کہ اُنہوں نے بے جان مال و دولت کی زکواۃ وصول کرنے پر کسی سے جبر روا رکھا ہو۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے بے جان اموال کے مالک اپنے مال کی زکواۃ از خود بغیر کسی اکراہ و جبر کے لے آتے تھے۔ گویا وہ ان کی ایسی امانتیں ہوتی تھیں جنہیں وہ ادا کرتے تھے۔ چنانچہ ان پر نقد و قرض (تمام ملکیت) کی زکواۃ ادا کرنا فرض ہوتی، اس لئے کہ وہ سب ان کی ملکیت ہے وہ اپنی اس مملوکہ دولت کے امین قرار پاتے تھے۔ لیکن جہاں تک مویشیوں کا معاملہ ہے تو وہ ایک فیصلہ ہے جو ان پر صادر کیا جائے گا۔ قاعدہ یہ ہے کہ لوگوں پر احکام کا اطلاق ظاہری اموال کے مطابق ہوتا ہے لیکن یہ (بے جان دولت) لوگوں کے اور اللہ کے درمیان ظاہری اور باطنی دونوں پہلوؤں سے باقی رہے گی۔ اب آپ ہی بتائیے کہ ان دونوں باتوں سے زیادہ کون سے دو فیصلے آپس میں ایک دوسرے سے جُداگانہ حکم رکھتے ہیں؟!

(۱۲۵۹) پھر ان دونوں حکموں میں ایک اور فرق یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی

(بے جان) دولت لے کر زکواۃ وصول کرنے والے کے پاس سے گذرے اور وہ کہے کہ یہ مال میرا نہیں ہے، یا میں اس مال کی زکواۃ ادا کر چکا ہوں، تو اس کی یہ بات صحیح مان لی جائے گی لیکن اس کے برخلاف اگر مویشیوں کا مالک زکواۃ وصول کرنے والے سے کہے کہ میں اپنے مویشیوں کی زکواۃ ادا کر چکا ہوں تو اس محصل کی مرضی ہے کہ وہ اس بات کی تصدیق نہ کرتے ہوئے اس سے زکواۃ وصول کر لے۔ الّا یہ کہ وہ جانتا ہو کہ اس سے قبل کوئی محصلِ زکواۃ یہاں پہنچا ہے۔ نیز اس سے ملتے جلتے اور بھی بہت سے فرق ہیں۔

باب

سونے، چاندی کے زیورات پر زکواۃ اور اس ضمن میں اختلافات کا بیان

زیورات پر زکواۃ واجب بتلانے والوں کے اقوال

(۱۲۶۰) عمرو بن شعیب اپنے باپ کی وساطت سے اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں: "اہلِ یمن کی ایک عورت اپنی بچی کے ساتھ جس کے ہاتھوں میں سونے کے دو کنگن تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی تو آپؐ نے فرمایا: "کیا تو اس (زیور) کی زکواۃ دیتی ہے؟" اُس نے جواب دیا: "نہیں"۔ تو آپؐ نے فرمایا: "کیا تمہیں یہ اچھا لگے گا کہ اللہ ان دو کنگنوں کے عوض تمہیں آگ کے کنگن پہنا دے؟"[1]۔

(۱۲۶۱) علقمہ سے روایت ہے کہ عبداللہ کی بیویؓ[2] نے کہا: "میرے پاس زیور ہے"۔ تو عبداللہ نے دریافت کیا: "کیا اس کی قیمت دو سو درہم ہو جائے گی؟ اگر وہ دو سو درہم تک پہنچ جائے تو اس پر زکواۃ واجب ہو گی"۔ اس (عورت) نے کہا: "میرے کچھ یتیم بھتیجے ہیں کیا میں اپنی زکواۃ انہیں دے سکتی ہوں؟" اس پر

---

[1] ۔ احمد، ترمذی، دار قطنی اور نسائی نے مرسلاً اس میں اضافہ کیا ہے کہ اس پر اس عورت نے وہ کنگن اُتار کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ڈال دئے اور کہا کہ یہ اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہیں۔ [2] یہ معاویہ یا ابو معاویہ کی بیٹی زینب ثقفیہ تھیں، بخاری و مسلم وغیرہما نے صدقہ سے متعلق ان کی حدیث روایت کی ہے۔

اُنہوں (عبداللہ) نے کہا: "ہاں"۔

(۱۲۶۲) ابراہیمؒ سے روایت ہے کہ عبداللہ کی بیوی کے کنٹھے میں بیس مثقال سونا تھا۔ تو اس (بیوی) نے اپنے شوہر سے دریافت کیا "کیا مجھے اس کی زکواۃ ادا کرنا ہو گی؟ تو انہوں نے جواب دیا: "ہاں، اس کی زکواۃ پانچ درہم ادا کردو"۔ اس نے پوچھا! "کیا میں یہ زکواۃ اپنے یتیم بھتیجوں کو دے دوں جو میری زیرِ نگرانی ہیں؟" انہوں نے کہا: "ہاں"

(۱۲۶۳) عمرو بن شیعب سے روایت ہے کہ عبداللہ بن عمرو نے اپنی تین بیٹیوں کو سات ہزار دینار کا زیور دیا چنانچہ وہ ہر سال اپنے تنومند آزاد کردہ غلام کو بھیجتے جو اس زیور کی زکوٰۃ نکالتا تھا۔"

(۱۲۶۴) عمرو بن شیعب "سالم" کے واسطہ سے راوی ہیں کہ عبداللہ بن عمرو مجھے حکم دیا کرتے تھے کہ میں ہر سال ان کی بیٹیوں کے زیورات جمع کرکے اُن کی زکواۃ نکالا کروں۔

ابو عبیدؒ: میرا خیال ہے کہ "سالم" وہی ہیں جو عبداللہ بن عمرو کے آزاد کردہ غلام ہیں

(۱۲۶۵) حضرت عائشہؓ سے مروی ہے: "زیورات پہننے میں کوئی مضائقہ نہیں بشرطیکہ اس کی زکواۃ ادا کردی جائے۔"[۱]

(۱۲۶۶) ابراہیمؒ کہتے ہیں: "زیورات پر زکواۃ واجب ہے۔"

(۱۲۶۷) ایک اور سند سے ابراہیمؒ ہی سے مروی ہے: "زیورات پر زکواۃ واجب ہے۔"

(۱۲۶۸) طاوس سے مروی ہے: "زیورات پر زکواۃ واجب ہے۔"

(۱۲۶۹) زیورات کی زکواۃ کے بارے میں مجاہد اور عطاء کہتے ہیں: "جب ان کی قیمت دو سو درہم یا بیس مثقال کے برابر ہو جائے تو ان پر زکواۃ دی جائے گی۔

---

[۱] اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ ابوداؤد، دارقطنی، حاکم اور بیہقی کی ایک اور روایت سے اس مضمون کی تائید ہوتی ہے یہ بھی حضرت عائشہؓ سے مروی ہے وہ کہتی ہیں "میں رسول اللہؐ کے پاس گئی تو آپؐ نے میرے ہاتھ میں چاندی کے کڑے دیکھے اور فرمایا: "عائشہ یہ کیا ہے؟ میں نے کہا: آپؐ کی خدمت میں زینت کے ساتھ آنے کے لئے یہ بنوائے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: کیا تم اُس کی زکواۃ دیتی ہو؟ میں نے کہا "نہیں"۔ آپؐ نے فرمایا: تمہیں آگ میں لے جانے کے لئے یہ کافی ہیں۔"

(۱۲۷۰) ایک اور سند سے بھی عطاء سے یہی مضمون مروی ہے۔

(۱۲۷۱) جابر بن زید کہتے ہیں: "زیورات پر ہر سال زکوٰۃ ادا کی جائے گی بشرطیکہ ان کی مالیت بیس مثقال (سونے) یا دو سو درہم (چاندی) کے مساوی ہو۔"

(۱۲۷۲) زیورات کی زکوٰۃ کے بارے میں ابن سیرین کہتے ہیں: "بیس مثقال پر نصف مثقال اور چالیس مثقال پر ایک مثقال (زکوٰۃ دی جائے گی)"۔

(۱۲۷۳) حسن سے زیورات کی زکوٰۃ کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا: "اس بارے میں ہمیں کوئی روایت نہیں پہنچی۔ اور میرے نزدیک ان کی زکوٰۃ ادا کرنا زیادہ پسندیدہ ہے۔"

(۱۲۷۴) جعفر بن برقان کہتے ہیں کہ میں نے میمون بن مہران سے زیورات کی زکوٰۃ کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے کہا: "ہمارے ہاں ایک (طلائی) کنٹھا ہے جس کی میں اتنی زکوٰۃ دے چکا ہوں جو اس کی قیمت کے برابر پہنچ چکی ہے۔

ابو عبیدؒ:۔ یہاں تک ان لوگوں کے اقوال درج کئے گئے جو زیورات پر زکوٰۃ دینے کے قائل ہیں۔ اب اس کے برخلاف ان حضرات کے اقوال درج کرتے ہیں جو زیورات پر زکوٰۃ کے قائل نہیں:۔

زیورات پر زکوٰۃ واجب نہ بتانے والوں کے اقوال

(۱۲۷۵) عمرو بن دینار کہتے ہیں کہ جابر بن عبداللہ سے زیورات کی زکوٰۃ نکالنے کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا: "ان پر زکوٰۃ نہیں"۔ پھر ان سے سوال کیا گیا: "اگر ان کی قیمت دس ہزار تک پہنچ جائے جب بھی ان پر زکوٰۃ نہیں دی جائے گی؟" تو انہوں نے کہا: "(یہ تو) بہت زیادہ ہے۔"[1]

(۱۲۷۶) نافع، ابن عمرؓ کی بابت کہتے ہیں کہ وہ اپنی بیٹیوں میں سے ہر ایک کی

---

[1] اسے شافعی اور بیہقی نے روایت کیا ہے، اور یہ اضافہ بھی کیا ہے: "اس کی زکوٰۃ اسے عاریت دینا ہے۔"

شادی دس ہزار پر کرتے تھے اور اس رقم میں سے چار ہزار کے زیور بناتے تھے۔ راوی کہتا ہے: "اور وہ لوگ اس زیور کی زکواۃ نہیں دیا کرتے تھے۔"

(۱۲۷۷) علی بن سُلیم کہتے ہیں کہ میں نے انس بن مالک سے دریافت کیا کہ کیا ایسی تلوار پر زکواۃ ادا کی جائے گی جس میں بہت سی چاندی لگی ہو؟ تو انہوں نے کہا: "نہیں"۔[۱]

(۱۲۷۸) ابراہیم بن ابی مغیرہ کہتے ہیں کہ میں نے قاسم بن محمد سے زیورات کی زکواۃ کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے کہا: "میں نے نہیں دیکھا کہ حضرت عائشہ رضؓ نے کبھی اس کی زکواۃ نکالنے کا اپنی سہیلیوں یا اپنی بھتیجیوں کو حکم دیا ہو۔"

(۱۲۷۹) یحییٰ بن سعید کہتے ہیں کہ ان کے ایک ساتھی نے قاسم بن محمد سے زیورات کی زکواۃ کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے کہا: "میں نے کسی کو یہ کام کرتے (زیورات کی زکواۃ ادا کرتے) نہیں دیکھا۔"

(۱۲۸۰) وہ کہتے ہیں کہ میں نے عَمرہ سے یہی مسئلہ دریافت کیا تو وہ بولیں: "میں نے کسی کو بھی یہ کام کرتے نہیں دیکھا۔ خود میرے پاس ایک ہار تھا جس میں بارہ سو (درہم لگے) تھے لیکن میں اس کی زکواۃ نہیں دیتی تھی۔"

زیورات کی زکواۃ انہیں پہننا اور عاریت دینا ہے

(۱۲۸۱) سعید بن المسیب رحؒ سے مروی ہے کہ زیوروں کی زکواۃ یہ ہے کہ انہیں پہنا جائے اور عاریت دیا جائے۔

(۱۲۸۲) حسن رحؒ سے روایت ہے: "زیورات کی زکواۃ یہ ہے کہ انہیں عاریت دیا جائے۔"

(۱۲۸۳) سعید بن المسیب کہتے ہیں: "جب زیورات پہنے جائیں اور انہیں

---

[۱]۔ دار قطنی میں علی بن سلیمان سے روایت ہے کہ انہوں نے انس بن مالک سے زیورات کی زکواۃ کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے کہا: "اس پر زکواۃ نہیں ہے۔"

نہ پہنے جانے والے زیورات پر زکواۃ عائد ہوگی

استعمال میں لایا جائے اور ان سے نفع حاصل کیا جائے تو ان پر کوئی زکواۃ نہیں ہوتی اور جب وہ نہ پہنے جائیں اور ان سے نفع نہ حاصل کیا جائے تو ان پر زکواۃ واجب ہوتی ہے۔"

(۱۲۸۴) قتادہ کہتے ہیں کہ یہ مقولہ مشہور تھا: "زیورات کی زکواۃ یہ ہے کہ انہیں عاریت دیا جائے اور پہنا جائے۔"

(۱۲۸۵) شعبی کہتے ہیں: "زیورات کی زکواۃ یہ ہے کہ انہیں عاریت دیا جائے۔"

(۱۲۸۶) شعبی کہتے ہیں: "زیورات پر کوئی زکواۃ نہیں ہے اس لئے کہ وہ عاریت دئے جاتے ہیں اور انہیں پہنا جاتا ہے۔"

(۱۲۸۷) مالک بن انس رح کہتے ہیں: "جب زیورات سے نفع حاصل کیا جائے اور انہیں پہنا جائے تو ان پر زکواۃ نہیں عائد ہوگی۔ اس لئے کہ اندریں صورت وہ بمنزلہ سامانِ استعمال ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ پہنا نہ جاتا ہو یا وہ شکستہ ہو یا وہ ڈلیوں کی شکل میں ہو تو اس پر زکواۃ دی جائے گی۔

(۱۲۸۸) ابو عبید رح:- جہاں تک سفیان رح اور اہلِ عراق یا ان کی اکثریت کا تعلق ہے ـ سو وہ سونے چاندی کی وجہ سے زیورات پر زکواۃ واجب سمجھتے ہیں خواہ وہ زیورات شکستہ ہوں یا غیر شکستہ۔

بہرحال یہ ایسا موضوع کہ اس پر اُمت میں صحابہ کرام رض سے لے کر تابعین اور ان کے بعد آنے والوں، سب ہی میں اختلاف رہا ہے۔ لہٰذا اس اختلاف کی بناء پر ہمیں موقع ملتا ہے کہ ہم غور و فکر کر کے اس مسئلہ میں سنت کی صحیح رہنمائی معلوم کریں۔

سونے اور چاندی سے متعلق آپ صلعم کی دو سنتیں

ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے

اور چاندی کے بارے میں دو سنتیں مقرر فرمائی ہیں: ایک تو بیع کے ضمن میں اور دوسری زکوٰۃ سے متعلق۔

(۱۲۸۹) بیع کے ضمن میں سونے چاندی سے متعلق آپؐ کی سنت کی وضاحت اس فرمان سے ہوتی ہے "چاندی (فضۃ) بعوض چاندی (فضۃ) برابر برابر لی جائے گی۔" اس فرمان میں آپؐ نے چاندی کے لئے عربی لفظ فِضّۃ استعمال فرمایا جو ہر اس چیز کو جو چاندی کی جنس سے ہے اپنے اندر لے لیتی ہے خواہ وہ ڈھلی ہوئی ہو یا بے ڈھلی ہو۔ چنانچہ خرید و فروخت میں ہر قسم کی چاندی، خواہ وہ سکہ کی صورت میں ہو یا زیورات کی یا ڈلیوں کی، ایک حیثیت رکھتی ہے۔

اسی طرح آپؐ کا فرمان ہے: "سونا (ذَھَبٌ) سونے کے عوض برابر لیا جائیگا۔" چنانچہ اُس کی رُو سے سونا خواہ دینار کی شکل میں ہو یا زیورات کی یا ڈلیوں کی ایک حیثیت رکھے گا۔

(۱۲۹۰) لیکن زکوٰۃ کے بارے میں سونے چاندی سے متعلق آپؐ کی سنت کی ترجمانی اس حدیث سے ہوتی ہے "جب چاندی کے سکے (الرِّقَۃ) پانچ اوقیہ ہو جائیں تو ان پر چالیسواں حصہ زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ کے بیان میں چاندی کی جملہ اقسام (فِضّۃ) سے صرفِ نظر کرتے ہوئے چاندی کے سکوں (الرِّقَۃ) کو خصوصیت بخشی، اور آپ نے یہ نہ فرمایا کہ جب چاندی (فِضّۃ) اتنی مقدار ہو جائے تو اس پر اتنی زکوٰۃ ہو گی، بلکہ آپؐ نے زکوٰۃ کے لئے (الرِّقَۃ) چاندی کے سکوں کی شرط رکھی۔ اور جہاں تک ہمارا علم ہے یہ لفظ (الرِّقَۃ) عربوں کے مستند کلام میں چاندی کے ڈھلے ہوئے عوام الناس میں مستعملہ سکوں کے علاوہ اور کسی قسم کی چاندی کے لئے نہیں بولا جاتا۔ یہی حال اوقیہ کا ہے کہ اس سے درہم کے سوا کوئی اور چیز مراد ہی نہیں لی جا سکتی، اور ہر اوقیہ چالیس درہم کا ہوتا ہے۔

بعد ازاں مسلمانوں نے اجماع کے ساتھ یہ طے کر لیا کہ ڈھلے ہوئے دیناروں (سونے کے سکوں

پر بھی دراہم کی طرح زکواۃ واجب ہے ۔ اور خود بعض (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی) مرفوع احادیث میں بھی دیناروں کا ذکر موجود ہے۔

(۱۲۹۱) عمرو بن شعیب اپنے باپ اور اپنے دادا کی وساطت سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا "سونے کی بیس مثقال مقدار سے کم پر نیز دوسو درہم سے کم پر، کچھ زکواۃ واجب نہیں ہوتی۔"

زیورات اور سکّوں میں فرق

ان تصریحات کی موجودگی میں سونے اور چاندی (کے سکوں پر زکواۃ کے بارے میں) مسلمانوں میں کوئی اختلاف رونما نہ ہوا۔ لیکن زیورات کے بارے میں اختلاف ہوئے اس لئے کہ وہ خود کام میں آنے والے، اور زینت و آرائش کا سامان، ہوتے ہیں، لیکن سکوں کی شکل میں سونا چاندی سوائے اس کے کہ وہ اشیاء کی قیمت کا کام دے سکیں اور کسی کام نہیں آسکتے ۔ اور ان کا خرچ کے علاوہ کوئی مفید مصرف نہیں ہوسکتا ۔ بناء بریں ان (سکّوں) کا حکم زیورات کے حکم سے جُداگانہ ہوگیا کیونکہ یہ زیورات سامانِ آرائش اور سامانِ استعمال (بھی) ہیں اور یہاں اُن کی سامانِ استعمال و انتفاع کی حیثیت باقی رکھی گئی ہے اور جس نے ان پر زکواۃ ساقط کی ہے اسی وجہ سے ساقط کی ہے۔

اور اسی مفہوم کو مدّنظر رکھتے ہوئے اہلِ عراق کا قول ہے: کھیتی وغیرہ میں کام کرنے والے اونٹوں اور بیلوں پر کوئی زکواۃ واجب نہیں ہوتی ۔ اس لئے کہ اندریں صورت یہ جانور غلاموں اور سامانِ انتفاع سے مشابہ ہوجاتے ہیں۔ پھر یہ حضرات زیورات پر زکواۃ واجب قرار دیتے ہیں اور اہلِ حجاز جوتے جانے والے اونٹوں اور بیلوں پر زکواۃ واجب قرار دیتے ہیں اور زیورات پر زکواۃ واجب نہیں سمجھتے ۔ حالانکہ ہر دو فریق پر لازم تھا کہ یا تو وہ اپنے مسلک کے لحاظ سے ان دونوں کو ایک قرار دیتے یا دونوں سے زکواۃ ختم کردیتے یا پھر دونوں پر زکواۃ واجب قرار دیتے۔ جس طرح ہمارے ہاں ان دونوں کی حیثیت برابر ہے اور دونوں پر زکواۃ واجب نہیں ہوتی اور دونوں کی تفصیلات اوپر بیان کی جاچکی ہیں۔

رہی وہ مرفوع حدیث جو ہم اس باب کے شروع میں بیان کر آئے ہیں اور جس میں حضورؐ نے اس یمنی خاتون سے جو سونے کے دو کنگن پہنے ہوئے تھی، فرمایا تھا: "کیا تو اس کی زکواۃ ادا کرتی ہے؟" سو جہاں تک ہماری معلومات ہے یہ حدیث صرف ایک ہی سند سے روایت کی گئی اور قدیم و جدید علماء حدیث میں اس کی اسناد مستقل

زیور پر زکواۃ والی حدیث کی تاویل

محل بحث رہی ہے۔ بہرحال اگر یہ روایت درست ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے محفوظ شکل میں بھی مروی ہو تو بھی اس کے مفہوم میں یہ گنجائش پیدا ہو سکتی ہے کہ اس میں زکواۃ سے مراد "عاریت دینا" ہو (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس خاتون سے یہ دریافت فرمایا ہو کہ آیا تو اپنا زیور عاریت دیتی رہتی ہے یا نہیں؟) جیسا کہ اس کی تفسیر مذکورہ بالا علماء کے بیانات سے ملتی ہے جن میں سعید بن المسیب، شعبی، حسن اور قتادہ شامل ہیں اور جو کہہ رہے ہیں: "زیورات کی زکواۃ اسے عاریت دینا ہے" اس لئے کہ اگر زیورات پر اسی طرح زکواۃ فرض ہوتی جیسی کہ چاندی کے سکوں پر فرض ہے تو اس بارے میں آپؐ عام ہدایت دینے کے بجائے صرف اسی پر اکتفاء نہ فرماتے کہ ایک عورت کو زیور پہنے دیکھ کر اس سے اس کی ادائی زکواۃ کے بارے میں سوال کر لیتے، بلکہ زیورات پر زکواۃ کی تعلیم بھی زکواۃ سے متعلق دیگر ہدایات کی طرح دنیا میں مشہور رہتی۔ آپؐ کے مکاتیب میں اس کا تذکرہ ہوتا۔ آپؐ کی سنّت میں اس کا وجود ہوتا اور آپؐ کے بعد ائمہ اس پر عمل پیرا ہوتے۔ اس لئے کہ زیورات کا استعمال ہمیشہ سے لوگوں میں چلا آرہا ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ ہم ان حضرات کے مکاتیب زکواۃ وغیرہ میں اس کا کوئی ذکر نہیں پاتے۔

(۱۲۹۲) یہی معنی ہم حضرت عائشہؓ کی اس روایت کے بھی لیں گے جس میں وہ کہتی ہیں: "زیورات پہننے میں کوئی مضائقہ نہیں بشرطیکہ اس کی زکواۃ ادا کی جائے۔" یہاں بھی میری نظر میں زکواۃ سے صرف عاریت دینا ہی مراد ہے۔ اس لئے کہ قاسم ابن محمد اس بات کا انکار کرتے تھے کہ انہوں (حضرت عائشہؓ) نے ایسا کوئی (زیورات پر زکواۃ ادا کرنے کا) حکم اپنی (ملاقاتی) عورتوں یا اپنی بھتیجیوں کو دیا ہو۔ پھر حضرت ابن مسعودؓ

کے علاوہ زیورات کی زکوٰۃ دینے کا قول کسی صحابی سے صحت کے ساتھ ہمیں نہیں ملتا۔

(۱۲۹۳) جہاں تک عبداللہ بن عمرو کی اس روایت کا تعلق ہے جس میں مذکور ہے کہ وہ اپنی بیٹیوں کے زیورات کی زکوٰۃ ادا کرتے تھے۔ تو اس روایت کی اسناد میں بھی ویسا ہی کلام ہے جیسا مرفوع حدیث کی اسناد میں ہے۔

(۱۲۹۴) دوسرا قول (زیور پر زکوٰۃ نہ دینے کا) حضرت عائشہؓ، ابن عمرؓ، جابر ابن عبداللہؓ اور انس بن مالکؓ سے نیز ان کے بعد ان کے ہم خیال تابعین سے مروی ہے۔ بایں ہمہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت کی جو تاویل ان حضرات کے مسلک کے مطابق کی ہے وہ غور و فکر کے بعد کی ہے۔

(۱۲۹۵) بعض علماء جو زیورات پر زکوٰۃ کے قائل ہیں اپنی تائید میں اللہ تبارک و تعالیٰ کا یہ قول پیش کرتے ہیں :-

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ؛ (التوبہ : ۳۴)	اور جو لوگ سونے اور چاندی کا ذخیرہ (کنز) جمع کرتے ہیں اور انہیں راہِ خدا میں خرچ نہیں کرتے۔ آپ انہیں دردناک عذاب کی بشارت دے دیجیے۔

ان حضرات کا کہنا ہے کہ زیورات کنز میں شامل ہیں اور بنا بریں ان پر زکوٰۃ لی جائے گی۔ ایسے لوگوں کے لئے یہ جواب ہے :

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹوں کی زکوٰۃ کا تعیّن کرتے ہوئے فرمایا تھا: "ہر پانچ اونٹوں پر ایک بکری زکوٰۃ میں دی جائے گی"۔ اور پھر تمام مویشیوں کی زکوٰۃ کی فہرست گنائی تو اس میں کہیں بھی (افزائشِ نسل کے) ریوڑ میں چرنے والے یا نہ چرنے والے (بار برداری وغیرہ کے لئے استعمال ہونے والے) جانوروں کی شرط نہیں کی تھی۔ لہٰذا اگر عمومی اطلاق کے باعث اس آیت سے یہ استنباط کیا جا سکتا ہے کہ زیورات پر زکوٰۃ واجب ہو گی تو کیوں نہ حضورؐ کی حدیث کے عمومی اطلاق کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے جوتے جانے والے جانوروں پر زکوٰۃ واجب کر دی جائے ؟۔

سونے چاندی کے ڈلوں پر زکواۃ

(۱۲۹۶) ابو عبیدؒ:- اب رہا چاندی یا سونے کے ڈلوں پر زکواۃ کا مسئلہ سوان پر زکواۃ واجب ہوگی اور یہ اس لئے کہ ان کی حیثیت سکّوں کی سی ہوگی جو صرف خرچ کے کام آسکتے ہیں، پہننے اور انتفاع کی جہت سے یہ دونوں چیزیں زیورات کے مفہوم سے خارج ہو جاتی ہیں اور اسی وجہ سے ان پر زکواۃ واجب ہوگی اور اس بارے میں متعدد علماء کے فتوے موجود ہیں:-

(۱۲۹۷ / ۱۲۹۸) سعید بن المسیب، سلیمان بن یسار اور مکحول سے روایت ہے: سونے کے ڈلوں پر زکواۃ واجب ہوگی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب

یتیم کے مال کی زکوٰۃ سے متعلق سنّت، نیز اس مسئلہ کے اختلافات کا ذکر

یتیم کے مال پر زکوٰۃ عائد ہوگی

(۱۲۹۹) عمرو بن شعیب اپنے والد اور اپنے دادا کے توسّط سے راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: "خبردار! جو بھی کسی ایسے یتیم کا سرپرست و نگران بنے جو مالدار ہو تو اسے چاہیئے کہ اس یتیم کی طرف سے اس مال کو تجارت میں لگائے اور اسے (کاروبار میں لگائے بغیر اس طرح) نہ چھوڑ دے کہ (زکوٰۃ نکلتے رہنے سے) وہ ختم ہو جائے۔"

(۱۳۰۰) یوسف بن ماہک کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: "یتیموں کے اموال کو کاروبار میں لگاؤ تاکہ زکوٰۃ نکلنے سے وہ ختم نہ ہو جائے۔"

(۱۳۰۱) سعید بن المسیّب رح کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب رض نے فرمایا: "یتیموں کے اموال کو کاروبار میں لگاؤ تاکہ زکوٰۃ نکلنے سے وہ ختم نہ ہو جائے۔"

(۱۳۰۲) شعبی راوی ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب رض کسی یتیم کے مال کے نگران بنے تو انہوں نے کہا: "اگر ہم نے اس مال کو (یونہی بغیر کاروبار میں لگائے) چھوڑ دیا تو زکوٰۃ اسے کھا جائے گی۔"

(۱۳۰۳) محجن (یا ابن محجن یا ابو محجن) راوی ہیں کہ حضرت عمر رض نے عثمان ابن

ابی العاص سے دریافت کیا: "تمہارے علاقہ کے کاروبار کا کیا حال ہے؟ ہمارے پاس ایک یتیم کا مال ہے جسے زکوٰۃ ہی ختم کر دینا چاہتی ہے۔" پھر اُنہوں نے وہ مال انہیں سونپ دیا۔ بعد میں وہ حضرت عمرؓ کے پاس نفع لے کر آئے تو حضرت عمرؓ نے کہا: "تم ہماری طرف سے تجارت کے کام میں لگے رہے۔ ہمیں ہمارا راس المال واپس کر دو۔" راوی کہتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنا سرمایہ لے لیا اور نفع انہیں واپس کر دیا۔

(۱۳۰۴) ایک اور سند سے بھی حضرت عمر بن الخطابؓ ہی سے یہی مضمون مروی ہے۔

(۱۳۰۵) حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ وہ ابو رافع کی اولاد کے اموال کی زکوٰۃ ادا کیا کرتے تھے۔ اور یہ یتیم بچے ان کی زیرِ نگرانی تھے۔

(۱۳۰۶) حبیب بن ابی ثابت سے روایت ہے کہ حضرت علیؓ نے ابو رافع کے یتیم بچوں کی زمین دس ہزار میں فروخت کر دی۔ اور وہ اس کی زکوٰۃ ادا کرتے تھے۔

(۱۳۰۷) قاسم بن محمد کہتے ہیں کہ ہم یتیم تھے اور حضرت عائشہؓ ہمارے اموال کو تجارت میں لگاتی تھیں اور اس کی زکوٰۃ ادا کرتی تھیں۔

(۱۳۰۸) حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ وہ یتیم کے مال کی زکوٰۃ ادا کرتے تھے۔

(۱۳۰۹) ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ ان کی زیرِ سرپرستی جو یتامیٰ ہوئے وہ ان کے اموال بطور قرض لیا کرتے تھے تاکہ اس کو تباہی سے محفوظ رکھیں۔ پھر وہ ان کے اموال کی زکوٰۃ ادا کرتے۔ اس حال میں کہ وہ اموال ان پر قرض ہوتے۔

(۱۳۱۰) ابو الزبیر کہتے ہیں کہ اُنہوں نے جابر بن عبداللہ کو اس شخص کے بارے میں جو یتیم کے مال کا نگران بنے یہ کہتے سُنا: "وہ اس کی زکوٰۃ ادا کرے گا۔"

(۱۳۱۱) جابر بن زید سے یتیم کے مال کے نگران کے متعلق دریافت کیا گیا کہ کیا وہ اس کی زکوٰۃ دے گا؟ تو انہوں نے کہا: "ہاں۔"

(۱۳۱۲) عثمان بن اسود کہتے ہیں کہ میں نے مجاہد اور عطاء دونوں کو یہ کہتے سُنا ہے: "یتیم کے مال کی زکواۃ ادا کرو۔"

(۱۳۱۳) مالک بن مغول کہتے ہیں کہ میں نے عطاءؒ سے دریافت کیا: "کیا یتیم کے مال پر زکواۃ واجب ہوگی؟" تو انہوں نے کہا: "ہاں۔"

(۱۳۱۴) حسن بن یزید کہتے ہیں کہ میں نے طاوس سے یتیم کے مال کی زکواۃ کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے کہا: "اس کی زکواۃ ادا کرتے رہو۔ اگر ایسا نہ کروگے تو گناہ تمہاری گردن پر ہوگا۔"

ابو عبیدؒ:۔ یہ ان حضرات کے اقوال ہیں جو یتیموں کے اموال پر زکواۃ سمجھتے ہیں اس باب میں ایک اور قول بھی ہیں۔ اور وہ یہ کہ یتیم کے مال پر زکواۃ نہیں دی جائے گی۔

یتیم کے مال پر زکواۃ عائد نہ ہونے کی تائید میں اقوال

(۱۳۱۵) حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے: "یتیم کے مال کی زکواۃ کا پورا پورا حساب رکھو۔ پھر جب وہ بالغ ہوجائے اور تم سمجھ لو کہ اب وہ ہوشیار اور معاملہ فہم ہوگیا ہے تو اسے وہ حساب بتادو۔ اب اس کی مرضی کہ وہ اس حساب کے مطابق اپنی زکواۃ ادا کرتا ہے یا نہیں کرتا۔"

(۱۳۱۶) شریح سے مروی ہے کہ وہ یتیم کے مال کی زکواۃ ادا نہیں کرتے تھے۔

(۱۳۱۷) حفص نے اپنی روایت میں شریح سے اس عبارت کا اضافہ کیا ہے کہ وہ کہتے تھے: "امکان ہے کہ اگر اس میں سے اونٹوں کی ایک یا دو جماعتیں نکال لی جائیں تو اس میں کچھ بھی باقی نہ رہے۔"

(۱۳۱۸) ابو وائل سے روایت ہے: میری زیر نگرانی ایک یتیم تھا جو آٹھ ہزار درہم کا مالک تھا۔ میں نے اس کے بالغ ہونے تک اس رقم کی زکواۃ ادا نہ کی، اور بلوغ کے بعد وہ رقم اس کے حوالہ کردی۔"

(۱۳۱۹) ابراہیم سے روایت ہے: "یتیم کے مال پر زکواۃ واجب نہیں ہوتی۔"

(۱۳۲۰) جعفر اپنے والد محمد سے، اور مجالد بن سعید شعبی سے روایت کرتے ہیں کہ یہ دونوں حضرات کہتے تھے: "یتیم کے مال پر زکواۃ عائد نہیں ہوتی۔"

یتیم کی زرعی پیداوار اور مویشیوں کے علاوہ کسی مال پر زکواۃ نہیں

(۱۳۲۱) حسن کہتے ہیں کہ کھیتی کے مویشیوں کے علاوہ یتیم کے کسی مال میں زکواۃ واجب نہیں۔

یتیم کے کاروبار میں لگے ہوئے مال اور منجمد مال میں فرق

(۱۳۲۲) مجاہد کہتے ہیں کہ یتیم کے ہر ایسے مال میں سے جو بڑھتا رہے، یا اُنھوں نے یہ کہا کہ اس کے مال میں جو گائے بیل، بھیڑ بکریاں یا کھیتی کی پیداوار یا مضاربت میں لگایا ہوا مال ہو تو اس کی زکواۃ ادا کردو اور جو منجمد مال (جس میں اضافہ نہ ہو رہا) ہو تو اس کی زکواۃ نہ دو تاآنکہ وہ بالغ ہو جائے اور تم اس کا وہ منجمد مال اسے دے دو۔

(۱۳۲۳) ہشام کہتے ہیں کہ میرے باپ عُروہ کے پاس یتیم کا مال تھا تو وہ اس کی کچھ زکواۃ تو نکالتے تھے لیکن باقاعدہ حساب سے پوری زکواۃ ادا نہ کرتے تھے۔

ابو عبیدؒ:- یتیم کے مال کی زکواۃ سے متعلق سلف سے یہی موافق و مخالف اقوال ہم تک پہنچے ہیں۔

(۱۳۲۴) اس مسئلہ میں مالک بن انسؒ کی رائے پہلے درج کی ہوئی روایات کے مطابق ہے۔ یعنی وہ یتیم کے مال پر زکواۃ واجب سمجھتے تھے اور اسی طرح دماغی مریض (پاگل) کے مال پر بھی (زکواۃ واجب سمجھتے تھے)

مجنوں کے مال کی زکوٰۃ

اور زُہری سے بھی ایسی ہی روایت منقول ہے:-

(۱۳۲۵) یونس کہتے ہیں کہ ابن شہاب (زُہری) سے مجنون کے مال (کی زکوٰۃ)

کے متعلق دریافت کیا گیا کہ کیا اس پر زکواۃ عائد ہوتی ہے تو انہوں نے کہا: "ہاں"۔

بلوغ پر یتیم کا مال دے کر اب تک اس پر عائد ہونے والی زکواۃ سے باخبر کر دینا کافی ہو گا

(۱۳۲۶) ابو عبیدؒ:- جہاں تک سفیانؒ کا تعلق ہے وہ عبداللہ کے قول کی ہمنوائی کرتے ہوئے کہتے ہیں: "یتیم کے مال پر جو زکواۃ واجب الادا ہوتی ہو اس کا حساب رکھو اور جب وہ بالغ ہو جائے تو اسے اس کا مال سونپ دو اور اس پر واجب الادا زکواۃ کی جو رقم بنتی ہو وہ بھی اسے بتا دو"۔

یتیم کے مال پر نہ زکواۃ دی جائے گی نہ اس کا حساب رکھا جائے گا

(۱۳۲۷) لیکن سفیانؒ اور اُن کے ہم نواؤں کے علاوہ تمام اہلِ عراق چھوٹے بچّہ کے مال میں زکواۃ واجب نہیں سمجھتے اور نہ اس مال کے نگران پر یہ لازم قرار دیتے ہیں کہ وہ اس کی زکواۃ کا حساب رکھے اور بعد میں اسے بتا دے۔ یہی مجنون کے مال کے متعلق ان کی رائے ہے۔ ان حضرات نے اس مسئلہ کو نماز پر قیاس کرتے ہوئے یہ کہا ہے:

زکواۃ کو نماز پر قیاس کرنے کی بحث

"زکواۃ اس پر واجب ہوتی ہے جس پر نماز فرض ہوتی ہے"۔

(۱۳۲۸) ابو عبیدؒ:- لیکن اس باب میں میری رائے یہ ہے کہ اسلام کے قوانین و شرائع کو ایک دوسرے پر قیاس نہیں کرنا چاہیئے۔ اس لئے کہ وہ بجائے خود اصول ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر قاعدہ و قانون کو اس کی فرضیت و سنت کے لحاظ سے رو بہ عمل لایا جائے گا۔ اس لئے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ قوانین و شرائع بہت سی چیزوں میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں، مثلاً:-

نماز اور زکواۃ کے حکم میں اختلاف

(۱) اہلِ عراق کے قول کے مطابق زکواۃ قبل از وقت اور قبل از وجوب نکالی جا سکتی ہے اور وہ اپنے ادا کنندہ کے لئے کفایت کرے گی لیکن نماز

وقت ہو جانے کے بعد ہی کار آمد ہوتی اور کفایت کرتی ہے۔

(ii) اسی طرح اگر بچہ کی زمین عشری ہو تو تمام علماء کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اس زمین پر زکواۃ (عشر) واجب ہوگی حالانکہ سب متفق ہیں کہ اس بچہ پر نماز واجب نہیں ہوگی۔

(iii) اسی طرح مکاتب (وہ غلام جو اپنی آزادی کا معاہدہ کر چکا ہو) پر نماز تو فرض ہے لیکن زکواۃ فرض نہیں ہوتی۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ نماز تو بچہ سے ساقط ہو رہی ہے لیکن اس کی زمین پر زکواۃ واجب رہتی ہے۔ دوسری طرف مکاتب سے زکواۃ ساقط ہو رہی ہے جبکہ نماز اس پر فرض ہے۔ یہ کس قدر نمایاں اختلافات ہیں۔

روزہ اور نماز کے حکم میں اختلاف

پھر روزہ کو لیجئے۔ آپ جانتے ہیں کہ حائض روزوں کو قضا کرتی ہے لیکن نماز کو قضا نہیں کرتی۔

اور اکثریت کے قول کے مطابق رمضان میں بھول چوک سے کھا لینے والے کو روزہ قضا نہیں کرنا ہوگا جبکہ نماز بھول جانے والے کو جب بھی وہ یاد آجائے قضا کرنی ہوگی۔ اسی طرح مریض کو اتنا موقع دیا گیا ہے کہ وہ صحت مند ہونے تک روزہ چھوڑ دے، لیکن نماز اپنے وقت پر پڑھنا ہوگی اور اس میں تاخیر فائدہ نہ دے گی۔ اگر بیمار ہے تو اپنی طاقت کے مطابق بیٹھ کر یا اشارہ سے پڑھ لے۔

علاوہ ازیں اس قسم کی بہت سی مثالیں ہیں جن کے ذکر سے بات لمبی ہو جائے گی ہماری اس بحث کے بعد فرائض کو ایک دوسرے پر قیاس کرنے والے کیا جواب دیں گے؟

نماز اور زکواۃ کے حکموں میں ایک بڑا فرق

پھر اس بناء پر نماز اور زکواۃ کے احکام میں اور بھی زیادہ دوری ہو جاتی ہے کہ نماز تو اللہ اور بندوں کے درمیان ایک ایسا حق ہے

جس کا تعلق صرف اللہ عزّ و جل سے ہے لیکن زکوٰۃ تو ایک ایسا فریضہ ہے جو اللہ کی طرف سے مالداروں کے مال میں فقیروں کے حق سے متعلق ہے۔

الغرض ہمارے خیال میں یہ مسئلہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک بچہ کسی غلام کا مالک ہو۔ کون ہے جو اس بارے میں یہ نہیں کہے گا کہ اگر اس بچہ کے پاس مال ہو تو اس غلام کا خرچ اس بچہ کے مال میں سے اسی طرح واجب ہو گا جس طرح بڑے پر واجب ہوتا ہے۔

اسی طرح اگرچہ اس بچہ کی بڑی بیوی ہو اور بچہ کے باپ نے اس عورت سے اس کی شادی کرا دی ہو اور وہ بچہ سے مہر یا خرچ لے تو کون ہے جو بچہ کے مال میں سے ان اخراجات کو واجب نہ قرار دے گا؟۔ اسی طرح اگر یہ بچہ کسی آدمی کا مال ضائع کر دے یا اس کا کپڑا پھاڑ دے تو کیا اس (بچہ) کے مال میں سے اس کا تاوان نہ ادا کیا جائے گا؟ اور اسی قسم کی دیگر مثالیں بھی پیش کی جا سکتی ہیں۔ اور یہ تمام امور بہ نسبت نماز کے زکوٰۃ سے زیادہ مشابہ ہوں گے کیونکہ یہ تمام اعمال حقوق العباد سے متعلق ہیں جبکہ نماز کی یہ حیثیت نہیں ہے۔ آخر یہ حضرات اس بچہ پر سے یہ تمام واجبات اس بناء پر کیوں ساقط نہیں کر دیتے کہ اس پر نماز واجب نہیں ہے؟۔

اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اگر کوئی شخص اپنی چھوٹی بچی کی شادی کسی مرد سے کرا دے اور اس کا وہ شوہر مر جائے یا وہ اسے طلاق دے دے تو طلاق یا وفات دونوں صورتوں میں اس بچّی پر عدّت لازم ہو گی۔ جہاں تک میرا علم ہے اس بارے میں تمام مسلمان بلا اختلاف متفق ہیں[۵]۔ اور اگر اس بچّی کا باپ عدّت ختم ہونے سے قبل اس کا نکاح کر دیتا ہے تو

۵۔ یہاں ابو عبیدؒ جس بچّی کا ذکر کر رہے ہیں وہ چھوٹی اور نابالغہ ہے اور نابالغہ سے مساس (جماع) غیر فطری عمل ہے اندریں صورت دینِ فطرت میں یہ عمل جائز نہ ہو گا۔ اس طرح جب مساس واقع نہ ہو گا تو قرآن مجید کی آیت ذیل کے مطابق اس پر عدّت نہیں ہو گی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِن قَبْلِ أَن تَمَسُّوهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّونَهَا فَمَتِّعُوهُنَّ وَسَرِّحُوهُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا (الاحزاب ۳۳ : ۴۹)

اے ایمان والو! اگر تم مومن عورتوں سے نکاح کرنے کے بعد انہیں چھونے (جماع) سے قبل طلاق دے دو تو ان عورتوں پر تمہارے لئے کوئی عدت نہیں جسے وہ گن کر پورا کریں۔ ایسی صورت میں انہیں فائدہ پہنچاؤ اور خوبی سے چھوڑ دو۔

ہماری مذکورہ بالا توجیہ اور اس آیت کریمہ کی موجودگی میں ہم فقہاء کے اس متفق علیہ فیصلہ کی کوئی توجیہ کرنے سے معذور ہیں۔ (مترجم)

وہ نکاح اسی طرح باطل ہوگا جیسے عدّت کے دوران بڑی عورت کا نکاح۔ آخر اس بچّی یا اس کی شادی کر دینے والے سے یہ قید اس بناء پر ختم کیوں نہیں کر دی جاتی کہ اس بچی پر نماز فرض نہیں ہے ؟۔

الغرض اس مسئلہ میں ہمارا دارومدار ان احادیث نبویہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسّلام) اور بدری وغیر بدری صحابہؓ نیز ان کے بعد آنے والے تابعینؒ کی روایات پر ہے جو ہم اُوپر مع تاویل بیان کر چکے ہیں اور جن کا خلاصہ یہ ہے کہ بچّہ کے مال پر زکواۃ واجب ہے۔

اسی طرح مذکورہ بالا تمام صورتوں میں پاگل کی حیثیت وہی ہوگی جو بچّہ کی ہے۔

ابو عبیدؒ :۔ جہاں تک عبداللہ (ابن مسعودؓ) کے اس قول کا تعلق ہے کہ یتیم کے مال پر جس قدر زکواۃ واجب ہوتی ہو اس کا حساب رکھو پھر اسے بتا دو۔ (دیکھئے نمبر ۱۳۱۵) تو ہماری رائے میں اولاً تو یہ روایت ان سے ثابت ہی نہیں ہے اس لئے کہ اس کی سند میں مجاہد ہیں جنہوں نے عبداللہ سے روایت نہیں سُنی۔ ثانیاً خود مجاہد کا فتویٰ اس قول کے خلاف ہے۔ چنانچہ :

(۱۳۲۹) عثمان بن الاسود ان (مجاہد) کے بارے میں روایت کرتے ہیں کہ وہ کہا کرتے تھے "یتیم کے مال کی زکواۃ ادا کرو۔"

(۱۳۳۰) اور اسی طرح خُصَیف ان (مجاہد) سے روایت کرتے ہیں کہ وہ کہا کرتے تھے "یتیم کا تمام ایسا مال جو بڑھتا رہے یا جو مضاربت میں لگا ہو اس پر زکواۃ ادا کرو۔"

ابو عبیدؒ۔ ان کی یہ روایت ہم پچھلے صفحات میں نقل کر آئے ہیں (دیکھئے نمبر ۱۳۲۲)

(۱۳۳۱) ظاہر ہے کہ اگر مجاہد کے نزدیک عبداللہ (ابن مسعودؓ) کا قول صحیح ہوتا تو وہ اس کے خلاف فتویٰ نہ دیتے۔ بایں ہمہ اگر یہ قول عبداللہ (بن مسعودؓ) سے ثابت بھی ہو جائے تو ان کے اس قول سے زیادہ تائید ان لوگوں کی ہوتی ہے جو یتیم کے مال پر زکواۃ واجب سمجھتے ہیں اس لئے کہ اپنے اس قول میں وہ حکم دے رہے ہیں کہ اس (یتیم بچّہ) کے مال (کی زکواۃ) کا حساب رکھا جائے اور اس کے بالغ ہونے کے بعد وہ

حساب اسے بتا دیا جائے۔ صاف معلوم ہو رہا ہے کہ اگر ان کی نظر میں (بچّہ کے مال پر) زکواۃ واجب نہ ہوتی تو پھر حساب رکھنے اور اسے بتانے کے کوئی معنی نہ ہوتے۔

(۱۳۳۲) ابو عبیدؒ:۔ الغرض ہمارے نزدیک بچّہ کے مال پر زکواۃ واجب ہوگی۔ اور جس طرح اس کے بلوغ یا ہوشمند ہونے تک اس کا سرپرست (ولی) خرید و فروخت کے معاملات اس کی طرف سے انجام دے گا اسی طرح وہ اس کی طرف سے زکواۃ بھی ادا کرتا رہے گا۔ لیکن اگر اس کے بالغ یا ہوشمند ہونے تک اس کا ولی زکواۃ نہ ادا کرے تو جب اس کا مال اس کے حوالہ کرے تو وہ اس بات سے ـــــ بقول عبداللہ (ابن مسعود) بشرطیکہ یہ روایت بصحت ان سے ثابت ہو ـــــ اسے آگاہ ضرور کر دے تاکہ وہ یتیم خود گذشتہ سالوں میں اس پر واجب ہونے والی زکواۃ ادا کر دے ورنہ مجھے بھی اندیشہ ہے کہ ایسا ولی گناہ سے نہ بچ سکے گا جیسے کہ طاؤس نے (یتیم بچہ کے ولی کے متعلق) کہا تھا: "اگر تم زکواۃ نہیں دوگے تو گناہ تمہاری گردن پر ہوگا۔" (دیکھئے نمبر: ۱۳۱۴)

(۱۳۳۳) ابو عبیدؒ:۔ زکواۃ کو نماز سے مشابہت دینے والے بعض فقہاء نے عثمان کی منقولہ روایت (نمبر ۱۳۲۹) سے استدلال کیا ہے۔ یہ روایت ہم معلوم کر چکے ہیں۔ لیکن علماء کے سامنے ایسی روایت سے استدلال یا اس کی اسناد پر اعتماد درست نہیں ہوگا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

رَبِّ یَسِّرۡ وَاَعِنۡ فَلَکَ الۡحَمۡدُ

باب

غلام اور مُکاتَب[1] کے مال کی زکواۃ کا بیان نیز اس ضمن میں ان پر کیا واجبات عائد ہوتے ہیں اور کیا نہیں

غلام و مُکاتَب سے زکواۃ نہ لی جانے کی تائید میں روایات

۱۳۳۳ - عبداللہ بن نافع کہتے ہیں کہ میرے باپ کا بیان ہے کہ وہ بنو ہاشم کے غلام تھے اور انہوں نے حضرت عمرؓ سے دریافت کیا "میرے پاس مال ہے کیا میں اس کی زکواۃ ادا کروں ؟ تو حضرت عمرؓ نے جواب دیا! "نہیں" انہوں نے پھر سوال کیا ! "کیا میں خیرات کر سکتا ہوں؟" حضرت عمرؓ نے جواب دیا ! "درہم یا روٹی کی" (یعنی تھوڑی چیز خیرات دے سکتے ہو)

(۱۳۳۴) نافع کہتے ہیں کہ ابنِ عمرؓ کہا کرتے تھے: "غلام کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنے آقا کی اجازت کے بغیر اپنے مال میں سے کچھ بھی دے یا غلام آزاد کرائے۔ یا اس میں سے کچھ بھی خیرات کرے۔ البتہ غلام کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ مروجہ دستور کے مطابق اس میں سے کھائے اور اپنی نیز اپنے بیوی بچوں کی پوشاک کا انتظام کرے"

(۱۳۳۵) ابن عمرؓ سے ہی نافع یہ روایت ایک اور سند سے بیان کرتے ہیں البتہ

---

[1] مُکاتَب اس غلام کو کہتے ہیں جس نے اپنے آقا سے معین رقم ادا کر کے آزاد ہونے کا معاہدہ کر رکھا ہو۔

اس میں انہوں نے بیوی بچوں کا ذکر نہیں کیا۔

(۱۳۳۶) جابر بن عبداللہؓ کہتے ہیں!" غلام اور مکاتب کے مال سے اس وقت تک زکواۃ نہیں لی جائے گی جب تک کہ وہ آزاد نہ ہو جائیں۔

(۱۳۳۷) ابن شہاب کہتے ہیں کہ غلام پر زکواۃ واجب نہیں اور نہ فطرہ کے علاوہ اس کی طرف سے اس کا مالک کوئی زکواۃ ادا کرے گا۔

غلام کا مال اس غلام کے مالک کی ملکیت ہوگا لہٰذا اس کی زکواۃ وہ مالک ادا کرے گا

ابوعبید! اور یہی اہل حجاز کا قول ہے۔ (۱۳۳۸) لیکن سفیان اور اہلِ عراق غلام کے مال پر زکواۃ واجب قرار دیتے ہیں۔ اس بارے میں ان کا مسلک یہ ہے کہ غلام کی کوئی ملکیت ہی نہیں ہوتی خواہ اسکا مالک اسے کسی مال کا مالک ہی کیوں نہ بنا دے ان کا کہنا ہے کہ وہ مال حسبِ سابق اسکے مالک ہی کا رہے گا۔ اور اس کی زکواۃ بھی اسی مالک پر لازم رہے گی۔

غلام کا مال غلام ہی کی ملکیت ہوتا ہے

(۱۳۳۹) ابوعبید! تاہم میرے نزدیک معمول یہ قولِ اہل حجاز کا ہے اور یہی حضرت عمرؓ اور جابر جیسے صحابہؓ کرام کی روایات کا مفہوم ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ غلام کا مال غلام ہی کی ملکیت ہوتا ہے اور اس پر اس سبب سے زکواۃ ساقط ہو جاتی ہے کہ وہ مال مالک کی ملکیت سے نکل کر غلام کی ملکیت میں چلا جاتا ہے۔

(۱۳۴۰) اس بات کا ثبوت کہ غلام کا مال اسی کی ملکیت ہوگا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں آپؐ کے اس فرمان سے ملتا ہے!" جو شخص کوئی ایسا غلام خریدے جس کے پاس مال ہو تو اس کا مال فروخت کرنے والے کا ہوگا۔ اور یہ کہ خریدار شرط کرلے (کہ اس کا مال وہ خود لے گا)

اس حدیث میں آپؐ نے یہ فرما کر "جس کے پاس مال ہو" اور یہ فرما کر!" اس کا مال فروخت کرنے والے کا ہوگا" اس مال کو غلام کی طرف منسوب کیا ہے۔

پھر غلام کو آزاد کرنے سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

مسئلہ کو اور وضاحت سے سامنے لے آتی ہے۔

(۱۳۴۱) ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا! "جو کسی غلام کو آزاد کرے اور اس کے پاس مال ہو تو اس کا مال اسی کا ہوگا، الّا یہ کہ مالک یہ شرط لگائے کہ اس (غلام) کا مال اس (مالک) کا ہو جائے گا تو اندریں صورت وُہ مال اس (مالک) کا ہو جائیگا۔

غلام و آزاد کی ملکیت کے قانون میں فرق ہے

(۱۳۴۲) ابو عبید! یہ امر قابل غور ہے کہ غلام کی ملکیت کا قانون آزاد کی ملکیت کے قانون سے جداگانہ ہے اس لئے کہ آزاد کو اپنا مال غلام کے آزاد کرانے، ھبہ اور خیرات میں خرچ کرنے اور اُڑانے کھانے کا پورا اختیار ہوتا ہے بشرطیکہ اس پر اس سلسلہ میں کوئی سابقہ قانونی بندش نہ ہو، لیکن غلام کو ان امور میں سے کسی کا بھی اختیار نہیں۔ بعض حضرات ہمارے اس مسلک سے اختلاف کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ "ایسی ملکیت جو آزاد کی طرح نہ ہو اور جس میں مالک کو خرچ کرنے کا اختیار نہ ہو ملکیت نہیں کہلا سکتی" ہمارا جواب یہ ہے۔" اگر غلاموں کے جملہ احکام آزاد کے احکام کے ساتھ ساتھ چل رہے ہوتے تو آپ کا یہ قول قوی حجت ہو جاتا اور آپ کے لئے یہ جائز ہوتا کہ آپ غلام کی ملکیتِ مال کے مسئلہ کو بھی دیگر احکام سے مشابہ قرار دے دیتے"

غلام و آزاد کے دیگر احکام میں اختلاف

لیکن ہمیں تو نظر آرہا ہے کہ ان ہر دو فریق کے احکام مختلف اور جداگانہ ہیں آپ جانتے ہیں کہ غلام (ایک وقت میں) دو عورتوں ہی سے شادی کر سکتا ہے اور لونڈی دو طلاقوں پر ہی اپنے شوہر سے جدا ہو جاتی ہے اور طلاق کے بعد دو حیض یا ڈیڑھ ماہ عدت گذارتی ہے اسی طرح اپنے شوہر کی وفات پر دو ماہ پانچ دن کی عدت اور اگر شوہر اس سے نہ ملنے کی قسم کھالے تو اسے دو ماہ انتظار کرنا ہوگا۔ نیز یہ کہ غلام و کنیز کو زنا کے ارتکاب پر صرف پچاس کوڑے لگائے جائیں گے اور تہمت لگانے پر چالیس کوڑے اور اسی قسم کی دیگر چیزیں ہیں جن میں غلاموں کی حیثیت آزاد سے کمتر ہو جاتی ہے مثلاً میراث، نفے، غنیمت وغیرہ میں ان کا حصّہ، گواہیوں، قرض کا اقرار اور وجوب حج اور اسی قسم کی دیگر پابندیوں میں انکی ذمہ داری، ہمارا سوال ہے کہ آخر ان امور میں غلاموں کی ذمہ داریاں آزاد کی ذمہ داریوں سے کیوں کمتر رکھی گئی ہیں؟ وُہ جواب

دیتے ہیں کہ یہ غلاموں کا قانون ہے اور اس کی یہی شکل ہے کہ وہ آزاد کے مقابلہ میں کمتر حقوق پر مشتمل ہو" تو ہم ان سے کہیں گے "بس یہی صورت ان کی ملکیتِ مال کی بھی ہوگی، یہاں بھی ان کی ملکیت کا قانون آزاد کی ملکیت کے قانون کے مقابلہ میں کمتر حقوق رکھتا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ایسا نہیں ہوگا کہ وہ مال انکی ملکیت نہ رہے (ملکیت تو یہ انھی کی رہے گی) لیکن یہ ملکیت اڑانے کھانے کی نہیں بلکہ مصلحت اور بچت کے لئے ہوگی۔ لہٰذا جب کوئی مالک اپنے غلام کو مال ہبہ کردے وہ سنت کی متعین کردہ حدود و شرائط کے مطابق اس کی ملکیت ہو جاتا ہے اور یہ ملکیت اس وقت تک باقی رہتی ہے جب تک کہ مالک اس سے وہ مال چھین نہ لے یا اسے (غلام کو) فروخت نہ کردے اس وقت وہ مال اس کی ملکیت میں نہیں رہے گا۔ اور اس کے آقا کے پاس واپس چلا جائے گا۔ گویا مذکورہ بالا تفاصیل کے مطابق غلاموں اور آزادوں کے دیگر حقوق کی طرح ان دونوں کے ملکیت مال کا قانون بھی جداگانہ ہوگیا۔ ہم یہ کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کی اتباع کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں۔

تاہم غلام کو اموال کا مالک بنانے سے متعلق جملہ اقوال میں سے کوئی قول بھی ہمارے لئے زیادہ اتباع کا مستحق نہیں اور یہ اس لئے کہ ہم نے غلاموں سے متعلق جو کچھ بھی بیان کیا اس میں ہمیں اس مال سے متعلق سنت کے سوا کوئی قانون (و سنت) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا متعین فرمودہ نہیں ملتا۔ اس (مال کی ملکیت) کے علاوہ جتنے قوانین (غلاموں کے متعلق) ہیں وہ صحابہؓ و تابعینؒ سے مروی ہیں اب آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ ان ہر دو قسم کے قوانین میں سے کونسا سب سے زیادہ اتباع وعمل کا مستحق ہے۔ قانون جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت و محفوظ ہے یا وہ جو آپؐ کے سوا دوسروں سے مروی ہے؟ اگرچہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یہ دوسرے (صحابہؓ و تابعینؒ) سب ہی قابل اقتداء ائمہ ہیں۔

(۱۳۴۳) اس بارے میں ہماری رائے یہ ہے کہ ان اقوال میں سب سے مقدم وہ قول ہے جو مسلمانوں کے سردار اور متقین کے امام (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مال کو غلام کی طرف منسوب کرتے وقت فرمایا اور پھر آزاد ہونے پر وہ مال اس کا کردیا۔ پھر رسول اللہ کا غلام کی دعوت نیز حضرت سلیمانؓ کی غلامی میں ان کا پیش کردہ ہدیہ قبول فرمانا ہمارے قول کی تائید میں مزید ثبوت فراہم

کررہا ہے لہٰذا ہم سب سے پہلے غلام کی ملکیت مال کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق فیصلہ دیں گے اور بعد ازاں غلام سے متعلق دیگر احکام میں پیشرو صلحاء کے فتاوی کی اقتداء کریں گے۔ اس لئے کہ ہم رسول اللہ کی اور ان سب حضرات کی اتباع کرنے والے اور ان سب سے مروی جو اقوال ہمیں پہنچے ان کے پیرو ہیں۔

(۱۳۴۴) پھر غلام کی ملکیت کی مزید تائید اس رخصت سے بھی ہوتی ہے جو بعض علماء نے اسے دی ہے اور وہ یہ کہ غلام لونڈی رکھ سکتا ہے ان علماء میں حضرات ابن عباسؓ ابن عمرؓ عمر بن عبدالعزیزؒ اور حسنؒ وغیرہ شامل ہیں۔

اور حضرت ابن عمرؓ سے تو یہ بھی مروی ہے کہ وہ غلام کے مال پر زکواۃ واجب سمجھتے تھے۔

(۱۳۴۵) خالد الحذّاء سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عمرؓ سے دریافت کیا "کیا غلام کو زکواۃ دینا ہوگی؟" انہوں نے پوچھا "کیا وہ مسلمان ہے؟" میں نے کہا۔ "ہاں" تو انہوں نے کہا "ہر دو سو پر پانچ درہم، اور جو اس سے زائد ہو تو اس پر بھی اسی حساب سے"

(۱۳۴۶) ابو عبیدؒ: اس سے بھی غلام کی ملکیت کا مزید ثبوت ملتا ہے واضح رہے کہ (ابن عمرؓ) نے غلام پر جو زکواۃ واجب بتائی تو اس کی وہ حیثیت نہیں جسے دوسرے ان الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں "غلام کی کوئی ملکیت نہیں ہوتی اور اس کا مال اس کے آقا کا ہوتا ہے" اس لئے کہ اگر ان کے ذہن میں بھی یہی حیثیت ہوتی تو سائل سے یہ پوچھتے کہ وہ غلام مسلمان ہے یا کافر؟" اس لئے کہ دوسروں کا کہنا یہ ہے کہ غلام خواہ کافر ہو یا مسلمان اس کے مال کا ایک ہی حکم ہے یعنی یہ کہ اس مال کی زکواۃ آقا پر واجب ہوگی تاہم مجھے اس بارے میں جو قول پسند ہے وہ ابن عمرؓ کا وہی پہلا قول ہے جو انکے والد محترمؓ اور حضرت جابرؓ کے ان اقوال سے مطابقت رکھتا ہے جنہیں ہم اس باب کے شروع میں بیان کر آئے ہیں۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ غلام پر کوئی زکواۃ واجب نہیں نہ ہی وہ معمولی اشیاء مثلاً درہم، روٹی کے علاوہ کوئی چیز خیرات کر سکتا ہے جیسا کہ حضرت عمرؓ اور دیگر علماء سے مروی ہے۔

اور حضرت ابن عباسؓ سے تو اس سے بھی زیادہ سخت روایت آئی ہے"

(۱۳۴۷) عبداللہ بن ابی الہذیل حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ان کے پاس ایک

غلام دیہاتی آیا اور اس نے دریافت کیا" میں اپنے مالک کے مویشیوں میں ہوتا ہوں تو راہ گیر میرے پاس سے گذرتے ہیں اور مجھ سے پینے کے لئے دودھ مانگتے ہیں، کیا میں انہیں دودھ پلا دیا کروں؟" انہوں نے جواب دیا" نہیں" اس غلام نے کہا اگر مجھے خطرہ ہو کہ (دودھ نہ ملنے پر) وہ مر جائے گا؟" تو انہوں نے کہا" اسے صرف اس قدر دودھ پلا دو کہ وہ تمہارے پاس سے نکل کر دوسرے (چراہے) تک پہنچ جائے اور پھر اپنے مالکوں کو اس بات کی اطلاع دیدینا" اس نے پھر (اپنے شکار سے متعلق) دریافت کیا" میں نشانہ باز ہوں۔ کبھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شکار اسی جگہ ڈھیر ہو جاتا ہے اور کبھی چوٹ کھا کر نکل جاتا ہے" انہوں نے کہا" ایسا شکار جو تمہارے سامنے ڈھیر ہو جائے اسے تو کھا لو اور جو مار کھا کر اوجھل ہو جائے اور مر جائے تو اسے نہ کھانا"

ابو عبید: یہ ہے غلام کا قانون (زکواۃ)

مکاتب پر کوئی زکواۃ واجب نہیں

رہا مکاتب کے مال پر زکواۃ کا مسئلہ سو جہاں تک ہمارا علم ہے سب کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اس پر کوئی زکواۃ واجب نہیں اس بارے میں روایت درج ذیل ہیں

(۱۳۴۸) ابو الزبیر کہتے ہیں کہ میں نے جابر بن عبداللہؓ کو یہ کہتے سنا!" غلام اور مکاتب کے مال پر قطعاً زکواۃ واجب نہیں ہوتی تا آنکہ وہ آزاد کر دیئے جائیں"۔

(۱۳۴۹) میمون بن مہران کہتے ہیں سلسلہ میں مسروق کے پاس سے ایک عورت گذری اور اسکے ساتھ بیل تھے جن پر سامان لدا ہوا تھا۔ تو انہوں نے پوچھا" یہ کیا ہے"؟ اس عورت نے جواب دیا" میں مکاتبہ ہوں،، تو انہوں نے کہا" مکاتب پر زکواۃ واجب نہیں ہوتی"

(۱۳۵۰) عطاء کہتے ہیں" مکاتب پر زکواۃ واجب نہیں"۔

(۱۳۵۱) حمید کہتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے لکھا" مکاتب کے مال پر زکواۃ نہیں ہوگی"

(۱۳۵۲) ابو الجہم کہتے ہیں۔ کہ میں نے سعید بن جبیرؓ سے دریافت کیا" کیا مکاتب پر زکوٰۃ واجب ہے"؟ تو انہوں نے جواب دیا" نہیں"

(۱۳۵۳) **ابو عبید** اہلِ حجاز و اہلِ عراق اور عوام کا اسی قول پر عمل رہا ہے۔ کہ اس (مکاتب) پر زکواۃ واجب نہیں۔

(۱۳۵۴) لوگوں میں جو شک و شبہ ہے وہ غلام کے مال میں ہے مکاتب کے مال میں

کوئی شبہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ غلام کو تو اس کا مالک فروخت کر سکتا ہے اور اس سے جب چاہے اس کا مال چھین سکتا ہے۔ اسی بنا پر یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس (غلام) کا مال آقا کا ہے۔ لیکن یہ شکل متفقہ طور پر مکاتَب کے مال میں روا نہیں اور مکاتَب کے مالک کو جائز نہیں کہ وہ اسے (مکاتب کو) بیچدے یا اس سے مال چھین لے کیونکہ اگر یہ صورت مکاتَب کے مالک کے لئے جائز ہو جائے تو پھر عام غلام اور مکاتَب میں کوئی فرق نہ رہے اور مکاتبت بے معنی ہو کر رہ جائے اسی وجہ سے (مکاتب پر اس کے) مالک سے بھی زکواۃ ساقط ہوگئی پھر مکاتَب سے بھی زکواۃ ساقط کر دی کیونکہ وہ ابھی آزاد نہیں ہوا کہ اس پر آزاد کے مالی احکام نافذ کئے جا سکیں اور کیا خبر کہ وُہ معاہدہ کے مطابق رقم دینے میں ناکام ہونے کی وجہ سے پھر غلام ہو جائے لہذا لوگوں کے نزدیک زکواۃ ساقط ہونے میں غلام کے حالات کی نسبت مکاتَب کے حالات زیادہ واضح ہو گئے۔

باب

گھوڑوں اور غلاموں کی زکواۃ نیز اُن کے متعلق سُنت کی ہدایات

مُسلمانوں کی انفرادی یا جنگی ضرورت میں کام آنے والے گھوڑوں اور غلاموں پر زکواۃ کی معافی

(۱۳۵۵) حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہم نے تم سے گھوڑوں اور غلاموں پر زکواۃ معاف کر دی۔"

(۱۳۵۶) دوسری سند سے بھی حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ہم نے تم سے گھوڑوں اور غلاموں پر زکواۃ معاف کر دی لیکن دیگر اموال کی زکواۃ بحساب چالیسواں حصّہ ادا کرو"

(۱۳۵۷) عمرو بن شعیب اپنے باپ اور دادا کے توسط سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا "آدمی کے گھوڑے اور اس کے غلام پر زکواۃ نہیں لی جائیگی"

(۱۳۵۸) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "مسلمان سے اس کے غلام اور گھوڑے پر زکواۃ نہیں لی جائے گی۔

(۱۳۵۹) دوسری سند سے بھی حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مسلمان سے اس کے غلام اور اس کے گھوڑے پر کوئی زکواۃ نہیں لی جائیگی"

(۱۳۶۰) ایک تیسری سند میں خود حضرت ابوہریرہؓ سے یہ روایت مروی ہے اور انہوں نے یہ روایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب نہیں کی۔"

(۱۳۶۱) حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں "فی سبیل اللہ غزوہ کرنے والے (مجاہد) کے گھوڑے پر زکواۃ نہیں لی جائے گی"

(۱۳۶۲) حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے "گھوڑوں پر اور شہد پر زکواۃ نہیں ہے"۔

(۱۳۶۳) عبداللہ بن دینار کہتے ہیں کہ میں نے سعید بن المسیبؒ سے دریافت کیا "کیا ترکی گھوڑوں پر زکواۃ لگتی ہے؟" تو انہوں نے کہا "کہیں گھوڑوں پر بھی زکواۃ لگتی ہے"۔

گھوڑوں اور غلاموں کے مالکوں کی رضاکارانہ پیش کش قبول کی جا سکتی ہے

(۱۳۶۴) حارثہ بن مضربؒ کہتے ہیں کہ شام سے کچھ لوگ حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور انہوں نے کہا "ہمیں گھوڑوں اور غلاموں پر مشتمل کچھ مال ہاتھ لگا ہے اور ہماری دلی خواہش ہے کہ اس میں سے کچھ زکواۃ لے کر اسے ہمارے لئے پاکیزہ بنا دیا جائے" تو حضرت عمرؓ نے کہا "جو کچھ مجھ سے قبل میرے دو بزرگوں نے کیا ہے وہی میں بھی کروں گا" چنانچہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ سے جن میں حضرت علیؓ بھی تھے مشورہ کیا حضرت علیؓ نے کہا "ان کی یہ پیش کش اور اس خواہش کو پورا کر دینا) خوب ہے بشرطیکہ یہ معینہ جزیہ کی صورت نہ اختیار کر لے اور آپ کے بعد لوگ اسے (آپ کے اس عمل کو) قانون بنا کر اس کے نہ دینے پر ان کی گرفت نہ کرنے لگیں"

(۱۳۶۵) سلیمان بن یسار کہتے ہیں کہ اہلِ شام نے ابو عبیدہؓ کو پیش کش کرتے ہوئے کہا "ہمارے گھوڑوں اور غلاموں پر زکواۃ لے لیجیے" تو انہوں نے اسے قبول نہ کیا، پھر حضرت عمرؓ کو لکھ کر اس بارے میں استصواب کیا تو انہوں نے بھی انکار کیا پھر ان لوگوں نے حضرت عمرؓ سے زبانی بات کی لیکن انہوں نے پھر بھی نہ مانا پھر ابو عبیدہؓ نے حضرت عمرؓ کو لکھا تو حضرت عمرؓ نے جواباً انہیں لکھا "اگر وہ اپنی مرضی اور خوشی سے یہ پیش کش کر رہے ہیں تو ان سے لے لو اور جو کچھ لو انہی میں واپس دے دو اور ان کے غلاموں کو (اس میں سے) روزینہ دے دو" مالک کہتے ہیں "انہی میں واپس دے دو" کے معنی یہ ہیں کہ ان کے ضرورتمندوں میں وہ تقسیم کر دو"۔

(۱۳۶۶) عبدالخالق بن سلمہ شیبانی کہتے ہیں کہ میں نے سعید ابن المسیبؒ سے صدقہ فطر کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے کہا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ صدقہ فی کس ایک صاع کھجور یا نصف صاع گیہوں تھا۔ پھر جب حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو بعض مہاجرین نے ان سے گفتگو کی اور کہا "اگر آپ منظوری دے دیں تو ہمارا خیال ہے کہ ہم اپنے غلاموں کی طرف سے

ہر سال دس دس (درہم) ادا کیا کریں" انہوں نے کہا" آپ لوگوں کا خیال خوب ہے اور میرا خیال ہے کہ میں ان غلاموں کے لئے دو جریب ماہانہ روزینہ مقرر کر دوں" اس طرح امیر المومنین رض نے جو کچھ انہیں دیا وہ اس سے زیادہ تھا جو ان سے لیتے تھے"۔

ابو عبیدؒ یہاں صدقہ سے مراد غلام کی طرف سے صدقہ فطر ہے۔

افزائش نسل اور تجارت کے گھوڑوں پر زکواۃ

(۱۳۶۷) ابو عبید: بعض کوفی علماء ایسے گھوڑوں کی زکواۃ کے قائل ہیں جو ریوڑ کی شکل میں افزائش نسل کے لئے رکھے جاتے ہیں چنانچہ ان کا قول ہے" اگر (مالک) چاہے تو ہر گھوڑے پر ایک دینار ادا کر دے یا پھر گھوڑوں کی قیمت لگوا کر اس پر زکواۃ ادا کرے" ان کا یہ بھی قول ہے" اگر گھوڑے بغرض تجارت ہوں تو ان کی حیثیت تاجروں کے دیگر اموال (تجارت) کی سی ہوگی جس پر زکواۃ ادا کی جائے گی۔

افزائش نسل کیلئے پالے جانے والے گھوڑے زکواۃ سے مستثنےٰ ہوں گے

(۱۳۶۸) ابو عبید جہاں تک اس قول میں تجارت کا تعلق ہے وہ بجا ہے لیکن افزائش نسل کے لئے گھوڑوں پر جو زکواۃ عائد کی ہے اس کا نہ تو اتباع سنت سے تعلق ہے اور نہ عقل و نظر سے:۔

اتباع سنت سے تو اس لئے نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے گھوڑوں کی زکواۃ معاف فرما دی اور اس بارے میں افزائش نسل یا کسی اور ضرورت کی بنا پر پرورش کی کوئی تخصیص و تفریق نہیں فرمائی اور اسی عمومیت پر آپؐ کے بعد تمام ائمہ و علماء کا عمل رہا لہذا سنت تو یہی ہے۔

رہا عقل و نظر کا تعلق سو ایسے شخص کے لئے جو گھوڑوں پر زکواۃ واجب سمجھتا ہے لازم تھا کہ وہ گھوڑوں کو مویشیوں سے مشابہت کی بنا پر مویشی جیسا قرار دیتا اس لئے کہ وہ مویشیوں کی طرح ہی ریوڑ کی شکل میں (افزائش نسل کے لئے) پالے جاتے ہیں لیکن اس نے ان دونوں صورتوں میں سے کسی ایک کو بھی اختیار نہ کیا۔ حالانکہ متعدد تابعین حضرات کی روایات میں، گھوڑوں کے لئے لفظ "سائمہ" یعنی ریوڑ کی شکل میں افزائش نسل کے لئے پالے جانے والے مویشی استعمال ہوا ہے اور بایں ہمہ وہ گھوڑوں پر سے زکواۃ ساقط کرنے کے قائل ہیں:۔

(۱۳۶۹) ابراہیم کہتے ہیں" ان گھوڑوں پر جو افزائش نسل کے لئے ریوڑ بنا کر پالے جائیں زکواۃ

واجب نہیں ہوتی"

(۱۳۷۰) حسن کہتے ہیں "ریوڑ بنا کر (افزائشِ نسل کے لئے) پالے جانے والے گھوڑوں پر زکواۃ واجب نہیں ہوتی"

(۱۳۷۱) عمر بن عبدالعزیز کہتے ہیں "ریوڑ بنا کر افزائش نسل کے لئے پالے جانے والے گھوڑوں پر زکواۃ واجب نہیں ہوتی"

افزائش نسل اور تجارت کیلئے پالے جانے والے گھوڑے زکواۃ سے مستثنےٰ ہوں گے

(۱۳۷۲) ان تمام روایات کے ساتھ بعض اہلِ حدیث علماء کا قول ہے کہ گھوڑے خواہ افزائش نسل کے لئے ریوڑ بنا کر پالے جائیں یا تجارت کے لئے ان پر کوئی زکواۃ نہیں ہے اور ان کا استدلال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث پر ہے کہ "

"ہم نے تم سے گھوڑوں اور غلاموں پر زکواۃ معاف کر دی ہے"

وہ کہتے ہیں چونکہ حضورؐ نے اس میں کسی استثناء کے بغیر عمومیت رکھی ہے لہٰذا کسی قسم کے گھوڑوں پر بھی زکواۃ واجب نہیں ہوگی"

گھوڑوں کی زکواۃ کے سلسلہ میں راہ اعتدال

ابو عبید: اس طرح گروہ اوّل نے ہر دو صورت میں زکواۃ واجب کر دی اور گروہ ثانی نے ہر دو صورت میں زکواۃ ساقط قرار دے دی لیکن میرے نزدیک دونوں اقوال میں سے ایک تو غلو پر مبنی ہے دوسرا کوتاہی پر۔ ان دونوں میں اعتدال کا مسلک یہ ہے کہ ان گھوڑوں پر تو زکواۃ واجب کی جائے جو بغرضِ تجارت ہوں اور جو بغرضِ افزائشِ نسل ہوں ان سے زکواۃ ساقط کر دی جائے۔

اسی مسلک پر ہم نے علماء کو پایا ہے اور وہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے مفہوم کو زیادہ جاننے والے ہیں۔

(۱۳۷۳)۔ اور یہی سفیان بن سعید، مالک بن انس اور اہلِ عراق و اہلِ حجاز و اہلِ شام کا مشترکہ قول ہے اور مجھے اس بارے میں ان کے درمیان کسی اختلاف کا علم نہیں ہے۔

———※———

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

فصل

زمین سے پیدا ہونے والے غلّہ جات اور پھلوں کی زکوٰۃ نیز اُن پر عشر (۱/۱۰) یا نصف عشر (۱/۲۰) واجب ہونے کا بیان

باب

زمین کی پیداوار میں سے جن چیزوں پر از روئے سُنت زکواۃ واجب ہوتی ہے

زمین کی وہ پیداوار جس پر سُنت نے زکواۃ متعین کی

(۱۳۷۴) عمرو بن عثمان بن عبد اللہ بن موہب کہتے ہیں کہ میں نے موسیٰ بن طلحہ کو یہ کہتے سُنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن بھیجتے وقت معاذ بن جبلؓ کو حکم دیا کہ وہ گیہوں، جو، کھجوروںؔ اور انگور پر زکواۃ لیں۔

(۱۳۷۵) دوسری سند سے عمرو بن عثمان موسیٰ بن طلحہ سے روایت کرتے ہیں۔ معاذؓ کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ گیہوں، جو، کھجوروں، انگور۔ [ابو عبیدہ کہتے ہیں کہ مجھے شک ہے کہ راوی نے یہ کہا تھا] یا

ؔ۔ یہاں کھجوروں کے لئے کھجور کے درختوں کا لفظ "النخل" ہے (مترجم)

کھجور اور کشمش[1] کہا تھا۔ نیز سُلت (ایک قسم کے سفید بے چھلکے والے جو) اور زیتون پر زکواۃ وصول کریں۔"

(۱۳۷۶) ابراہیم کہتے ہیں کہ گیہوں، جو، کھجور، کشمش اور سُلت (ایک قسم کا سفید بے چھلکوں والا جو) پر زکواۃ لی جائے گی۔

(۱۳۷۷) طاؤس راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذؓ کو یمن بھیجا تھا تو وہ گیہوں اور جو کی زکواۃ کے عوض کپڑے لے لیا کرتے تھے۔"

(۱۳۷۸) حضرت ابن عمرؓ سے پھلوں اور زرعی پیداوار کی زکواۃ سے متعلق روایت ہے کہ یہ زکواۃ کھجوروں کے درختوں) انگور، یا گیہوں اور جو کی پیداوار پر لی جائے گی۔

(۱۳۷۹) حسن سے روایت ہے کہ وہ صرف گیہوں، جو، کھجور اور کشمش پر زکواۃ واجب سمجھتے تھے۔

(۱۳۸۰) ایک اور سند سے حسن اور ابن سیرین دونوں سے یہی مضمون مروی ہے لیکن اس کی عبارت اس طرح ہے: "زکواۃ نو چیزوں پر واجب ہے۔ سونا[1]۔ چاندی[2]۔ اونٹ[3]۔ گائے بیل[4]، بھیڑ بکری[5]۔ گیہوں[6]۔ جو۔ کھجور[7] اور کشمش[8][9]۔

(۱۳۸۱) **ابو عبیدؒ**: یہی ابن ابی لیلی اور سفیان بن سعید کا قول ہے کہ زمین کی پیداوار میں سے سوائے ان چار اصناف کے اور کسی چیز پر زکواۃ واجب نہیں، اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی سنت چھوڑی اور اسی کا حضرت معاذؓ کو حکم دیا، پھر یہی حضرت ابن عمرؓ کا قول بھی ہے۔

(۱۳۸۲) پھر اسی جیسی ایک روایت حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے بھی مروی ہے۔

(۱۳۸۳) حضرات حسنؒ اور ابن سیرینؒ کا بھی یہی فتوی رہا۔

(۱۳۸۴) **ابو عبیدؒ**: اس کے علاوہ ائمہ فقہاء سے دوسرا قول بھی منقول ہے جس میں انہوں نے ان اصناف میں کچھ کمی بیشی کی ہے۔

(۱۳۸۵) اضافہ کرنے والوں میں حضرات ابن عباسؓ، ابراہیمؒ، عمر بن عبدالعزیزؒ، مکحولؒ، زہریؒ، اوزاعی، مالک بن انسؒ اور تمام اہلِ عراق ہیں، البتہ عراقیوں میں سے ابن ابی لیلی سفیان اور ان کے

---

[1] زبیب کا ترجمہ کشمش کیا گیا ہے اس سے مراد خشک انگور ہیں خواہ چھوٹے ہوں یا بڑے منقے (مترجم)

ہم خیال اس سے مستثنیٰ ہیں۔

(۱۳۸۶) کمی کرنے والوں میں شریحؒ اور شعبیؒ ہیں۔

سنت کی بیان کردہ اشیاء پر فقہاء کا اضافہ

اضافہ کرنے والوں کے اقوال یہ ہیں۔

(۱۳۸۷) حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں "زکوٰۃ گیہوں، جو کھجور، کشمش، سُلت (سفید بے چھلکے والا جو) اور زیتون پر ہے"

۱۳۸۸۔ ابراہیم کہتے ہیں "زکوٰۃ گیہوں، جو، کھجور، کشمش سُلت (سفید بے چھلکے والے جو) اور جوار (یا مکئی) پر ہے"

(۱۳۸۹) ایک اور سند سے ابراہیم ہی سے اسی مضمون کی روایت ہے، لیکن اس کی سند کے ایک راوی شعبہ کو سُلت (سفید بے چھلکے والے جو) یا جوار (یا مکئی) میں شک ہے۔ (یعنی یہ دونوں نہیں بلکہ ان دونوں میں سے کوئی ایک ہے)

(۱۳۹۰) مکحول سے روایت ہے کہ انہوں نے دالوں[1] پر بھی گیہوں، جو، کھجور اور کشمش کی طرح زکوٰۃ واجب بتائی ہے۔"

(۱۳۹۱) عمر بن عبدالعزیز کے رجسٹر میں لکھا تھا: "دالوں پر اسی طرح زکوٰۃ لی جائے گی۔ جیسے گیہوں، جو اور سُلت پر لی جاتی ہے۔

(۱۳۹۲) عمر بن عبدالعزیز نے لکھا تھا۔ "چنوں اور مسور پر زکوٰۃ لی جائے گی"

(۱۳۹۳) زہری کہتے ہیں کہ مسالہ جات (کے بیج) بمنزلہ غلہ ہیں ان پر زکوٰۃ دی جائے گی۔

(۱۳۹۴) مالک بن انس کہا کرتے تھے کہ تمام دالوں پر زکوٰۃ واجب ہوگی، دالوں سے ان کی مراد غلہ کی قسمیں ہیں جن میں، مسور، چنا، چاول، مٹر اور دھنیا (یا تل) اور اسی قسم کی تمام اقسام شامل ہیں (جو پھلیوں میں پیدا ہوتی ہیں)

(۱۳۹۵) ابوعبید: یہی اوزاعی کا قول ہے اور ابن ابی لیلیٰ اور سفیان کے علاوہ تمام اہل عراق کا بھی۔

---

[1] یہاں عربی لفظ "القِطْنِیہ" ہے جو ان تمام دالوں والے دانوں کے لئے بولا جاتا ہے جو بالعموم پھلیوں میں لگتے ہیں مثلاً سیم۔ باقلار، لوبیا، مٹر، ماش، مونگ وغیرہ۔

امام مالک مختلف اصناف کے غلّوں کو ملا کر پانچ وسق ہو جانے پر زکواۃ کے قائل ہیں

(۱۳۹۶) البتہ مالک اس قسم کے غلہ کی زکواۃ کے بارے میں اوزاعی اور اہل عراق سے بھی زیادہ سخت بات کے قائل ہیں یعنی وہ کہتے ہیں کہ غلہ کی تمام مختلف اصناف کو ملا کر دیکھا جائے گا۔ کہ ان کا وزن پانچ وسق (ہو گیا ہے یا نہیں اگر) ہو گیا ہے تو اس پر زکواۃ دی جائے گی۔ اسی طرح گیہوں اور جو دونوں کو بھی ملا کر دیکھا جائے گا۔ اور میرا خیال ہے کہ انہوں نے اس ضمن میں سُلت (سفید بے چھلکے والے جو) کا تذکرہ بھی کیا تھا کہ یہ اصناف (زکواۃ کے لئے) باہم دگر ملا دی جائیں گی۔ اس طرح مالک ان تین اصناف کو ایک نوع قرار دیتے ہیں اس لئے کہ یہ لوگوں کی روزی (خوراک) ہے اور انہوں نے تمام دالوں کو (جو دالیں کہلاتی ہیں) ایک نوع قرار دیا ہے۔

مالک گیہوں، جو اور سُلت کو ایک صنف اور دالوں کو ایک صنف قرار دیتے ہیں۔

(۱۳۹۷) ان کا استدلال حضرت عمرؓ کے اس عمل سے ہے کہ انہوں نے ان گیہوں پر جو شام کے نبطی مدینہ لاتے تھے بیسواں حصہ لیا اور دالوں پر دسواں حصہ، ان کا کہنا ہے کہ اس طرح انہوں نے دالوں کی قسم کے غلہ کو ایک چیز قرار دیا اور گیہوں کو اس سے الگ شے قرار دیا۔

(۱۳۹۸) مجھ سے یہ سب کچھ یا اس کا بیشتر حصہ، یحییٰ بن بکیر نے بیان کیا۔ اور وہ (کہتے تھے) کہ مالکؒ جو کو گیہوں میں ملانے کے لئے یہ دلیل پیش کرتے تھے کہ زکواۃ میں سونے کو چاندی میں ملا کر حساب کیا جاتا ہے۔

اہلِ عراق ہر صنف کے جداگانہ پانچ وسق ہونے پر زکواۃ کے قائل ہیں۔

(۱۳۹۹) ابو عبیدؒ: جہاں تک اہلِ عراق کا تعلق ہے۔ وہ ان اشیاء میں سے کسی چیز پر اس وقت تک زکواۃ واجب نہیں سمجھتے جب تک کہ اُن میں سے ہر صنف جداگانہ پانچ وسق یا اس سے زائد نہ ہو جاتے اور وہ اس کے قائل نہیں کہ ایک صنف کو دوسری میں ملا کر (مجموعی وزن پر) زکواۃ کا حساب کیا جاتے اور یہی اوزاعیؒ کا قول ہے

(۱۴۰۰) محمد بن شعیب کہتے ہیں کہ میں نے اوزاعی سے دریافت کیا! کیا گیہوں کو جو اور دیگر غلوں میں زکواۃ کے لئے باہمدگر ملا کر حساب کیا جائے گا؟ "توانہوں نے کہا! "نہیں"

(۱۴۰۱) عطاء کہتے ہیں! "زکواۃ کے لئے غلوں کو باہمدگر ملایا نہیں جائے گا۔

ابو عبید: ہمیں نہیں معلوم کہ بیشتر علماء میں سے کسی نے زکواۃ کے لئے مختلف اصناف کو باہمدگر ملانے کا مسلک اختیار کیا ہو، بس ایک روایت ہے جو ابن المبارک، عکرمہ سے روایت کرتے ہیں:

(۱۴۰۲) عکرمہ کہتے ہیں کہ اگر جو کے کچھ **ذَهَب** (یمن کا مشہور پیمانہ) اور کنگنی (یا باجرہ) کے کچھ ذَهَب جو علیحدہ علیحدہ زکواۃ کے لئے ناکافی ہوں اور ملانے سے ان کا مجموعہ زکواۃ واجب ہونے کی مقدار کو پہنچ جائے۔ تو انہیں ملا لیا جائے گا۔ اس روایت کے ایک راوی معمر کہتے ہیں کہ میں نے یہ بات ایوب سے کہی تو انہوں نے اسے پسند نہ کیا۔

ابو عبید: غلوں کو باہمدگر ملانے کے سلسلہ میں اس روایت اور مالکؒ کے قول کے سوا کوئی چیز نہ مل سکی۔

ہم نے اس باب کے شروع میں غلہ کی جن چار اصناف کو مرفوع اور غیر مرفوع اسناد سے بیان کیا تھا یہاں تک ان لوگوں کے اقوال ہیں جو ان چار اصناف میں اضافہ کے قائل ہیں۔ اب ان لوگوں کو لیجیے جو ان میں کمی کے قائل ہیں۔

سنت کی بیان کردہ اشیاء میں سے فقہا کا بعض کو کم کر دینا

(۱۴۰۳) شریح کہتے ہیں کہ زکواۃ گیہوں، جو اور کھجور پر لی جائیگی اور وہ انگوروں پر زکواۃ واجب نہیں سمجھتے تھے۔

(۱۴۰۴) شعبی کہتے ہیں کہ زکواۃ گیہوں، جو اور کھجوروں پر لی جائیگی۔

اس طرح مجموعی طور پر اس باب میں چار مختلف اقوال ہو گئے ہیں۔

اصناف میں اضافہ یا کمی کرنے والوں کے چار مختلف اقوال اور ان میں سے ہر ایک کا استدلال

ایک قول تو ان لوگوں کا ہے جو صرف گیہوں، جو، کھجور (کے درختوں) اور انگور پر زکواۃ واجب سمجھتے ہیں، ان حضرات کا تمام تر اعتماد احادیث و آثار پر ہے وہ بلا کسی کمی بیشی کے صرف انہی کی اتباع

کرتے ہیں۔ اور سرِ مو اس سے تجاوز نہیں کرتے۔

دوسرا قول ان لوگوں کا ہے جو اس میں صرف سفید بے چھلکے والے جَو (سُلت) اور جوار (یا مکئی) کا اضافہ کرتے ہیں۔ ان کی تاویل یہ ہے۔ یہ دونوں غلّے گیہوں کی جنس سے ہیں۔ اگرچہ گیہوں کھانے میں ان سے افضل ہے۔

(۱۴۰۵) ان کی تائید سعد بن ابی وقاص رضؓ کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ جب ان سے دریافت کیا گیا کہ سُلت (سفید بے چھلکے والے جو) کو گیہوں (یا گیلے سُلت) کے عوض دیا جا سکتا ہے تو انہوں نے اسے ناپسند کیا۔

ابو عبید:- اسی بناء پر مدینہ والے کہتے ہیں "سُلت (سفید بے چھلکے والے جَو) گیہوں یا جَو کے عوض صرف اسی شکل میں دیئے جا سکتے ہیں جبکہ وہ مقدار میں برابر برابر ہوں، اس لئے کہ یہ تینوں غلے ان کی نظر میں ایک نوع ہیں۔ اسی طرح جوار (یا مکئی) بھی بعض لوگوں کے نزدیک گیہوں کی طرح ہے کیونکہ بہت سی خلقِ خدا — جن میں سیاہ فام وغیرہ شامل ہیں — خوراک کے سلسلہ میں صرف اسی پر گزر کرتی ہے اور اسی پر ان کی زندگی کا انحصار ہے۔

۱۴۰۶:- تیسرا قول ان لوگوں کا ہے جو تمام اقسام غلّہ پر زکوٰۃ واجب سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب سود سے متعلق چیزوں کا ذکر فرمایا تو ان میں سے صرف چھ چیزوں کا معین طور پر نام لیا: سونا، چاندی، گیہوں، جَو، کھجور اور نمک۔

لیکن بعد ازاں علماء نے تمام ناپی اور تولی جانے والی اشیاء کو اسی سنت پر قیاس کر لیا۔ اسی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے جب ہم نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت زکوٰۃ میں آپؐ نے گیہوں، جَو، کھجور اور کشمش (منقیٰ) کی چار اصناف ہی کا ذکر فرمایا کہ یہی وہ چیزیں تھیں جنہیں وہ لوگ روزی اور کھانے کے لئے جمع کیا کرتے تھے تو ہم نے اسی فہرست میں ان بقیہ کھائے جانے والے غلوں اور پھلوں کو شامل کر لیا جو ان سے ملتے جلتے ہیں اور جو انہی چاروں کی طرح ناپے تولے جانے میں ایک حکم رکھتے ہیں۔

لفظ وسق سے استدلال

(۱۴۰۷) پھر یہ حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے بھی استدلال کرتے ہیں۔ "پانچ وسق سے کم مقدار پر زکوٰۃ واجب

نہیں ہوگی"۔

اور کہتے ہیں کہ وسق کا لفظ ان تمام ناپی جانے والی چیزوں کو اپنے احاطہ میں لے لیتا ہے جنہیں خوراک بنایا جاتا ہے۔

(۱۴۰۸) باقی رہے چوتھے قول والے جو کشمش (منقی) کو نکال کر صرف گیہوں، جو اور کھجور ہی پر زکواۃ واجب سمجھتے ہیں سو وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عربوں کو صرف انہی چیزوں کے بارے میں حکم دیا تھا جو ان کے شہریوں اور دیہاتیوں کی خوراک اور روزی کے سلسلہ میں جانی پہچانی تھیں۔ اور یہ صرف تین اصناف تھیں۔ گیہوں اور جو شہریوں کے لئے اور کھجور دیہاتیوں کے لئے۔ اور اس لحاظ سے کشمش (منقی)، خارج ہو جاتے ہیں۔

ان حضرات کا کہنا ہے کہ امیروں پر فقیروں کے لئے جو زکواۃ واجب کی گئی ہے تو وہ صرف ان اشیاً پر ہے جو اللہ کے بعد انہیں زندہ رکھنے کے لئے ناگزیر ہوں، مثلاً اونٹ، گائے، بیل، بھیڑ بکری، پر زکواۃ، جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھوڑے، خچر اور گدھوں کو چھوڑ کر خصوصی طور پر نامزد فرمایا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اوّل الذکر مویشیوں کا دودھ اور گوشت لوگوں کے لئے معاش بنایا۔ نہ کہ موخرالذکر کا، اسی بنا پر اول الذکر قسم پر زکواۃ مقرر کی گئی اور موخرالذکر پر نہیں۔

اس سے استنباط کرتے ہوئے یہ حضرات کہتے ہیں کہ یہی حال خوراک میں ان تینوں اشیاً، گیہوں جو اور کھجور۔ کا ہے کہ عربوں میں انہی کا شمار روزی اور معاش میں ہے۔

ابوعبید:۔ الغرض ان اقوال میں سے ہر قول کا قائل اپنے لئے کچھ دلائل اور وجوہ جواز رکھتا ہے جن کا ہم نے ان کی طرف سے اظہار کیا، واللہ اعلم ان کا منشا کیا تھا۔

۱۴۰۹ تاہم ان میں سے مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع سنت پر مبنی قول پسند ہے یعنی یہ کہ صرف انہی چار اصناف پر زکواۃ واجب ہوگی۔ جن کو آپ نے نام لیکر بطور سنت متعین فرمایا ہے۔ اور اس کی تائید صحابہؓ و تابعینؒ کے اقوال سے ہو رہی ہے، پھر یہی مسلک ابن ابی لیلیٰ اور سفیان نے بھی اختیار کیا ہے۔

اور یہ اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جانتے ہوئے کہ زمین کی پیداوار میں لوگوں کو اور بھی اموال (غلے وغیرہ) ملتے ہیں۔ دیگر اصناف سے اعراض فرماتے ہوئے خصوصی طور پر انہی چار

اصناف کا نام لیا، تو آپؐ کا ان چیزوں کو چھوڑ دینا ہی ہمارے نزدیک اس امر کی دلیل ہے کہ آپؐ نے ان پر سے اسی طرح زکواۃ معاف فرمادی جس طرح گھوڑوں اور غلاموں کی زکواۃ معاف فرمائی عقل ونظر، قیاس وتشبیہ وتمثیل کی تو اس وقت ضرورت پڑتی ہے جب کسی بارے میں کوئی جاری سنت موجود نہ ہو، لیکن جب سنت مل جاتے تو لوگوں پر اس کی اتباع لازم ہو جاتی ہے۔

ان حالات میں ابوموسیٰؓ کی حدیث۔ خواہ وہ مسند نہ ہو۔ ہمارے لئے مقتدا و رہنما ہوگی اس لئے کہ صحابہؓ وتابعین میں سے بھی بعض نے اس کی اتباع کی ہے، اور اس لئے بھی کہ رسول اللہؐ سے اس سے زیادہ قوی سند اور ثابت تر متن کے ساتھ ہمیں کوئی ایسی حدیث نہیں ملتی جو اس حدیث کی تردید کرتی ہو۔

باب

زرعی پیداوار کی وہ کم سے کم مقدار جس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے نیز اس پیداوار میں سے کس پر دسواں اور کس پر بیسواں حصہ زکوٰۃ ہوگی

دسواں اور بیسواں حصہ زکوٰۃ کی زمینیں

(۱۴۱۰)۔ بُسر بن سعید کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بارانی زمین کی پیداوار نیز (بَعل[1]) اپنی جڑوں سے پانی پی لینے والے (کھجور کی قسم کے) درختوں کی پیداوار اور چشموں (ندی، نہروں) سے سیراب کی جانے والی زمینوں کی پیداوار پر دسواں حصہ زکوٰۃ اور رہٹوں (اور دیگر آلات کے ذریعہ سے سیراب کی جانے والی زمینوں کی پیداوار پر بیسواں حصہ زکوٰۃ، فرض فرمایا۔

(۱۴۱۱)۔ حکم بن عتیبہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ بن جبلؓ کو جب وہ یمن میں تھے یہ لکھا "بارانی زمینوں یا (غَیل[1]) چشمہ ندی نالوں نہروں) سے سیراب کی جانے والی زمینوں کی پیداوار پر دسواں حصہ زکوٰۃ اور (غَرْب[1]) ڈول (یا رہٹ)، سے سیراب کی جانیوالی زمینوں کی پیداوار پر بیسواں حصہ زکوٰۃ لو"۔

(۱۴۱۲)۔ محمد بن عبدالرحمٰن انصاری کہتے ہیں کہ زکوٰۃ سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوب گرامی اور حضرت عمرؓ کے مکتوب گرامی میں لکھا تھا (عَثَرِيّ[1]) بارانی زمین جو بارش یا نہروں سے سیراب ہو اور اپنی جڑوں سے پانی کھینچ لینے والے درختوں کی پیداوار پر دسواں حصہ اور اس کھیتی پر جس کو (نَوَاضِح[1]) جانوروں کے ذریعہ (رہٹ ڈول سے) سیراب کیا جائے۔ بیسواں حصہ زکوٰۃ ہوگی۔

---

[1] ان الفاظ کی شرح آگے چل کر نمبر ۱۴۲۱ کے تحت خود ابو عبیدؒ نے کی ہے۔

(۱۴۱۳) عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں (بَعْل[1]) اپنی جڑوں سے پانی کھینچ لینے والے درختوں یا چشموں سے سیراب ہونے والی نیز (عَشْرِيٌّ[1]) بارانی زمینوں کی پیداوار میں دسواں حصہ زکواۃ ہے۔اور جو جانوروں کے ذریعہ رہٹ یا ڈول سے سیراب ہوں ان پر بیسواں حصہ زکواۃ ہے

(۱۴۱۴)۔ایک اور سند سے بھی عبداللہ ابن عمرؓ ہی سے یہی مضمون مروی ہے۔

(۱۴۱۵)۔ایک اور سند سے یہی مضمون عبداللہ بن عمرؓ اپنے والد حضرت عمرؓ سے روایت کرتے ہیں۔

ابو عبیدؒ:۔البتہ مؤخرالذکر حدیث مرفوع ہے اور مجھے معلوم نہیں کہ یہ محفوظ بھی ہے یا نہیں۔

(۱۴۱۶) حضرت علیؓ کہتے ہیں۔بارانی زمینوں پر دسواں حصہ اور (دَوَالِي و نَوَاضِح[1]) رہٹ اور جانوروں کے ذریعہ آبپاشی کی جانے والی زمینوں پر بیسواں حصہ زکواۃ ہے۔

(۱۴۱۷) ابراہیمؒ کہتے ہیں (دَالیہ اور غَرب[1]) رہٹ یا چرس (بڑے ڈول) سے سیراب کی جانے والی زمینوں پر بیسواں حصّہ اور (فتسیح) ندی نالوں نہروں سے سیراب کی جانے والی یا بارانی زمینوں پر دسواں حصہ زکواۃ ہے۔

(۱۴۱۸)۔مجاہد کہتے ہیں" بارانی یا چشموں سے سیراب ہونے والی زمینوں پر دسواں حصّہ اور (غرب یا دَالیہ[1]) چرس یا رہٹ سے سیراب ہونے والی زمینوں پر بیسواں حصہ زکواۃ ہے۔

(۱۴۱۹)۔ابن جُرَیج کہتے ہیں کہ میں نے عطاء سے دریافت کیا" ایسے شخص کی زمین کا کیا حکم ہوگا۔جس کی زمین کبھی کنوؤں سے سیراب کی جائے اور کبھی چشموں سے" تو انہوں نے کہا" جس ذریعہ سے زیادہ تر سیراب کی جائے وہ شمار کیا جائے گا۔

(۱۴۲۰)۔ابن جُرَیج کہتے ہیں کہ میں نے عطاء سے پوچھا (کَظَائِم[1]) ندی نالوں اور نہروں سے جو کھجور کے درخت یا انگور کی بیلیں سیراب کی جاتی ہیں۔ان پر کس حساب سے زکواۃ دی جائے گی؟" تو انہوں نے کہا" دسواں حصّہ"

(۱۴۲۱) ابن جُرَیج ابوالزبیر کے واسطہ سے جابر بن عبداللہ سے اس سوال کے جواب میں

---

(۱) ان الفاظ کی شرح آگے چل کر نمبر ۱۴۲۱ کے تحت خود ابو عبیدؒ نے کی ہے۔

کہتے ہیں" ان پر دسواں حصّہ ہوگا"

ابو عبیدؒ ۔ سیرابی اور آبپاشی کے سلسلہ میں ان احادیث میں مختلف الفاظ استعمال ہوئے ہیں ۔ جن کی تفسیر یہ ہے ۔

بَعل | وہ کھجور وغیرہ کے درخت جو اپنی جڑوں سے بغیر بارش وغیرہ کے پانی کھینچ لیتے ہیں ان کے لئے " بَعل " کا لفظ استعمال ہُوا ہے بعض علمار کا خیال ہے کہ "بَعل" سے مراد بارش سے سیراب ہونے والی کھیتی (یا باغات) ہے لیکن میرے نزدیک اول الذکر معنی درست ہیں اس لئے کہ حدیث میں ان دونوں سیرابیوں کی تفریق برقرار رکھتے ہوئے یوں کہا گیا ہے۔

فِيمَا سَقَتِ السَّمَاءُ وَفِي الْبَعْلِ ۔ بارانی زمین اور بَعل میں' (دیکھئے اوپر نمبر ۱۴۱۰)

اس طرح سیرابی کی دو جداگانہ قسمیں ہوئیں ۔ یہ تو مرفوع حدیث کے الفاظ ہیں ۔ اور یہی چیز حضرت ابن عمرؓ کی روایت نمبر ۱۴۱۳ میں ۔

مَا كَانَ بَعْلًا اَوْ عَشَرِيًّا ۔ اپنی جڑوں سے سیراب ہونے والے درخت یا بارانی زمین کے الفاظ سے ظاہر کی گئی ہے جن سے صاف ظاہر ہے کہ یہ جداگانہ دو قسمیں ہیں ۔

عَثَرِیّ | بارانی زمین کو "عَثَرِیّ" کہا جاتا ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں عوام کی بولی میں اسے "عِثْرِیّ" کہا جاتا ہے

غَیْلٌ | ہر رواں اور بہتا پانی جیسے نہروں ، چشموں ، نالوں کا پانی "غَیل" کہلائے گا۔

کَظائم | کظائم بھی نالوں ہی کی طرح ہوتے ہیں۔ اور یہی کیفیت فَتِح کی ہے جس کا اطلاق

فَتِح | غَیل کی طرح بہتے پانی پر ہوگا ۔ البتہ "فَتِح" کہلانے کی وجہ یہ ہے کہ زمین میں اس کی نہریں پھاڑ کر اس سے پانی پینے کے لئے اس کے دہانے کھول دیئے جاتے ہیں۔

مذکورہ بالا سیرابی زمین کے وہ ذرائع ہیں جن پر دسواں حصّہ زکواۃ لی جاتی ہے اب دوسری قسم کے ذرائع آب پاشی کا ذکر ہوتا ہے [2]

---

[1] ان الفاظ کی شرح آگے چل کر نمبر ۱۴۲۱ کے تحت خود ابو عبیدؒ نے کی ہے ۔

[2] واضح رہے کہ اس دوسری قسم میں وہ تمام دیگر ذرائع آب پاشی شمار کئے جائیں گے جو انسانوں نے دوسری طاقتوں کو مسخر کر کے ان کے ذریعہ ایجاد کئے ہیں (مترجم)

النَّوَاضِحِ اور السَّوَانِي وہ اونٹ جن سے زمینوں کی آب پاشی کا کام لیا جاتا ہے۔ "نواضح" کہلاتے ہیں اور یہی بعینہ السَّوَانِي ہیں۔ (یعنی رہٹیں جن کو مختلف جانوروں کے ذریعہ چلایا جاتا ہے) یہی صورت الغرب کی ہے۔

الغَرْب جس کے معنے بڑا ڈول (چرس) ہے جسے آب پاشی کرنے والا اونٹ (یا دوسرا جانور) کھینچتا ہے اور یہی مفہوم الرَّشَا سے ہے جس کے معنے

الرَّشَا اس رسی کے ہیں جسکے ذریعہ پانی کھینچا جاتا ہے، الغرض مذکورہ بالا تمام الفاظ النَّوَاضِح السَّوَانِي، الغُرُوب، الرَّشَا سے مفہوم ایک ہی ہے۔

الدَّالِيَه اور النَّاعُورَة چھوٹے چھوٹے ڈول (ڈبے وغیرہ) جنہیں چکیاں گھماتی ہیں (یعنی رہٹ) الدَّالِيَة کہلاتے ہیں اور بالکل یہی چیز "نَاعُورَة" بھی ہے۔

یہ آب پاشی کے وہ ذرائع ہیں جن پر بیسواں (۲۰/۱) حصہ زکواۃ لی جاتی ہے۔

اوّل الذکر ذرائع کے مقابلہ میں موخر الذکر ذرائع پر کم زکواۃ لگنے کی وجہ یہ ہے کہ موخر الذکر ذرائع میں کسانوں کو ایسی محنت و مشقت اور تگ و دو کرنا پڑتی ہے جو اول الذکر ذرائع رکھنے والے کسانوں کو نہیں کرنا پڑتی۔

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ ان ہر دو ذرائع سے سیراب ہونے والی زمینوں کی پیداوار کا دسواں یا بیسواں حصہ اس وقت نکالا جائے گا۔ جبکہ ان کی پیداوار کی مقدار پانچ وسق یا اس سے اوپر ہو جائے اس کی تصریح سنت و آثار سے ہوتی ہے۔

زرعی پیداوار کے پانچ وسق ہونے پر زکواۃ

(۱۴۲۲) ابو سعید خدری رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (زمین کی پیداوار پر) پانچ وسق سے کم مقدار پر زکواۃ نہیں اور پانچ اونٹ سے کم پر زکات نہیں۔ اسی طرح پانچ اوقیہ (۲۰۰ درہم چاندی) سے کم پر زکواۃ نہیں

(۱۴۲۳) ایک اور سند سے یہ مضمون حضرت ابن عمر رضؓ سے غیر مرفوع مروی ہے (یعنی اس کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ہے)

ابو عبید:۔ یہ روایت ایک اور سند سے ابن عمر رضؓ سے مرفوع بھی بیان کی جاتی ہے (یعنی ابن عمر رضؓ نے یہ روایت حضورؐ سے بیان کی ہے)

(۱۴۲۴) حضرت ابوہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی مضمون روایت کرتے ہیں۔

(۱۴۲۵) ابوسعید خدریؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں "پانچ وسق سے کم پر زکواۃ نہیں"۔

(۱۴۲۶) محمد بن عبدالرحمن کہتے ہیں کہ زکواۃ سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوب گرامی اور حضرت عمرؓ کے مکتوب گرامی میں ہے "کسی زمین سے پیدا ہونے والی چیز پر اس وقت تک زکواۃ نہیں لی جائے گی تا آنکہ وہ پانچ وسق نہ ہو جائے"۔

(۱۴۲۷) حضرت جابرؓ کہتے ہیں: "پانچ وسق سے کم پر زکواۃ واجب نہیں ہوتی"

(۱۴۲۸) ابراہیم اور حسن دونوں کہتے ہیں "غلہ کی کسی صنف پر اس وقت تک زکواۃ نہیں لی جائے گی تا آنکہ وہ پانچ وسق نہ ہو جائے"

(۱۴۲۹) ایک اور سند سے حسن سے یہی مضمون مروی ہے۔

(۱۴۳۰) مکحول کہتے ہیں "جب پانچ وسق ہو جائیں۔ یعنی پچھتر مدی تو ان پر عشور (دسواں یا بیسواں حصہ) واجب ہوگا۔ لیکن اس مقدار سے کم پر کوئی عشور نہیں۔

ابوعبید:۔ پانچ وسق سے متعلق ہماری مذکورہ بالا احادیث ہی پر سفیان بن سعید اوزاعی اور مالک کا استناد تھا۔

(۱۴۳۱) اس بارے میں مالکؒ کے متعلق مجھے یحییٰ بن عبداللہ بن بکیر نے اطلاع دی۔

(۱۴۳۲) اور اوزاعی کے متعلق ہشام بن اسماعیل نے محمد بن شعیب کی وساطت سے اطلاع دی

(۱۴۳۳) یہی اہل عراق کی اکثریت کا قول ہے البتہ اوزاعی اور سفیان دونوں کا یہ خیال تھا کہ زکواۃ دیتے وقت دو مختلف انواع کو یکجا نہیں کیا جائے۔ لیکن مالکؒ کا خیال تھا کہ انہیں یکجا کر لیا جائے گا۔ ہم اس مسئلہ پر پہلے باب میں روشنی ڈال چکے ہیں۔

(۱۴۳۴) اور صرف ابوحنیفہؒ کے علاوہ تمام اہل عراق اوزاعی اور سفیان کے ہمنوا ہیں۔

باب

زکوٰۃ کیلئے پھلوں کی مقدار کا تخمینہ لگانے نیز عاریت دیئے ہوئے درختوں کے مسئلہ میں سنت کی رہنمائی

نصف پیداوار پر معاملہ کرنا:

(۱۴۳۵) حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کی زمین اور اس کے کھجور کے باغات وہاں کے قدیم یہودی باشندوں کو اس شرط پر دیدیئے کہ وہ اس کی نصف پیداوار خود لیں گے اور نصف مسلمانوں کو دیں گے۔[1]

(۱۴۳۶) حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر والوں سے کھیتوں اور پھلوں کی پیداوار کے نصف نصف پر معاملہ طے کیا تھا۔

---

[1] ابوداؤد میں ہے! جب کھجور کے پھل کاٹنے کا وقت آگیا تو حضورؐ نے پھلوں کا اندازہ لگانے کے لئے عبداللہ بن رواحہؓ کو بھیجا۔ جب انہوں نے اہل خیبر کو اپنے اندازہ سے مطلع کیا تو وہ اسے زیادہ بتانے لگے اور کہنے لگے "اے ابن رواحہ تم ہم پر زیادہ بوجھ ڈال رہے ہو" اس پر انہوں نے کہا میں کھجوروں کے باغات لے لیتا ہوں۔ اور جتنا تم سے طلب کر رہا ہوں اتنی مقدار تمہیں دے دونگا۔ تب ان لوگوں نے کہا! یہ حق ہے اور اسی سے آسمان و زمین قائم ہیں۔ ہم تمہارے مطالبے کو تسلیم کرتے ہیں" موطا میں ہے! ان یہودیوں نے انہیں رشوت دینے کے لئے اپنی عورتوں کے زیورات اکٹھا کر کے پیش کئے۔ اور درخواست کی کہ تقسیم میں ہمارے ساتھ کچھ رعایت کر دیجئے اور درگزر فرمائیے" تو انہوں نے کہا: "اے گروہ یہود! واللہ تم خلق خدا میں مجھے سب سے زیادہ مبغوض ہو لیکن یہ بغض بھی مجھے تم پر ظلم و زیادتی نہیں کرنے دے گا۔ اور یہ جو تم مجھے رشوت پیش کر رہے ہو تو یہ حرام ہے، میں اسے ہرگز قبول نہیں کروں گا" یہودی کہنے لگے: "یہی عدل آسمان و زمین کے قیام کا باعث ہے"۔ اسے ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے۔

(مختصر از حاشیہ کتاب الاموال)

پیداوار کا تخمینہ

(۱۴۳۷) شعبی کہتے ہیں ! "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کا علاقہ وہاں کے باشندوں کو نصف نصف کی شرط پر دیدیا۔ پھر آپؐ نے عبداللہ بن رواحہؓ کو وہاں کے کھجوروں کے باغات۔ یا پھلوں۔ کا تخمینہ لگانے کے لئے بھیجا۔ (تاکہ اس اندازہ کے مطابق ان سے نصف مقدار وصول کی جاتے) جب ابن رواحہؓ ان کے پاس گئے تو انہوں نے اہلِ خیبر سے کہا ! میں تمہارے پاس ایک ایسی ہستی کی طرف سے آیا ہوں جو مجھے میری جان سے بھی زیادہ عزیز ہے اور تم لوگ میری نظر میں بندروں اور سوروں سے زیادہ مبغوض ہو" اس پر وہ بولے" اندریں صورت آپ ہمارے درمیان عدل کیونکر قائم کریں گے ؟" انہوں نے جواب دیا ! " بایں ہمہ (محبت و بغض) کوئی چیز مجھے تمہارے ساتھ عدل کرنے سے روک نہیں سکتی" انہوں نے کہا آسمان و زمین کا نظام اسی عدل کی بنیاد پر قائم ہے۔ چنانچہ عبداللہ بن رواحہؓ نے ان کی پیداوار کا اندازہ لگا کر اسے دو نصف حصوں میں تقسیم کر کے ان کو اس بات کا اختیار دیا کہ وہ ان میں سے جونسا ایک حصّہ چاہیں اپنے لئے چن لیں" راوی کہتا ہے کہ عبداللہ بن رواحہؓ نے دونوں حصوں میں سے کسی ایک میں کچھ بھی کمی بیشی نہ کی۔

تخمینہ کے لئے موزوں وقت

(۱۴۳۸) حضرت عائشہؓ خیبر کا قصہ بیان کرتے ہوتے کہتی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہودیوں کے پاس عبداللہ بن رواحہؓ کو بھیجا کرتے تھے وہ ان کے پھلوں (کی پیداوار) کا اندازہ اس وقت لگاتے تھے جب پھل پختگی پر آجاتے اور ابھی ان میں سے کھایا نہ جاتا تھا، پھر وہ اپنے اندازے کے مطابق یہودیوں کو اختیار دے دیتے کہ اگر یہود چاہیں تو ان کی مقررہ مقدار خود لے کر باغات انہیں دیدیں یا خود باغات لے کر اتنی مقررہ مقدار انہیں دیدیں"

ابو عبیدؒ :- آپؐ اس لئے اندازہ لگانے کا حکم دیتے تھے کہ پھلوں کے کھانے اور بٹنے سے قبل زکواۃ کا صحیح حساب لگ جاتے :-

(۱۴۳۹) عبداللہ بن عبید بن عمیرؒ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور کے باغات کی پیداوار کا اس وقت اندازہ لگانے کا حکم دیا۔ جب ان کے پھل پختگی پر آجائیں"

(۱۴۴۰) ابو حمید ساعدیؓ کہتے ہیں، "ہم معرکہ تبوک کے دوران رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلّم کے ساتھ تھے۔ تاآنکہ ہم وادی القریٰ پہنچے۔ وہاں ہم نے ایک عورت کو اپنے باغ میں دیکھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا "اس باغ کی پیداوار کا اندازہ لگاؤ"۔ چنانچہ لوگوں نے اپنے اپنے اندازے بتائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اندازے کے مطابق (اس باغ کی پیداوار) دس وسق بتائی۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت سے کہا۔ اس باغ کی جو پیداوار ہو اس کا حساب رکھنا تاآنکہ ہم تیرے پاس واپس آجائیں۔ ان شاءاللہ۔

ابوعبیدؒ: ہمارے خیال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اسے حساب رکھنے کا اس لئے حکم دیا کہ وہ دیکھ لے کہ پیداوار آپؐ کے اندازہ کے مطابق ہے اور اس طرح اس کے دل کو تسلی حاصل ہو۔ نہ اس لئے کہ آپ کو اپنے اندازہ میں کچھ شک تھا۔

تخمینہ کھجوروں اور انگوروں کا لگایا جائے گا

(۱۴۴۱) عطاء کہتے ہیں "ہم کھجوروں کے درختوں اور انگوروں کی بیلوں پر اُن کی پیداوار کا اندازہ لگائیں گے۔ لیکن غلّہ کا اندازہ نہیں لگائیں گے۔ ۲؎

(۱۴۴۲) ابن شہاب کہتے ہیں "ہمیں نہیں معلوم کہ پھلوں میں سے کھجوروں اور انگوروں کے سوا بھی کسی کا اندازہ لگایا جاتا ہو"۔

(۱۴۴۳) مالک بن انس سے بھی اسی مضمون کی روایت ہے وہ کہتے ہیں "سنت یہی ہے کہ پھلوں میں سے کھجور اور انگور کے سوا کسی پھل کا اندازہ نہ لگایا جائے"۔

اندازہ لگایا ہی اس وقت جاتا ہے جب پھلوں میں پختگی نمودار ہو جائے اور ان کی فروخت جائز ہو جائے۔ اس لئے کہ کبھی گدر پھل بھی کھائے جاتے ہیں۔ لہٰذا لوگوں پر فراخی و وسعت ملحوظ رکھتے ہوئے مالکان کے پھلوں کا اندازہ لگایا جائے گا، پھر انہیں اس میں سے کھانے کی آزادی دیدی جائے گی۔ اور وہ اس میں سے لگائے ہوئے اندازہ کے مطابق زکوٰۃ ادا کریں گے۔

۱؎ یہ واقعہ غزوہ تبوک جاتے وقت ہوا تھا، واپسی پر جب رسول اللہؐ وادی القریٰ تشریف لائے تو آپؐ نے اس عورت سے اس کے باغ کی پیداوار کا دریافت کیا اور اس نے دس وسق بتائی جو رسول اللہؐ کے اندازہ کے مطابق تھی۔ (البدایہ النہایہ) ۵ : ۱۲)۔ ۲؎ ابن ابی شیبہ نے اسے روایت کیا ہے۔

لیکن وہ چیزیں جو گدر اور گیلی نہیں کھائی جاتیں۔ مثلاً غلّے تو ان کے مالکان کو دانہ پڑنے کے بعد امانت ملحوظ رکھنا ہوگی[1]۔

(۱۴۴۴) ابو عبید: مالک کے اس قول کی تائید عطار اور ابن شہاب کے اس قول سے ہوتی ہے "کھجوروں اور انگوروں کے علاوہ کسی چیز کا اندازہ نہیں لگایا جائے گا"۔

علاوہ ازیں بعض صحابہؓ سے بھی اس قسم کی روایات ملتی ہیں جن سے اس قول کو مزید تقویت پہنچتی ہے!

غلّے کی زکوٰۃ مالک اپنے اندازہ کے مطابق ادا کرے گا:

(۱۴۴۵) ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم کہتے ہیں: "مروان نے کسی قرظی کو کھیتوں کی پیداوار کا اندازہ لگانے کے لئے بھیجا۔ یہ شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی عثمان بن حنیفؓ کے پاس ان کی کھیتی کی زکوٰۃ مانگنے کے لئے پہنچا، تو عثمانؓ نے اس شخص سے کہا! "اچھا اب تم یہ کچھ کرنے لگے ہو؟ یہ (زکوٰۃ) جزیہ کی طرح کبھی وصول نہیں کی گئی، یہ تو زکات ہے۔ جس پر لوگوں کی گرفت کی جاتی ہے[2]۔

(۱۴۴۶) ابوبکر بن حزم کہتے ہیں "مروان کے اس طرزِ عمل سے قبل کھیتوں کی پیداوار سے زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے لوگوں کے پاس نہیں پہنچا جاتا تھا بلکہ ہر شخص جتنا اس کے حساب سے بنتا خود ہی ادا کر دیتا تھا اور اس بارے میں اس پر کوئی پوچھ گچھ اور باز پرس نہ ہوتی تھی"

(۱۴۴۷) ابو عبید: واضح رہے کہ عثمان بن حنیفؓ نے کھیتوں کی پیداوار کا اندازہ لگانے اور ان کے مالکان کے پاس جا کر اس کی زکوٰۃ مانگنے کو بُرا سمجھا اور اس پر اعتراض کیا تھا، اس روایت میں کہیں یہ مذکور نہیں کہ انہوں نے کھجور اور انگور کے بارے میں یہ اعتراض کیا ہو،

---

[1] موطا میں امام مالک نے لکھا ہے کہ اس بارے میں ہمارے ہاں کوئی اختلاف نہیں کہ جو اشیاء تر یا گدر نہیں کھائی جاتی ہوں انہیں کاٹنے اور صاف دانے نکالنے کے بعد مالکان خود ہی اندازہ لگا کر اگر وہ بقدر نصاب ہو جائیں تو زکوٰۃ امانت داری سے ادا کریں گے۔

[2] یہاں عربی عبارت "الا دیة و لھا زکاة یوخذ الناس بها" غیر واضح ہے۔ (مترجم)

باغات کے مالکوں کے لئے ان کے کھانے میں آنے والے پھل شمار ہوں گے یا نہیں؟ نیز نہ شمار ہونیوالے پھلوں کی مقدار"

اور یہی مالک کا بھی قول ہے، البتہ مالک کا خیال تھا کہ (بلا استثناء) تمام پھلوں کے لئے اندازہ لگایا جائیگا، بشرطیکہ وہ پانچ وسق سے زائد ہوں، نیز ان کا خیال تھا کہ اس میں سے جو مقدار مالکان کھائیں گے اسے بھی مالکان کے حساب میں شمار کیا جائیگا چنانچہ آج کل اسی پر ان (مالکیوں) کے ہاں عمل ہوتا ہے۔

ہماری مذکورہ بالا روایات ان کے قول کو تقویت بخشتی ہیں، لیکن ان کے سوا کچھ احادیث و روایات بھی ہیں جن سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ مالکوں کے لئے پھلوں کے پکنے اور چننے کے زمانہ میں پھلوں کی اتنی مقدار کو حساب سے معاف کر دیا جاتے جو ان کے کھانے میں آئے۔

(۱۴۴۸) عبدالرحمٰن بن مسعود بن نیار کہتے ہیں کہ ہم ایک مجلس میں تھے کہ ہمارے پاس سہل بن ابی حثمہ رض آئے اور انہوں نے کہا: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، "جب تم (باغات کا) اندازہ لگایا کرو تو تہائی چھوڑ دیا کرو اور اگر تہائی نہ چھوڑو تو چوتھائی (ضرور) چھوڑ دیا کرو"

(۱۴۴۹) بشیر بن یسار کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ بن الخطاب نے ابوحثمہ انصاری کو مسلمانوں کے اموال کا اندازہ لگانے کے لئے بھیجا تو کہا: جب تم (لوگوں کے) کھجوروں کے باغات میں لوگوں کو پھل توڑتے ہوتے پاؤ تو جو کچھ وہ کھائیں اسے چھوڑ دینا اور اُسے اندازہ میں شامل نہ کرنا،،

(۱۴۵۰) سہل بن ابی حثمہ سے روایت ہے کہ مروان (بن الحکم) نے انہیں کھجوروں کے باغات کی پیداوار کا تخمینہ لگانے کے لئے بھیجا تو انہوں نے سعد بن ابی سعد کے باغات کی پیداوار کا تخمینہ سات سو وسق لگایا اور کہا: اگر وہاں مجھے چالیس جھونپڑیاں نہ ملتیں تو میں ان کی پیداوار کا اندازہ نو سو وسق لگاتا، لیکن میں نے وہ مقدار جو ان جھونپڑیوں میں رہنے والے کھا سکتے ہیں ان کے لئے چھوڑ دی ہے،،

عَرایا عاریت دیئے ہوئے کھجور کے درخت زکواۃ سے مستثنیٰ رہیں گے::

ابو عبید:۔ ان روایات سے یہ رخصت ملتی ہے کہ لوگوں کی سہولت کو مدنظر رکھتے

ہوئے کھائی جانے والی کچھ مقدار چھوڑ دی جائے۔ اسی طرح عاریت[1] دیئے ہوئے کھجور کے درختوں کے بارے میں بھی رخصت آئی ہے:

(۱۴۵۱) ابوسعید خدریؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں: "عاریت دیئے ہوئے کھجور کے درختوں پر کوئی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی"۔

(۱۴۵۲) قطیر[2] انصاری کہتے ہیں کہ محمد بن سہل بن ابی حثمہ نے بتایا کہ ابوحثمہ حضرت عمرؓ بن الخطاب کے دور میں باغات کی پیداوار کا تخمینہ لگاتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے ان سے کہا: "عاریت دی ہوئی کھجوروں کو اندازہ لگاتے وقت شمار میں نہ لانا"۔

تخمینہ میں تخفیف کرنے کی ہدایت

(۱۴۵۳) مکحول کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تخمینہ لگانے والوں کو بھیجتے تو فرماتے تھے: "تخفیف کرنا اس لیئے کہ مال (باغات) میں عاریت دیا ہوا کھجور کا درخت اور راہ گیروں کا حصہ بھی ہوتا ہے"۔

(۱۴۵۴) اوزاعی کہتے ہیں کہ ہمیں حضرت عمر بن الخطابؓ سے روایت پہنچی ہے۔ کہ انہوں نے کہا: "اندازہ لگانے میں لوگوں پر کچھ تخفیف کیا کرو اس لیئے کہ مال (باغات) میں عاریت دیئے ہوئے درخت ہوتے ہیں اور کچھ راہ گیر مسافروں (اور مالکوں کے اہل وعیال وغیرہ میں سے) کھانے والوں کا حصہ بھی ہوتا ہے"۔

(۱۴۵۵) یہی وہ لوگ ہیں جنکے بارے میں روایات آئی ہیں "مسافر پھل لے سکتا ہے۔ لیکن جھولی یا تھیلے میں ڈال کر نہیں لے جا سکتا"۔

اس ضمن میں بہت سی مشہور روایات ہیں، جن کے بیان کے لئے کوئی اور جگہ مناسب رہے گی۔

"کھانے والوں" سے مراد ہے پھلوں کے مالک اور ان کے اہل وعیال نیز ان کے دیگر متعلقین جو ان کے ساتھ رہیں۔

۱۴۵۶۔ اس ضمن میں سہل بن ابی حثمہ کی وہ روایت سامنے رکھیے جس میں انہوں نے

---

[1] اس کی شرح کے لئے دیکھئے نمبر ۱۴۵۷ سے۔ [2] ایک نسخہ میں یہ نام بجائے "ر" کے "ن" سے قطین ہے۔

سعد بن سعد کے مال (باغات) کا تخمینہ لگایا اور کہا "اگر میں وہاں چالیس جھونپڑیاں نہ پاتا تو ان کے پھلوں کا تخمینہ (بجائے سات سو وسق کے) نو سو وسق لگاتا۔ (دیکھئے روایت نمبر ۱۴۵۰) یہ جھونپڑیاں پھلوں کی کٹائی کے زمانہ میں انہی کھانے والوں کی رہائش گاہیں اور سر چھپانے کے مقامات تھے۔

(عَرَایا) عاریت دیئے ہوئے کھجور کے درخت کے دو مفہوم

اب "عاریت دیئے ہوئے" کھجور کے درخت کا مطلب اس سلسلہ میں دو شرحیں کی گئی ہیں:

(۱) پہلی شرح

(۱۴۵۷) مالک بن انس کہتے ہیں "اس سے مراد وہ درخت خرما ہے جس کا مالک اس کے پھل محتاج کو ہبہ کر دیتا ہے، چنانچہ وہ شخص جسے وہ درخت عاریت یا ہبہ دیا گیا تھا۔ اپنے درخت خرما سے پھل توڑنے کے لئے آتا ہے۔ اب چونکہ ان باغات میں عاریت یا ہبہ دینے والے کے بال بچے رہائش پذیر ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس پر اس محتاج کا (وقت بے وقت) داخلہ شاق گزرتا ہے۔ بنا بریں اس ہبہ دینے والے کے لئے خصوصی رعایت کر دی گئی کہ وہ اس درخت کے ہبہ کئے ہوئے پھلوں کا اندازہ کر کے اس تخمینہ کے مطابق محتاج کو کھجور کا معاوضہ دے کر وہ پھل اس سے خرید لے۔ یہ ہے مالکؒ کی شرح۔

(۲) دوسری شرح:

(۱۴۵۸) عاریت دیئے ہوئے درختوں سے مراد وہ کھجور کے درخت ہیں جنہیں مالک درختوں کے پھلوں کا سودا کرتے وقت اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لئے الگ کر لیتا ہے اور فروخت میں شامل نہیں کرتا یہ الگ رکھے جانے والے درخت زکوٰۃ کے لئے اندازہ لگانے پر شمار میں نہیں لائے جائیں گے۔ اس لئے کہ وہ پھلوں کے موسم میں لوگوں کے کھانے کے لئے مستثنیٰ قرار پائیں گے۔ یہی عاریت دیئے ہوئے درخت ہیں جنہیں عربی میں "عرایا" کہتے ہیں (اس شرح کے قائلین کے لحاظ سے یہ لفظ عاریت سے نہیں بلکہ عاری اور عریانیت سے ماخوذ ہو گا۔ اس کے معنے ہوں گے وہ درخت جو فروخت سے یا زکوٰۃ کے لئے تخمینہ میں شمار ہونے سے عاری و مستثنیٰ رکھے گئے۔ گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے محتاجوں اور مسکینوں کو جو سونا چاندی

تو نہ رکھتے ہوں لیکن کھجور رکھتے ہوں ، اس بات کی رعایتی اجازت دیدی کہ وہ ان عاریت دیئے ہوئے کھجور کے درختوں (عرایا) کے پھلوں کا تخمینہ لگا کر درختوں کے مالکوں کو اندازہ کے مطابق کھجور دے کر ان کا سودا اپنے لئے کرلیں۔ یہ اجازت رسول اللہ ؐ نے ان ضرورتمندوں پر رحم کھاتے ہوئے دیں جو دوسرے لوگوں کی طرح گدر کھجور (رُطب) نہ پاسکتے ہوں۔ اس لئے نہیں کہ وہ اس سہولت سے فائدہ اٹھا کر تجارت اور ذخیرہ اندوزی کریں۔

ابو عبیدؒ:۔ یہ دوسری شرح میری نظر میں پہلی سے زیادہ صحیح معنی رکھتی ہے۔ اس لئے کہ اس شرح کی دو احادیث سے بھی تائید ہوتی ہے۔ پہلی حدیث تو یہ ہے جو مالک سے مروی ہے

عرایا کا تخمینہ پانچ وسق یا اس سے کم ہونا چاہیئے

(۱۴۵۹) ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ؐ نے ان عاریت دیئے ہوئے درختوں (عرایا) کو زکواۃ سے مستثنیٰ قرار دیا۔ جن کی کھجوروں کا اندازہ پانچ وسق یا پانچ وسق سے کم مقدار ہو، (پانچ وسق یا پانچ وسق سے کم کا شک اس حدیث کے ایک راوی داود بن الحصین کو ہوا ہے)

(۱۴۶۰) ابو عبیدؒ:۔ میرا خیال ہے کہ ان دونوں باتوں میں سے ارجح ومحفوظ "پانچ وسق سے کم مقدار" والی روایت ہے۔ اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زکوۃ کے لئے پانچ وسق کی شرط رکھنا اور پانچ وسق کے اندر رخصت دیدینا یہ بتا رہا ہے کہ آپ ؐ نے اس مقدار کی اجازت دی ہے جس پر زکواۃ عائد نہیں ہوتی، کیونکہ آپ کی سُنت یہ ہے "پانچ وسق سے کم پر زکواۃ نہیں، اور عاریت دیئے ہوئے درختوں پر زکواۃ نہیں"، یہ بعینہ وہی چیز ہے احادیث ایک دوسری کی تصدیق کرتی ہیں۔ اور آپ ؐ کا اس مقدار کو کم اور محدود کرنا بتا رہا ہے کہ آپ ؐ نے صرف اسی مقدار کی اجازت دی ہے جو لوگ کھا لیتے ہیں۔

دوسری حدیث جو اس شرح کی تائید کرتی ہے یہ ہے"

(۱۴۶۱) ابو قتادہؓ اور سہل بن ابی حثمہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عاریت دیئے ہوئے کھجور کے درخت کے سلسلہ میں یہ اجازت دی کہ ان کے گدر کھجوروں) کا تخمینہ لگا کر انہیں کھجوروں کے عوض فروخت کر دیا جائے تاکہ اُن کے مالک انہیں گدر (رطب

کی حالت میں) کھالیں۔

ابو عبیدؒ: اب یہ بات ابھر کر ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ عَرِیَّۃ سے مراد وہ درخت ہے جسے کھجور کے باغات کے مالک سے غربار مساکین اپنے لئے خرید لیں تاکہ وہ اس کے گدر کھجور کھائیں۔

پہلی شرح کی رو سے (عریۃ) وہ درخت ہوتا ہے جسے وہ بیچتے ہیں، اور اس شرح کے لحاظ سے یہ "خریدا ہوا" ہوتا ہے اور اُس لحاظ سے فروخت شدہ اگر فروخت کا مفہوم رکھا جائے تو پھر رسول اللہؐ کا یہ قول! "وہ اسکے گدر کھجور کھائیں" بے معنی ہو جاتا ہے، وہ اس کے گدر کھجور کیسے کھا سکتے ہیں۔ جبکہ وہ اسے فروخت کر چکے ہیں؟ اور ان پر کونسی مہربانی ہوئی کہ ان کے ہاتھوں وہ (درخت) کھجور کے عوض فروخت ہوا۔ حالانکہ انہیں دیا ہی اس لئے گیا تھا کہ وہ اس کے گدر کھجور کھا سکیں؟ یہ سب کچھ اہل حجاز کا قول اور ان کا مسلک ہے۔

اس ضمن میں ایک اور روایت بھی سہل بن ابی حثمہ سے مروی ہے۔

(۱۴۶۲) عبدالرحمٰن اعرج کہتے ہیں کہ میں نے سہل بن ابی حثمہ کو یہ کہتے سنا! "کھجور کے درختوں کے اوپر لگے ہوئے پھل وسقوں کے عوض نہیں فروخت کئے جا سکتے، ہاں صرف تین چار اور پانچ وسق تک فروخت کی اجازت ہے تاکہ انہیں گدر (رطب) کھا لیا جائے یہی مزابنت (یعنی معین مقدار کے عوض غیر معین مقدار کی فروخت) کہلاتی ہے"۔

"عرایا" کے بارے میں اہل عراق کا قول:

ابو عبید: یہ سب کچھ اہل حجاز یا بعض اہلِ حجاز کا قول ہے جہاں تک اہلِ عراق کا تعلق ہے "عَرَایا" کے بارے میں اِن کا قول بالکل جداگانہ ہے۔

(۱۴۶۳) ان سب کا یا ان کے اہل رائے کا قول ہے کہ اس قسم کا معاملہ ناجائز ہے اس لئے کہ اس میں بغیر ناپ تول کے گدر کھجور نپی تلی کھجوروں کے عوض فروخت کی جا رہی ہے۔ لہٰذا یہ حرام ہے اس لئے کہ یہ مزابنت ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس قسم کی تجارت سے منع فرمایا ہے۔

پھر یہ حضرات یوں استدلال کرتے ہیں کہ "عرایا" کے فروخت کی اجازت اس لئے دی

گئی کہ وہ غیر مقبوضہ ہبہ ہوتے ہیں اس کی رو سے کھجوروں کے پھل تو ہبہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن وہ پہلے کی طرح ہبہ دینے والے کی ملکیت ہی میں بحال رہتے ہیں۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ اگر یہ ہبہ دیئے ہوئے شخص کے قبضہ میں پہنچ جائیں تو پھر اس کے لئے ان کی فروخت صرف اسی شکل میں حلال ہوگی کہ وہ برابر مقدار کے عوض ناپ کر دے۔

ابو عبیدؒ: ہماری نظر میں یہ بے معنی و لغو تاویل ہے۔ اس لئے کہ اگر پھل ہبہ کرنیوالے کی ملکیت سے نہیں نکلے اور وہ پہلے کی طرح اسی کے قبضہ میں رہے تو یہ کس قسم کی بیع ہوئی؟ اور کس مصلحت کی بناء پر اس کی اجازت دی گئی؟ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اجازت دی کہ ہبہ دینے والا خود اپنا ہی مال خرید لے تو وہ ایسی چیز کیونکہ خریدے گا، جو خود اسی کی ملکیت میں ہے؟ اس قسم کا استدلال کسی اہلِ علم کے شایانِ شان نہیں۔

ہمارے خیال میں اس کی صرف وہی تاویل ممکن ہے کہ یہ خصوصی رعایت ہے جو باوجود مزابنت ہونے کے صرف "عرایا" کے لئے دیدی گئی۔

(۱۴۶۴) جس طرح آپؐ نے اس شخص کو جس نے عید الاضحیٰ کے دن نماز سے قبل (قربانی کا جانور) ذبح کر دیا تھا۔ اجازت دیدی تھی کہ وہ ایک سال (سے کم) کی بکری قربان کردے[۱]۔

(۱۴۶۵) اور جس طرح آپؐ نے عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو کسی مجبوری کی وجہ سے ریشم پہننے کی اجازت دیدی تھی[۲]۔

---

[۱] یہ شخص ابو بردہؓ تھے، انہوں نے عید الاضحیٰ کی نماز سے پہلے قربانی کر دی تھی، حضورؐ نے خطبہ میں فرمایا کہ جس نے نماز سے قبل قربانی کی وہ قربانی نہیں مانی جائیگی بلکہ معمولی گوشت کا جانور ہوگا۔ اس پر ابو بردہؓ نے کہا: یارسول اللہ میرے پاس ایک بکری جس کی عمر ایک سال سے کم ہے نہایت تر و تازہ اور عام گوشت کی بکریوں سے زیادہ بہتر، موجود ہے کیا وہ قربانی کے لئے کافی ہوگی؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں۔ لیکن تمہارے سوا بعد میں کسی اور کے لئے یہ کافی نہ ہوگی۔ (بخاری۔ مسلم۔ ابو داؤد)

[۲] آپ نے عبدالرحمٰن بن عوف اور زبیر بن عوام کو سفر میں خارش کی وجہ سے یا جوں پڑنے کی شکایت پر ریشم پہننے کی اجازت دیدی تھی۔ (بخاری)

(۱۴۶۶) اور جس طرح آپؐ نے حائض کو یہ اجازت دیدی کہ وہ خانہ کعبہ کا آخری طواف کئے بغیر ہی روانہ ہو جائے[1]۔

(۱۴۶۷) - اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے مجبور کو مردار، خون اور سور کا گوشت کھانے کی اجازت دیدی۔ جس کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں۔ یہی صورت "عرایا" کی بھی ہے۔

اہلِ عراق اور ان کے تخمینہ کی مخالفت پر بحث

(۱۴۶۸) اس کے ساتھ ہی اہل عراق زکواۃ کے لئے پھلوں کا تخمینہ لگانے کو بھی ناجائز سمجھتے ہیں، اور اس ضمن میں وہ مختلف دلائل تخمینہ کی تردید میں پیش کرتے ہیں۔

ان میں سے بعض کی دلیل ہے کہ تخمینہ سے بیع مزابنت کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ (یعنی تلی چیز کے عوض بے تلی چیز خریدنا) جسے ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔

ان کا کہنا ہے کہ یہی جوا ہے۔ اور یہی وہ خطرناک اقدام ہے جس میں فریقین میں سے کوئی بھی نہیں جانتا کہ کوئی اپنے دوسرے ساتھی کا مال لے لیگا۔ ان کا کہنا یہ بھی ہے کہ تخمینہ لگانا صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خصوصی عمل تھا، اس لئے کہ آپؐ اس طرح صحیح اندازہ لگاتے تھے جس کی کسی دوسرے کو توفیق نہیں ہو سکتی۔

ان کا کہنا ہے کہ یہی صورت قرعہ کی بھی ہے۔ اور وہ بھی رسول اللہؐ کے بعد کسی اور کے لئے جائز نہیں ہے۔

یہ ہیں اپنے قول کی تائید میں ان حضرات کے دلائل۔

ابو عبیدؒ:- ان میں سے ہر قول کی تردید میں جواب اور دلیل موجود ہے۔

(۱۴۶۹) - ان حضرات کا تخمینہ لگانے کو بیع مزابنت سے تشبیہ دینا اور بیع پر قیاس کرتے ہوئے زکواۃ میں بھی تخمینہ کو ناجائز قرار دینا، ایک کمزور و نادرست دلیل ہے، کیونکہ یہ لوگ زکواۃ کو بیع پر قیاس کر رہے ہیں۔ حالانکہ اسلامی اصول و قوانین قائم بالذات اور اپنی جگہ الگ اصول ہوتے ہیں۔ جنہیں ایک دوسرے پر قیاس نہیں کیا جا سکتا، اس لئے کہ ان میں سے ہر ایک اپنی جداگانہ اور انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔

---

[1] حضرت صفیہ کو یہ اجازت دی گئی تھی (بخاری و مسلم)

اگر ایسا کہنے والے کے خلاف کوئی یہ دلیل پیش کرے کہ جب آپ کو حق حاصل ہے کہ آپ بیع کو اصل قرار دیتے ہوئے زکوٰۃ کو اس پر قیاس کر لیں تو مجھے بھی یہ حق دیجئے کہ میں زکوٰۃ کو اصل قرار دے کر اس پر بیع کو قیاس کروں۔ بلحاظ دعویٰ دونوں یکساں ہیں، حالانکہ دونوں غیر صحیح صورتیں ہیں۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ ہر فریضہ اپنی مخصوص شکل اور جداگانہ سنت میں نافذ کیا جائیگا

(۱۴۷۰) بایں ہمہ اگر ہم مان بھی لیں کہ اس قائل کا بیع کو زکوٰۃ سے تشبیہ دینا جائز رہے تو بھی یہ دلیل اس کی موافقت میں نہیں بلکہ مخالفت میں ہوگی۔ اس لئے کہ باہمی بیع میں کھجور کو کھجور کے عوض فروخت کرنا ربا (سود) ہوگا الا یہ کہ وہ دونوں ہم وزن ہوں، حالانکہ زکوٰۃ میں وہ پھلوں پر صرف دسواں حصہ زکوٰۃ لینے کا قائل ہے۔ اور مالکوں کو دس حصوں میں سے نو حصے دینے کا، یہ کونسا قانون بیع ہے؟ کہیں ایسی بھی بیع ہوتی ہے کہ ایک صاع (پیمانہ) کو نو صاع کے عوض فروخت کر دیا جائے؟ اگر بقول اس کے یہ بیع سے مشابہ ہے تو آپ ہی بتائیے کہ ایسا کہنے والے کی عقل کہاں گئی؟ اور کوئی شخص جسے سنت کا علم یا نظر و فکر سے کچھ بھی لگاؤ ہو ایسی صریح غلطی کر سکتا ہے؟!

(۱۴۷۱) ان حضرات کا یہ کہنا کہ تخمینہ لگانا جوئے کی طرح ہے۔ بھلا یہ دونوں کیسے برابر ہو سکتے ہیں، جبکہ تخمینہ کا مقصد ہے۔ نیکی و تقویٰ اور حقوق کو ان کی صحیح جگہوں پر رکھنا اور جوئے کا مقصد اس کے برخلاف بے راہ روی، فحش کاری، حق سے گریز، نیز حرام مال پر قابض ہو جانا ہے ان دونوں میں کس قدر فرق ہے؟ کہیں گمراہی و ہدایت برابر ہو سکتے ہیں؟ پھر یہ دیکھئے کہ وہی سرچشمہ جو جوئے کی حرمت کی تعلیم دے رہا ہے۔ تخمینہ کی رخصت اور اس کی اجازت دے رہا ہے۔ غور طلب امر یہ ہے کہ آخر کیا چیز ہے جس کی بنا پر ایک بات یہاں مقبول قرار دی جاتی ہے۔ اور وہاں مردود؟

(۱۴۷۲)۔ اب رہا ان حضرات کا یہ کہنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تخمینہ لگانے اور قرعہ اندازی میں توفیق ایزدی حاصل تھی جو کسی دوسرے کو حاصل نہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان سے پوچھا جاتا کہ آیا ان دونوں باتوں کے علاوہ دیگر امور میں جملہ انسانوں کو وہ توفیق حاصل ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھی کہ تم اور امور کو چھوڑ کر صرف ان دو

باتوں میں حضور کی توفیق کو خاص کر رہے ہو؟ اور اگر لوگوں پر انبیاء کی اتباع صرف اسی شکل میں واجب ہوتی ہے جبکہ انہیں یقین ہو کہ اس عمل کے کرنے سے ان کے لئے بعینہٖ وہی نتائج پیدا ہوں گے جو انبیاء علیہ اسلام کے لئے پیدا ہوتے تھے اور بصورت دیگر ان کے اتباع سے گریز ضروری ہوتا تو اندریں صورت لوگوں کے لئے واجب ہو جاتا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی سنتوں پر عمل چھوڑ دیں۔ اور آپؐ کے احکام و اوامر سے گریز کریں۔ اس لئے کہ علمی طور پر یہ بات پایہ تحقیق کو پہنچ جاتی ہے کہ جس کے پاس آسمان سے وحی اور دیگر حالات کا علم آتا رہتا ہو۔ وہ کبھی اس شخص کی طرح نہیں ہوتا جو غیبی علم پر عمل پیرا ہو۔

(۱۴۷۳) لیکن میرے نزدیک معاملہ ان حضرات کے قول کے مطابق نہیں۔ نہ ان کا اختیار کردہ راستہ صحیح راستہ ہے۔ بلکہ لوگوں پر واجب ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی سنتوں کا احیاء کریں۔ آپ کے حکم کی پیروی اور آپؐ کی رہنمائی سے ہدایت حاصل کرتے ہوئے جن امور میں آپؐ نے سہولت اختیار فرمائی۔ ان میں سہولت پیدا کریں اور جن میں آپ نے سختی فرمائی ان میں سختی کریں اور یہ اللہ پر چھوڑ دیں کہ وہ توفیق و قبول سے سرفراز فرمائے۔

تخمینہ اور قرعہ اندازی دونوں سنّت رسولؐ ہیں

(۱۴۷۴)۔ ہمارے نزدیک تو تخمینہ اور قرعہ اندازی دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی جاری سنتیں ہیں جن پر آپؐ کے بعد ائمہ و علماء کا عمل رہا ہے۔

انگوروں اور کھجوروں کی زکواۃ ان کے خشک ہونے پر لی جائیگی

(۱۴۷۵) پھلوں کا تخمینہ جب وہ پکنے پر آنے لگتے ہیں اسی وقت لگایا جاتا ہے تاہم تخمینہ سے حساب کرتے وقت پیمائش (و وزن) میں یہ رعایت ملحوظ رکھی جاتی ہے کہ وہ خشک ہو کر (مثلاً گدر کھجور پک کر چھوارہ یا کھجور) اور انگور خشک ہو کر کشمش بننے پر کتنے ہو جائیں گے اور یہی وہ پھل تھے جو زکواۃ میں لئے جاتے تھے، اسی مضمون کی روایت زہری نے کی ہے جو اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے مرفوع بیان کرتے ہیں۔

(۱۴۷۶) ابن شہاب (زہری) کہتے ہیں: انگوروں کی بیلوں (یا باغات) کی زکواۃ

کا سنت طریقہ یہی رہا ہے انگور کی بیلوں (کے پھلوں) کا اسی طرح تخمینہ لگایا جائے جیسے کھجوروں کے درختوں کا لگایا جاتا ہے۔ پھر جس طرح کھجوروں کے خشک ہونے پر ان کی زکوٰۃ دی جاتی ہے اسی طرح انگوروں کی زکات کشمش کی شکل میں دی جائیگی۔ وہ کہتے ہیں کہ کھجور کے درختوں اور انگور کی بیلوں (کے پھلوں کی زکوٰۃ) کے سلسلہ میں یہی سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

(۱۴۷۷) مجھے ابن بکیر نے بتایا کہ یہی مالک رح کا بھی مسلک تھا۔

تخمینہ لگانے پر مامور ماہرِ فن افسر کے تخمینہ پر بہرحال عمل کیا جائے گا

ابوعبید رح: اگر تخمینہ لگانے والا غلطی سے تخمینہ لگانے میں کمی یا بیشی کر دے۔ تو قاسم بن محمد کے اس فتویٰ کے بموجب اسے اجازت ہوگی اور اس کے تخمینہ کو برقرار رکھا جائیگا:۔

(۱۴۷۸) بکیر بن عبداللہ بن الاشج کہتے ہیں کہ ایک شخص نے قاسم بن محمد سے سوال کیا۔ "اگر اندازہ لگانے والا آکر میرے پھلوں کا تخمینہ لگاتے اور ان کی صحیح مقدار سے کم یا زیادہ تخمینہ لگادے؟" تو انہوں نے کہا: "تمہیں اسی کے تخمینہ پر عمل کرنا ہوگا۔ کیونکہ اپنے منصب کے مطابق اس کا کام ہی تخمینہ لگانا ہے۔"

ابوعبید رح: یہی مالک رح کی بھی رائے تھی۔ وہ کہتے ہیں:

(۱۴۷۹) "اگر تخمینہ لگانے والا بے ضرر اور ماہر ہو اور صحیح اندازہ لگائے اور کچھ کمی بیشی کر دے تو اس کی تخمینہ لگائی ہوئی مقدار جائز ہوگی۔"

گویا مالک رح کی رائے یہ ہے کہ اس بارے میں اس کا فیصلہ نافذ ہوگا۔

(۱۴۸۰) **ابوعبید** رح: میرے نزدیک اس کی توجیہ یہ ہے کہ اس کی تخمینہ کی غلطی اس وقت تک نافذ ہوگی جب تک کہ وہ ایسی عام قسم کی غلطی ہو جسے لوگ برداشت کر لیتے ہوں، لیکن

تخمینہ میں حد سے متجاوز غلطی کی اصلاح کی جائے گی:

اگر وہ غلطی حد سے متجاوز ہو تو اسے درست کیا جائے گا، لیکن اس کے معنے ہرگز یہ نہیں کہ سرے سے تخمینہ ہی ناجائز قرار دیا جائے۔ اس لئے کہ اگر اس قسم کی حد سے متجاوز غلطی کسی ناپ میں واقع ہو جائے تو اسے بھی تخمینہ کی طرح رد کر دیا جائیگا۔ ہاں اگر

وہ (غلطی، کمی یا بیشی دو پیمانوں کی درمیانی مقدار کے اندر اندر ہو تو ایسی صورت میں وہ جائز ہوگی۔

اوقاف پر زکوٰۃ کے بارے میں اختلاف

(۱۴۸۱) ابوعبیدؒ : اب اگر وہ زمین جس کی پیداوار کا تخمینہ لگا کر اس سے زکوٰۃ لینا ہو، وقف ہو اور اسی طرح مویشی بھی فی سبیل اللہ وقف ہوں یا وقف شدہ دیگر مال و دولت ہو، تو اس کے بارے میں متعدد اقوال ہیں۔

(۱۴۸۲) خالد بن ابی عمران کہتے ہیں کہ میں نے سالم بن عبداللہ اور قاسم بن محمد سے دریافت کیا کہ ایسے کھجور کے درخت جنہیں خیرات کر دیا گیا ہو۔ کیا زکوٰۃ کا تخمینہ لگاتے وقت انہیں بھی اندازہ میں شامل کیا جائے گا؟" تو ان دونوں نے کہا! "ہاں"

(۱۴۸۳) عبدالکریم بصری کہتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت ابن عباسؓ سے کہا کہ میں نے دس اونٹ راہ خدا میں وقف کر دیئے ہیں۔ کیا اب مجھے ان پر زکوٰۃ دینا پڑے گی؟"، اس پر ابن عباسؓ نے کہا "اے ابوہریرہ! یہ ایک مشکل مسئلہ ہے جو حضرت عائشہؓ کے گھر میں پیش آنے والے مسئلہ سے کسی طرح کم نہیں۔ تم کچھ کہو"، ابوہریرہؓ نے کہا "میں اللہ کی مدد چاہتا ہوں۔ (پھر سائل سے کہا!) تجھ پر کوئی زکوٰۃ نہیں"، اس پر ابن عباسؓ نے کہا! تمہارا فیصلہ درست ہے۔ ہر وہ جانور جس کی پشت پر بار نہ لادا جائے، اور جس کے دودھ سے انتفاع نہ کیا جائے اور جس کی نسل سے فائدہ نہ اٹھایا جائے، اس پر کوئی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی"، اس پر عبداللہ بن عمرؓ نے کہا "تم دونوں نے درست فیصلہ دیا ہے۔"

(۱۴۸۴) ابن شہابؒ نے بھی اسی جیسے کسی مسئلہ میں کہا ہے کہ اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ "فی سبیل اللہ" کے لفظ میں اتنی وسعت ہے کہ وہ مساکین، دیوالیے اور قرضہ داروں، مسافروں، مولفۃ القلوب اور سائلین سب پر حاوی ہے۔

(۱۴۸۵) ابوعبیدؒ : میری نظر میں ابن عباسؓ ابوہریرہؓ اور عبداللہ بن عمرو نیز ابن شہابؒ کے قول کے مطابق (وقف شدہ مال پر) زکوٰۃ ساقط کرنے کی توجیہ یہ ہے کہ یہ (وقف شدہ) مال مشروط ہے کہ اسے حاجتمندوں اور مساکین میں خرچ کیا جائے۔ اب اگر اس مال پر زکوٰۃ لی گئی تو وہ بھی ایسے ہی نادار لوگوں میں تقسیم ہوگی۔ البتہ اگر یہ مال (مخصوص افراد یا)

کسی معینہ جماعت کے لئے وقف ہو تو اس کا حکم تمام بقیہ اموال کی طرح رہے گا (یعنی اس پر زکوٰۃ لی جائے گی)، یہی صورت اس زمین کی ہے جس کے متعلق قاسم بن محمد اور سالم (بن عبداللہ) نے فتویٰ دیا تھا۔

پانچ وسق سے زائد پھلوں کو فروخت کر کے ان کی قیمت میں سے زکوٰۃ لی جائیگی

(۱۴۸۶) **ابو عبیدؒ**: اب اگر صورت یہ ہو کہ پھل گدر ہوں اور پک کر خشک ہو کر کھجور یا چھوارہ نہ بنتے ہوں، یا انگوروں سے کشمش و منقّے نہ بنے ہوں، تو مالکؒ سے اس بارے میں مروی ہے: "اگر ان کا تخمینہ پانچ وسق تک پہنچ جائے تو ان کی فروخت کے بعد ان کی قیمت پر ہر دو سو درہم میں سے پانچ درہم بطور زکوٰۃ ادا کرنا ہوں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہی صورت اس زیتون کی ہوگی جس میں

بعض پھلوں کا تخمینہ نہیں لگایا جائیگا

تیل نہ ہو، یعنی اس کی زکوٰۃ بھی اسی اصول کے مطابق ادا ہوگی۔ البتہ اس کا تخمینہ نہیں لگایا جائے گا۔ بلکہ وہی مقدار قبول کر لی جائے گی جو اس کے مالکان پیش کریں گے۔

باب

ان اموال کا بیان جن پر زکواۃ واجب ہونے میں علماء کا اختلاف رہا، یہ تین قسم کی چیزیں ہیں شہد، زیتون اور سبزیاں

شہد پر زکواۃ (عشر اور نصف عشر)

(۱۴۸۷) سعد بن ابی ذبابؓ کہتے ہیں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا "میں نے اسلام قبول کر لینے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی" یا رسول اللہؐ ! اسلام لانے پر میری قوم جن اموال کی مالک ہے وہ انہی کو عطا فرما دیجئے" چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ درخواست قبول فرمائی اور مجھے ان پر عامل بنا دیا اور آپؐ کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے بھی مجھے عامل رکھا پھر ان کے بعد حضرت عمرؓ نے بھی مجھے عامل رکھا۔ سعدؓ کہتے ہیں کہ جب وہ اپنی قوم کے حاکم بن کر گئے۔ تو انہوں نے اپنی قوم سے کہا "شہد پر زکواۃ لی جائے گی۔ اور دیکھو اس مال میں کوئی خیر و برکت نہیں ہوتی جس کی زکواۃ نہ دی جائے۔ اس پر ان کی قوم نے پوچھا" آپ کی رائے میں اس پر کس قدر زکواۃ ہوگی؟" تو انہوں نے کہا" دسواں حصہ" چنانچہ وہ یہ مقدار (زکواۃ) لے کر حضرت عمرؓ کے پاس پہنچے اور انہیں اپنے کئے کی اطلاع دیدی، حضرت عمرؓ نے وہ (زکواۃ کا شہد) لیکر اسے فروخت کیا اور اس (آمدنی) کو مسلمانوں کی زکواۃ (کی آمدنیوں) میں شامل کر لیا(۱)۔

---

(۱) امام شافعی کا خیال ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ وسلم سے شہد کے بارے میں کوئی حکم نہیں۔ آپ نے کوئی خیال ظاہر فرمایا تھا۔ اور لوگوں نے رضا کارانہ اس پر عمل کر دیا تھا۔ انہوں نے شہد پر عشر لئے جانے والی حدیث ضعیف بتائی ہے اور یہ مسئلہ اختیاری ہے

امام بخاری اس باب میں کوئی حدیث صحیح نہیں ملتے۔ ابوبکر بن منذر کہتے ہیں۔ شہد کی زکواۃ کے سلسلے میں نہ کوئی حدیث ثابت ہے نہ اجماع، لہذا اس پر کوئی زکواۃ نہیں۔ (التلخیص لابن حجر! ۱۸۰)

(۱۴۸۸) سلیمان بن موسٰے کہتے ہیں کہ ابو سیارہؓ متعیؓ نے ــــ جو بنو بجالہ کے حلیف تھے ــــ کہا "یا رسول اللہ! میری شہد کی مکھیاں ہیں" تو آپؐ نے فرمایا (ان کی پیداوار پر) دسواں حصّہ ادا کرو"۔ اس پر ابو سیارہؓ نے کہا! "اندریں صورت آپؐ شہد کے چھتوں کا پہاڑ میرے لیے محفوظ فرما دیں" چنانچہ آپؐ نے ان کے لیے اس پہاڑ کی حفاظت کا بندوبست فرما دیا (اور اس میں دوسروں کو مداخلت سے منع کر دیا)

(۱۴۸۹) عمرو بن شعیب اپنے باپ اور اپنے دادا کی وساطت سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں شہد کی دس کُپّیوں پر ایک درمیانہ کُپّی (بطور زکواۃ) لی جاتی تھی [۱]

(۱۴۹۰) ہلال بن مرّہ راوی ہیں کہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے شہد کے عشور (دسویں حصّہ زکواۃ) کے متعلق یہ شرح بیان فرمائی "وہ شہد جو میدانی علاقہ سے نکالا جائے اس پر دسواں حصہ اور جو پہاڑی علاقہ سے نکالا جائے اس پر بیسواں حصّہ لیا جائے گا۔"

(۱۴۹۱) خُصَیف کہتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیزؒ کی رائے یہ تھی کہ شہد پر دسواں حصّہ

---

[۱] ابوداؤد و نسائی میں یہ روایت ہے کہ ہلالؓ رسول اللہؐ کے پاس اپنے شہد کا عشور لے کر حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ آپؐ حکم جاری فرما دیں کہ ان کے لئے وادی سلبہ مخصوص و محفوظ ہو جائے۔ چنانچہ آپ نے ان کی درخواست منظور فرمالی۔ اپنی خلافت میں حضرت عمرؓ نے سفیان بن وہب کو لکھا تھا۔ اگر شہد کی زکواۃ کے سلسلہ میں وہ کچھ جو وہ رسول اللہ کو ادا کرتے تھے تمہیں بھی ادا کرتے رہیں۔ تب تو ان کے لئے سلبہ کی حفاظت کرو ورنہ وہ عام شہد کے چھتوں کی طرح ہوں گے جو چاہے ان کا شہد نکال لے جائے۔ (التلخیص لابن حجر ! ۱۸۰)

ترمذی کہتے ہیں۔ اس باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی بڑی چیز صحیح طور پر مروی نہیں ہے۔

ابن ابی شیبہ کی روایت ہے "طائف کے حاکم نے حضرت عمرؓ کو لکھا کہ شہد والوں نے جو کچھ وہ ہم سے پہلوں کو دیتے تھے روک لیا ہے تو حضرت عمرؓ نے لکھا اگر وہ مقدار جو وہ رسول اللہؐ کو دیتے تھے تم کو دیتے رہیں تو ان کی وادیوں کو محفوظ رکھنے کی ذمہ داری لو ورنہ نہ لو۔ اس کے راوی عمرو بن شعیب کا خیال ہے کہ وہ لوگ دس کپیوں پر ایک کپی دیا کرتے تھے۔ (از حاشیہ کتاب الاموال)

زکواۃ لیا جائے۔

(۱۴۹۲) مکحول کہتے ہیں کہ شہد کی ہر دس کپیوں پر ان کا دسواں حصہ بطور زکواۃ دیا جائیگا

(۱۴۹۳) زہری کہتے ہیں "ہر دس (شہد کی) کپیوں پر ایک کپی (شہد زکواۃ دی جائے گی)

(۱۴۹۴) سلیمان بن موسے کہتے ہیں "شہد کی ہر دس کپیوں پر ایک کپی زکواۃ ہوگی۔"

سعید کہتے ہیں کہ ایک کپی میں دو رطل شہد آتا ہے۔

ابو عبیدؒ:۔ یہاں تک ان حضرات کے اقوال تھے جو شہد پر زکواۃ واجب قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس باب میں علاوہ ازیں دوسرا قول بھی ہے۔

شہد پر زکواۃ نہ لینے والوں کے اقوال

(۱۴۹۵) ابن عمرؓ کہتے ہیں" نہ گھوڑوں پر زکواۃ ہے نہ غلاموں پہ نہ شہد پر"

(۱۴۹۶) عبداللہ بن ابی بکر کہتے ہیں" میرے والد کے پاس عمر بن عبدالعزیزؒ کا خط آیا جس میں لکھا تھا" گھوڑوں پر اور شہد پر زکواۃ نہ لینا۔"[1]

(۱۴۹۷) ابو عبیدؒ:۔ مالکؒ اسی قول کو لیتے تھے۔ وہ کہتے تھے شہد پر زکواۃ نہیں وہ اسے عنبر اور موتیوں سے مشابہ قرار دیتے تھے۔

(۱۴۹۸) ابن ابی لیلیٰ اور سفیان کے اقوال کا بھی ہماری تاویل کے مطابق یہی نتیجہ نکلتا ہے اس لئے کہ ان دونوں حضرات کی رائے یہ ہے کہ زکواۃ صرف ان چار چیزوں پر ہے گیہوں کھجور، جو اور کشمش۔ بعد میں ان دونوں حضرات کے سوا دیگر علماء عراق نے اس مسئلہ میں اختلاف کیا ہے۔

خراجی یا عشری زمین سے نکلنے والا شہد

(۱۴۹۹) چنانچہ ان میں سے بعض کا قول ہے" اگر شہد خراج کی زمین میں ہو تو اس پر کوئی زکواۃ نہیں لی جائے گی" کیونکہ ان حضرات کا کہنا ہے کہ ایک ہی زمین سے بیک وقت خراج اور عشر وصول نہیں کیا جائے گا۔ ان کا

---

[1] ابن ابی شیبہ کی روایت ہے نافع کہتے ہیں۔ مجھے عمر بن عبدالعزیز نے یمن کا عامل بنا کر بھیجا تو میں نے شہد پر عشر لینا چاہا اس پر مغیرہ بن حکیم صنعانی نے کہا اس پر کوئی زکواۃ نہیں میں نے یہ حضرت عمر کو لکھا تو انہوں نے کہا مغیرہ نے سچ کہا اور وہ پسندیدہ و عدل ہیں۔ (از حاشیہ)

یہ بھی کہنا ہے کہ اگر شہد عشر کی زمین میں ہو تو اس کی تھوڑی یا زیادہ مقدار پر دسواں حصہ لیا جائے گا۔

اگر شہد کسی غلّہ کے پانچ وسق کی قیمت کے برابر ہو جاتے تو اس پر زکواۃ عائد ہوگی

(۱۵۰۰) دیگر حضرات کا قول ہے کہ شہد پر کچھ نہیں لیا جائے گا تاآنکہ اس کی قیمت کسی گھٹیا ترین ایسی شے کی پانچ وسق مقدار کی قیمت کے مساوی نہ ہو جائے جس پر زکواۃ لی جاتی ہو۔

یہ ہیں وہ روایات جو شہد کے بارے میں آئی ہیں۔

باب

زیتون پر زکواۃ کا بیان

(۱۵۰۱) حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں " زکواۃ گیہوں ، جو ، کھجور ، (منقےٰ) کشمش بے چھلکوں کے سفید جو اور زیتون پر واجب ہے "

(۱۵۰۲) ابن شہاب کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ بن الخطاب نے زیتون کے ہر پانچ وسق پر زکواۃ لی دس مُدّ وزن ہونے پر ایک مدی [1] [2]

زیتون یا اس کے تیل پر زکواۃ

(۱۵۰۳) عُقیل کہتے ہیں کہ شہاب سے ایک ایسے شخص کے بارے میں دریافت کیا گیا جسکے پاس زیتون ہو تو انہوں نے کہا " اس کے تیل پر جب وہ نکالا جائے زکواۃ ادا کی جائے گی ۔ اس میں سے وہ زیتون جو از خود

عشر یا نصف عشر

سیراب ہونے والی یا بارانی زمین پر پیدا ہوئی ہو دسواں حصّہ زکواۃ کا ہوگا اور جو ڈول وغیرہ سے سیراب ہونے والی زمین میں پیدا ہو اس پر بیسواں حصّہ ۔

(۱۵۰۴) ابو عبیدؒ :- یہی امام مالکؒ کا مسلک تھا جیسا کہ ان کے بارے میں مجھ سے ابن بکیر نے بیان کیا ہے ۔

ابن شہاب کے قول کے مطابق ان کا بھی یہی خیال تھا کہ زیتون کی زکواۃ اسکے تیل پر لی جائے

(۱۵۰۵) لیکن اہل عراق کہتے ہیں کہ زیتون کی زکواۃ اس کے پھل پر ہی لی جائے گی ۔ اور مذکورہ بالا مذہب کے مطابق دسواں یا بیسواں حصّہ لیا جائے گا ۔

اس رائے سے ابن ابی لیلی اور سفیان متفق نہیں ، یہ دونوں حضرات غلّہ اور تیل پر زکواۃ کے قائل نہیں اس لئے کہ ہم پہلے ان دونوں کا یہ قول بیان کر آئے ہیں کہ صرف چار

---

[1] ۔ اصل میں مدہی ہے ، ہمارے خیال میں یہ مدی ہونا چاہیئے (مترجم)

[2] ۔ حضرت عمرؓ نے ابن ابی شیبہ کی ایک روایت کے مطابق شام میں زیتون کی پیداوار پر عشر لیا تھا ۔

اصناف کی ملکیّت پر زکواۃ واجب ہوتی ہے (یعنی کھجور، کشمش، گیہوں اور جو) یہ ہیں زیتوں سے متعلق روایات۔

سبزیوں[1] (اور پھلوں) کا بیان

پھلوں اور سبزیوں پر زکواۃ نہیں

(١٥٠٦) عطاء بن سائب کہتے ہیں کہ مغیرہ بن عبداللہ نے موسیٰ بن طلحہ کی زمین میں پیدا ہونے والی سبزیوں اور پھلوں پر زکواۃ لی تو موسیٰ نے ان سے کہا "یہ تمہارا حق نہیں ہے اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سبزیوں پر زکواۃ لینے سے منع فرمادیا ہے۔[2]

(١٥٠٧) مجاہد کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "سبزیوں پر کوئی زکواۃ نہیں ہے"

(١٥٠٨) ابواسحٰق کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے فرمایا "سیب اور اس سے مشابہ قسم کے پھلوں پر کوئی زکواۃ نہیں"

(١٥٠٩) مغیرہ راوی ہیں کہ مجاہد نے کہا "پھلوں اور سبزیوں پر کوئی زکواۃ نہیں" مغیرہ کہتے ہیں کہ میں نے یہ قول ابراہیم سے بیان کیا ہے۔ انہوں نے اس کی تصدیق کی اور اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔

(١٥١١) اور اسناد سے بھی مغیرہ، مجاہد و ابراہیم سے ایسی ہی روایت بیان کرتے ہیں۔

(١٥١٢) شعبی کہتے ہیں "موسم گرما کی پیداوار پر کوئی زکواۃ نہیں"

ابوعبیدؒ:- ان تمام مسائل میں مالک بن انس کا بھی یہی قول ہے مجھے اس کے بارے میں ابن

---

[1] یہ عربی لفظ خُضَر کا ترجمہ ہے۔ عربی فقہاء اس لفظ کو تمام سبزیوں، خوشبودار پھول بوٹوں پھلوں میووں کے لئے استعمال کرتے ہیں مثلاً ککڑی، کھیرا، باقلا، گاجر، مولی، لوکی ٹنڈا، گلاب و یاسمین، امرود، آڑو، سیب، انجیر، خوبانی، ناشپاتی، انار کیلا، بادام، اخروٹ، خربوزہ، تربوز وغیرہ (کتاب الخراج یحییٰ بن آدم نمبر ٤٩٧)

[2] موسیٰ بن مغیرہ نے موسیٰ بن طلحہ کی زمین سے پیدا ہونے والی سبزیوں پر محصول لینا چاہا تو موسیٰ بن طلحہ نے ان سے کہا۔ سبزیوں پر کسی قسم کا محصول نہیں لیا جاتا اور اسے رسول اللہؐ سے روایت کیا۔ یہ بات جب حجاج کو لکھی گئی تو انہوں نے جواب میں لکھا موسیٰ بن طلحہ موسیٰ بن مغیرہ سے زیادہ جاننے والے ہیں (الخراج یحییٰ بن آدم نمبر ٥٠٣)

بُکیر نے بتایا ہے وہ کہتے ہیں۔

(۱۵۱۳) مالک نے کہا۔ اس بارے میں ہمارے درمیان کوئی اختلاف نہیں کہ انار، آلو بخارا انجیر وغیرہ کی قسم کے پھلوں میں سے کسی چیز پر زکواۃ واجب نہیں ہوتی اور نہ ہی سبزیوں پر کوئی زکواۃ ہوتی ہے نہ ہی ان کی قیمتوں پر وقت فروخت کوئی زکواۃ واجب ہوتی ہے تاآنکہ رقم کی وصولی کے بعد سے اس پر پورا سال نہ گذر جائے''

امام ابو حنیفہؒ کی جُداگانہ رائے اور اُن کے ساتھیوں کا ان کی رائے سے اختلاف

(۱۵۱۴)۔ ابو عبیدؒ: اس بارے میں سفیان اور تمام اہلِ عراق کا بھی یہی توم ہے صرف ابو حنیفہؒ مستثنےٰ ہیں جو کہتے ہیں'' زمین سے پیدا ہونے والی تھوڑی یا زیادہ مقدار (سب پر) زکواۃ واجب ہے''

(۱۵۱۵) میں نے محمدؒ کو ان کے بارے میں یہی روایت بیان کرتے سنا، البتہ اس میں اتنا اضافہ ہے'' اس (زمین کی پیداوار) سے ایندھن نرکل اور گھاس مستثنےٰ ہے''

(۱۵۱۶) لیکن ان (ابو حنیفہؒ) کے ساتھیوں نے اس بارے میں ان سے اختلاف کرتے ہوئے دوسروں کے قول کی تائید کی ہے اور تمام آثار بھی اس کے مؤید ہیں اور آج امت اس پر عمل پیرا ہے۔

(۱۵۱۷) اگرچہ مجاہد اور ابراہیم سے ان (ابو حنیفہؒ) کے قول کی موافقت میں کچھ مروی ہے تاہم انہی دونوں حضرات سے اس کی مخالفت میں بھی روایت ہے۔

(۱۵۱۸) مجاہد سے مروی ہے'' زمین سے جو کچھ بھی نکلے وہ خواہ تھوڑا ہو یا زیادہ، وہ بارانی زمین سے ہو یا چشموں سے سیراب ہونے والی، اس پر دسواں حصّہ زکواۃ ہوگا اور جو ڈول، رہٹ وغیرہ کی مدد سے سیراب ہونے والی ہو اس پر بیسواں حصّہ [1]

(۱۵۱۹) ابو عبیدؒ: منصور یا حماد نے بھی ابراہیم سے اسی مضمون کی روایت کی ہے۔

اس کا مخالف مضمون جو مجاہد و ابراہیم سے مغیرہ روایت کرتے ہیں ہم اوپر بیان کر چکے

---

[1] ابن ابی شیبہ کی روایت ہے زمین سے جو بھی کم یا زیادہ پیداوار ہو اس پر عشر یا نصف عشر زکواۃ لی جائے گی۔

ہیں (دیکھئے نمبر ۱۵۰۹ تا ۱۵۱۱)

(۱۵۲۰) ابو عبیدؒ:- آج علماء عراق و حجاز و شام کا اس امر پر اجماع ہے کہ سبزیوں پر کوئی صدقہ (زکوٰۃ)

عشری زمین کی سبزیوں اور پھلوں کی زکوٰۃ

نہیں خواہ وہ تھوڑی ہوں یا بہت بشرطیکہ وہ عشر والی زمین میں ہوں۔ یہی فیصلہ ان کا پھلوں کے بارے میں بھی ہے، البتہ ان کے علاوہ دیگر غلّوں اور دالوں کے متعلق ان میں اختلاف رہا ہے اور ان کا یہ اختلاف ہم پچھلے صفحات میں اس کے صحیح مقام پر بیان کر آئے ہیں۔ ہاں بعض اسلاف کی رائے تھی کہ ان اشیاء کی قیمتوں پر وقتِ فروخت زکوٰۃ لی جائے گی۔

(۱۵۲۱) ان میں میمون بن مہران اور ابن شہاب قابلِ ذکر ہیں۔

سبزیوں کی زکوٰۃ ان کی قیمتوں پر لی جائے گی

ابو عبیدؒ:- اور میرا خیال ہے اوزاعی ان کے تیسرے ہیں۔

(۱۵۲۲) جعفر بن برقان کہتے ہیں کہ میں نے میمون بن مہران سے سبزیوں کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے کہا "ان پر جب تک انہیں فروخت نہ کیا جائے کوئی زکوٰۃ نہیں، لیکن جب انہیں فروخت کر دیا جائے اور ان کی قیمت دو سو درہم ہو جائے تو ان پر پانچ درہم زکوٰۃ ہوگی۔

(۱۵۲۳) عُقیل، ابن شہاب سے روایت کرتے ہیں "پھلوں اور سبزیوں کی قسم کی چیزوں پر ان کی فروخت کے وقت ان کی قیمتوں پر زکوٰۃ واجب ہوگی جو سونے اور چاندی کی زکوٰۃ کے مطابق ہوگی۔"

(۱۵۲۴) ابو عبیدؒ۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آج اہل عراق و اہل حجاز میں سے کوئی اس قول کا قائل نہیں اور نہ نظری اعتبار سے ایسا ہونا ممکن ہے، بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اصل پر تو زکوٰۃ ساقط ہو اور فروع پر زکوٰۃ عائد ہو جائے؟ قاعدہ تو یہ ہے کہ فروع اصول پر مبنی اور اصول کی تابع رہتی ہیں، اب اس کے سوا اور کیا صورت رہ جاتی ہے کہ سبزیاں — جبکہ ان پر سبزیوں کی شکل میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی — سامانِ تجارت اور غلاموں کی طرح سمجھی جائیں جن پر ان کی موجودہ شکل میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔

اندریں صورت ان کی قیمتوں پر وقت فروخت زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی تا آنکہ بقول امام مالکؒ قیمت کی وصولی کے وقت سے اس پر پورا سال نہ گذر جائے۔

سبزیوں کی قیمتوں پر پورا سال گذرنے کے بعد زکوٰۃ

اور سفیانؒ اور اہل عراق کا قول بھی یہی ہے کہ ان اشیاء کی قیمتوں پر پورا سال گذرنے سے قبل ان پر کوئی زکوٰۃ نہیں لی جائے گی۔

ابو عبیدؒ۔ یہ ہیں وُہ آثار و روایات جو سبزیوں کے بارے میں آئی ہیں۔

زیتون اور تیل کی زکوٰۃ

(۱۵۲۵) میری رائے میں یہی صورت زیتون کی بھی ہوگی اور اس پر بھی ان اشیائے کے مطابق زکوٰۃ نہیں لی جائے گی، اس لئے کہ زیتون بمقابلہ ان چار کھانے کی اجناس کھجور، کشمش، گیہوں اور جو کے جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ مقرر فرمائی ہے۔ ان (سبزیوں اور پھلوں) سے زیادہ مشابہ ہے۔

نیز میرا خیال ہے کہ زیتون کو ان دالوں سے بھی مشابہت نہیں جن پر بعض حضرات نے زکوٰۃ واجب قرار دی ہے اس لئے کہ دالیں تو خشک ہو جاتی ہیں اور ان کا ذخیرہ کر لیا جاتا ہے اور یہ زیتون مرطوب رہتا ہے اور خراب ہو کر بجڑ جاتا ہے۔ ہاں اگر وہ (پھلیوں میں پیدا ہونیوالی) دالوں میں کسی سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے تو وہ تل ہیں یہ اس لئے کہ ان دونوں کے پھل کھانے کے کام بھی آتے ہیں اور ان کے تیل بطور ترکاری بھی استعمال ہوتے ہیں۔

(۱۵۲۶) حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کو یمن بھیجا تھا جو تلوں کا مرکز ہے لیکن ہمیں کوئی ایسی روایت نہیں ملتی جس سے معلوم ہو کہ آپؐ نے انہیں تلوں کے بیج یا اس کے تیل کے بارے میں کوئی حکم دیا ہو۔

(۱۵۲۷) یہی صورت زیتون کے تیل کی ہے کہ اس کے بارے میں ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی ایسی حدیث نہیں ملتی جس سے ثابت ہو کہ آپؐ نے اس پر کچھ زکوٰۃ مقرر کی ہو حالانکہ یہ سب ہی جانتے ہیں کہ آپؐ اس سے باخبر تھے، اپنے کھانے میں اسے پسند فرماتے تھے۔ اور ایک حدیث کے بموجب آپؐ حکم دیتے تھے کہ زیتوں کا تیل (سر اور بدن پر) ملا جائے۔ اور خود قرآن مجید میں بھی اس (زیتوں کے) تیل کا ذکر آیا ہے۔ بایں ہمہ آپؐ نے اس

تیل کے بارے میں کوئی ایسا ضابطہ (سنت) مقرر نہیں فرمایا جو ہمارے علم میں آیا ہو اور نہ اپنے مکاتیب زکوٰۃ میں کہیں آپؐ نے اس کا تذکرہ فرمایا، حالانکہ ان میں پھلوں اور زمینوں (کی پیداوار) پر عشور کا ذکر فرمایا ہے۔

(۱۵۲۸) ابو عبید:- ہمارے نزدیک تو زیتون ان اشیاء میں شامل ہے جن پر زکوٰۃ معاف کر دی گئی ہے جیسے کہ سبزیوں اور پھلوں پر حضورؐ نے زکوٰۃ معاف فرمادی بایں ہمہ ائمہ میں سے کسی سے بھی اس بارے میں کوئی صحیح قول منقول نہیں۔

اس لئے کہ وہ روایت (دیکھئے نمبر ۱۵۰۲) جو ہم نے حضرت عمر بن خطابؓ سے بیان کی ہے محفوظ نہیں ہے کیونکہ لیث نے عقیل کے واسطہ سے ابن شہاب سے وہی روایت موقوف بیان کی ہے اور حضرت عمرؓ سے منسوب نہیں کی ہے پھر اگر وہ (حضرت عمرؓ والی روایت) محفوظ بھی ہو تب بھی وہ مرسل ہوگی اور رسول اللہ کا قول نہیں ہوگی کیونکہ اسے ابن شہاب حضرت عمر بن الخطابؓ سے روایت کرتے ہیں۔

اسی طرح حضرت ابن عباسؓ کا قول (دیکھئے نمبر ۱۵۰۱) اگرچہ وہ سنداً حضرت عمرؓ والی روایت سے بہتر ہے تاہم اس میں بھی کلام ہے۔

(۱۵۳۰) ابو عبیدؒ:- بایں ہمہ وہ روایات جو ہم ابن عمرؓ، ابو موسیٰ شعریؓ، شریح، شعبی ابراہیم اور حسن سے زمین کی پیداوار پر زکوٰۃ کے باب میں بیان کر آئے ہیں۔ ان روایات میں ان اصناف کا نام لے کر ذکر کیا ہے جن پر زمین کی پیداوار میں سے زکوٰۃ واجب ہے اور ان کے علاوہ دیگر اشیاء پر زکوٰۃ ساقط قرار دی ہے (ان مذکورہ اصناف کی فہرست پر نظر ڈالنے سے) یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ حضرات زیتون پر بطور زکوٰۃ کچھ لینا واجب نہیں سمجھتے تھے اس لحاظ سے مرفوع حدیث کے ساتھ ان سب حضرات کی یہ رائے بھی شامل ہو جاتی ہے

(۱۵۳۱) پھر ابن ابی لیلی اور سفیان دونوں کے مذہب کے مطابق یہی ان کی رائے بھی ہے

شہد پر زکوٰۃ نہیں

(۱۵۳۲) اور ان تمام حضرات کی جن کے تمام اسمائے گرامی اوپر گذرے شہد کے بارے میں بھی یہی رائے ہے کہ اس پر کوئی زکوٰۃ نہیں اس لئے کہ ان حضرات نے ان اشیاء کا خصوصیت سے تذکرہ کر دیا جن پر زکوٰۃ واجب ہے اور دیگر اشیاء کا ذکر قصداً سے

غیر متعلق ہونے کی وجہ سے چھوڑ دیا، چنانچہ شہد بھی ان چیزوں میں سے ہے جن پر انہوں نے زکواۃ اُڑا دی ہے اس ضمن میں وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث اور حضرت معاذؓ کی روایت سے استدلال کرتے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے حضرت معاذؓ کو یمن بھیجتے وقت شہد کے بارے میں کوئی حکم نہیں دیا تھا۔ حالانکہ یمن شہد کی منڈی ہے چنانچہ ان روایات سے شہد پر زکواۃ ساقط قرار پاتی ہے جبکہ دیگر روایات —— جنہیں ہم شروع باب میں بیان کر آئے ہیں —— کے لحاظ سے شہد پر زکواۃ واجب قرار پاتی ہے اس طرح شہد کے بارے میں دونوں نقطۂ نظر برابر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

شہد کی زکواۃ کی توجیہ

(۱۵۳۳) اس بارے میں میرے نزدیک زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ اس (شہد) کے مالکوں کو اس پر زکواۃ ادا کرنے کا حکم دیا جاتا ہوگا اور اس بارے میں انہیں ترغیب دی جاتی ہوگی اور اس کی زکواۃ نہ ادا کرنے کو ناپسند کیا جاتا ہوگا اور اسے چھپانے پر انہیں گنہگار ہونے کا خطرہ رہتا ہوگا۔ لیکن بایں ہمہ یہ زمین اور مویشیوں کی زکواۃ کی طرح ان پر فرض نہ تھی اور جس طرح زمین اور مویشیوں کی زکواۃ نہ دینے والوں سے جہاد کیا جاتا تھا اس کی زکواۃ نہ ادا کرنے والوں سے جہاد نہیں کیا جاتا تھا۔

(۱۵۳۴) اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی صحیح سُنت ثابت نہ تھی جیسے زمین اور مویشیوں کی زکواۃ میں ثابت تھی نہ ہی اس کا تذکرہ آپؐ کے مکاتیب زکواۃ میں تھا۔ لیکن اگر یہ (شہد کی زکواۃ) بھی اس درجہ پر ہوتی (جس پر زمین اور مویشیوں کی زکواۃ تھی) تو ان کے بھی مقررہ اوقات و متعین مقداریں ہوتیں جیسی ان دونوں میں ہیں مثلاً زمین کی پیداوار پر پانچ وسق ہو چکنے پر، بکریوں کے چالیس ہو جانے پر گایوں کے تیس ہو جانے پر، اونٹوں کے پانچ ہو جانے پر، اسی طرح آپؐ کے بعد کسی امام سے بھی اس (شہد) کے بارے میں کوئی تعین ثابت نہیں البتہ اتنا ثابت ہے کہ جب شہد کا مالک اپنے شہد کی زکواۃ لائے تو امام اسے قبول کرلے، جس طرح حضرت عمرؓ نے ابو ذباب سے قبول کرلی تھی ابو ذباب وہ زکواۃ اپنی طرف سے اندازہ لگا کر لائے تھے، حضرت عمرؓ نے ان پر کوئی خاص مقدار متعین نہیں کی تھی۔

(۱۵۳۵) حضرت عمرؓ کو اہل شام نے رضا کارانہ گھوڑوں اور غلاموں کی زکواۃ پیش کی

اوران کی طرف سے حضرت ابو عبیدہؓ نے بھی اس پیش کش کو قبول کرنے کی سفارش کی، لیکن انہوں نے پہلی بار اسے قبول کرنے سے انکار ہی کیا، تا آنکہ انہوں نے دوبارہ اصرار کیا تب انہوں نے اسے یہ معلوم کرنے کے بعد قبول کیا کہ یہ لوگ رضا کارانہ بطور عطیہ یہ رقم پیش کر کر رہے ہیں نہ کہ فریضہ سمجھ کر۔

لیکن جب ابو ذباب شہد کی زکواۃ لے کر آئے تو انہوں نے بلاتامل اسے قبول کر لیا، اس طرح شہد کی زکواۃ کو جو مقام حاصل ہوا وہ گھوڑوں اور غلاموں کی زکواۃ سے بلند اور مویشیوں اور زمینوں کی زکواۃ سے نیچے ہوا۔

اس طرح شہد کی زکواۃ کا قانون یہ بنا کہ اسے ادا نہ کرنے پر اس کا مالک دین میں کوتاہی ولاپرواہی کا مرتکب ہوگا۔ لیکن یہ کوئی ایسا قانون نہیں کہ طوعاً و کرہاً (پسند ہو یا ناپسند) بہر حال اس پر گرفت کی جائے۔

باب

گھٹیا پھلوں سے زکواۃ، اور مقروض سے زکوۃ لینے کا بیان نیز عشری اور غیر عشری زمینوں کے بارے میں فیصلہ

زکواۃ میں ناکارہ و ناقص مال دینے کی ممانعت

(۱۵۳۶) ابن شہاب کہتے ہیں کہ ہمیں اطلاع ملی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے دو گھٹیا قسم کے کھجور (جعرور اور لون ابن حُبیق[1] جن میں سے ایک کی تو گٹھلی پر چھلکا چڑھا ہوتا ہے اور دوسرا ردی چھوارہ ہوتا ہے) زکواۃ میں قبول نہ فرمائے اور انہیں واپس کر دیا۔

(۱۵۳۷) زہری ابو امامہ بن سہل رضؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے کھجور کی دو قسمیں زکواۃ میں لینے سے منع فرمایا: جعرور اور لون حُبیق (تفصیل نمبر ۱۵۳۶ میں دیکھیئے)

اس کی وجہ یہ تھی کہ بیشتر لوگ یہی کوشش کرتے تھے کہ زکواۃ میں ناقص اور گھٹیا مال دے کر چھٹکارا حاصل کر لیں۔ اسی پر یہ آیت نازل ہوئی:

---

[1] ۔ جعرور ایک قسم کی ردی کھجور جو چھوٹے اور ناقص رطب پر مشتمل ہے اور لون ابن حبیق، چھوٹی قدرے لمبی مٹیلے رنگ کی کھجور ہے جو ابن حبیق نامی شخص کی طرف منسوب ہے۔

وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ ؕ (البقرۃ: ۲۶۷)

اور تم اس میں سے خراب چیز کو خرچ کرنے کا ارادہ نہ کرو۔

(۱۵۳۸) مجاہد نے آیت کریمہ "وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ" کی تفسیر میں کہا: "لوگ ردّی کھجور اور اپنا ناکارہ مال (زکوٰۃ میں) نکالنا چاہتے تھے۔ لہٰذا یہ آیت نازل ہوئی۔"["ل"]

ناقص اشیاء مال میں شمار ہوں گی لیکن زکوٰۃ میں قبول نہیں کی جائیں گی

(۱۵۳۹) ابن شہاب کہتے ہیں: "زکوٰۃ میں کھجور کی اقسام میں سے (ناقص مثلاً) جُعرور، مُصران الفارۃ اور عذق ابن حُبیق نہیں لی جائیں گی۔ بایں ہمہ یہ اقسام مالکان کھجور کی ان کھجوروں میں شامل کی جائیں گی جن پر زکوٰۃ لی جائے گی۔

زکوٰۃ میں درمیانہ قسم کا مال لیا جائے گا۔

(۱۵۴۰) ابن بُکیر نے مذکورہ بالا روایت میں امام مالکؒ سے یہ اضافہ بھی درج کیا ہے: "اس کی مثال ان بکری کے بچوں کی سی ہوگی جنہیں مالک کی بکریوں میں شمار تو کیا جائے گا لیکن ان کو زکوٰۃ میں قبول نہیں کیا جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہا کہ دوسری طرف زکوٰۃ میں بہت اعلیٰ قسم کی کھجور "بُردی" وغیرہ بھی نہیں لی جائے گی بلکہ زکوٰۃ درمیانہ قسم کے مال میں سے لی جائے گی۔"

ابو عبیدؒ:۔ یہ ہیں وہ روایات جن سے زکوٰۃ میں گھٹیا قسم کے پھلوں کو لینا مکروہ بتایا گیا ہے۔

اب مقروض پر زکوٰۃ کا مسئلہ بیان کیا جاتا ہے:۔

زمین کے مالک پر قرض اور پیداوار برابر ہوتے پر زکوٰۃ کا مسئلہ

(۱۵۴۱) یونس کہتے ہیں کہ ابن شہاب سے ایک ایسے شخص کے بارے میں دریافت کیا گیا جس نے اپنے باغ یا کھیتی کے سلسلہ میں قرض لیا اور اس کا قرض اس کی پیداوار کے برابر ہوگیا

[illegible]

آیا یہ شخص اپنے اس باغ یا کھیتوں کی پیداوار پر زکواۃ دے گا؟ تو انھوں نے جواب دیا: "سنت سے ہمیں یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایسے مقروض کے پھلوں کو زکواۃ کے بغیر نہ چھوڑا جائے۔ اس سے مقروض ہونے کے باوجود زکواۃ لی جائے۔ البتہ وہ مقروض جس کے پاس سونا یا چاندی ہو تو اس سے ان چیزوں پر اس وقت تک زکواۃ نہیں لی جائے گی تاوقتیکہ وہ اپنا قرض نہ ادا کرلے"۔

(۱۵۴۲) اور یہ مضمون ابن سیرین کی روایت سے ہم آہنگ ہے جس میں وہ کہتے ہیں: لوگ نقد رقم (سونے چاندی) کو تو قرض میں منہا کر لیتے تھے لیکن پھلوں (کھیت اور باغات کی پیداوار) کو قرض میں منہا نہ کرتے تھے۔"

ابو عبیدؒ:۔ لیکن ابن عباسؓ اور ابن عمرؓ کی روایت اس سے مختلف ہے:

(۱۵۴۳) جابر بن زید کہتے ہیں کہ ایسے شخص کے بارے میں جو قرض لے کر اپنے اہل و عیال یا اپنی زمین پر خرچ کردے، حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ وہ اپنی زمین پر خرچ کردہ رقم ادا کرے گا اور حضرت ابن عمرؓ کا قول ہے کہ وہ اپنی یا اپنے اہل و عیال پر خرچ کی ہوئی رقم ادا کرے گا۔

(۱۵۴۴) **ابو عبیدؒ:**۔ مکحول سے بھی یہی مروی ہے کہ انھوں نے سونا، چاندی اور کھیتی پر قرض قابل منہائی بتایا ہے۔

(۱۵۴۵) **ابو عبیدؒ:**۔ مجھ سے مذکورہ بالا روایت ولید بن مسلم نے سعید ابن عبدالعزیز کے واسطہ سے مکحول سے کی ہے۔ مکحول کہتے ہیں:۔ ایسے شخص سے زکواۃ نہیں لی جائے گی تاآنکہ وہ اپنا قرض نہ ادا کرے۔ پھر جو کچھ بچ رہے اس پر زکواۃ دے بشرطیکہ وہ بقدر نصاب رہ جائے۔

(۱۵۴۶) **ابو عبیدؒ:**۔ یہی بات ابن جریج نے عطاء اور طاوس سے بھی روایت کی ہے۔

(۱۵۴۷) لیکن آج کل لوگ اہل حجاز اور بیشتر اہلِ عراق کے جس قول پر عمل پیرا ہیں اس کے بموجب خاص طور پر زمین کی پیداوار میں اس کے مقروض مالک کا قرض

منہا نہیں کیا جائے گا بلکہ اس سے زمین پہ زکواۃ لی جائے گی خواہ اس کا قرض پھلوں اور کھیتوں کی مجموعی پیداوار کے برابر ہی کیوں نہ ہو۔ اوراوزاعی کا بھی یہی قول ہے۔

(۱۵۴۸) البتہ اہلِ عراق کی ایک مختصر سی جماعت، ابن عمرؓ، عطاءؒ، طاوس اور مکحول کے قول کی تائید کرتی ہے۔

اور یہ سب کے سب اس بات پر متفق ہیں کہ اگر اس پر سونے اور چاندی کا قرض ہو اور اس (مقروض) کے پاس قرض کے برابر ہی یہ دونوں جنسیں ہوں تو اس پر زکواۃ واجب نہ ہوگی۔ اس طرح سب کا اتفاق اس امر پر ہوگیا کہ اگر مقروض کے پاس (قرض کے برابر) سونا چاندی ہو تو اس پر زکواۃ عائد نہ ہوگی لیکن اگر مقروض کے پاس زمین کی پیداوار ہو تو اس پر زکواۃ واجب ہوگی۔ اس میں صرف وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جو مذکورہ بالا آثار کا اتباع کرتے ہیں۔

مویشیوں کے مالک پر قرض کا مسئلہ

اگر مقروض کے پاس مویشی ہوں تو ان میں منہائی قرض کا مسئلہ مختلف فیہ ہے:

(۱۵۴۹) امام مالک، اہلِ حجاز اور اوزاعی کا کہنا ہے کہ مویشیوں کا قیاس زمین کی پیداوار پر ہوگا اور ان پر زکواۃ لی جائے گی خواہ زکواۃ دینے والا مقروض ہی کیوں نہ ہو۔

(۱۵۵۰) اہلِ عراق کا کہنا ہے کہ مویشی، سیم و زر کی طرح ہیں۔ اور مقروض سے ان پر زکواۃ نہیں لی جائے گی۔

ابوعبیدؒ:۔ اس بارے میں مجموعی طور پر ہمارا خیال ہے کہ دونوں ہی طریقے یعنی زکواۃ واجب قرار دینا اور زکواۃ ساقط قرار دینا قابلِ عمل ہوں گے۔ اگرچہ بظاہر یہ دونوں اقوال مختلف ہیں تاہم اس کی تاویل ہم یوں کریں گے۔

(۱۵۵۱) اگر یہ معلوم ہو جائے کہ واقعی مالک زمین پر قرض ہے تو ایسی صورت میں اس کی پیداوار پر اس سے کوئی زکواۃ نہیں لی جائے گی اور اس کے قرضہ کی بناء پر وہ اس سے معاف کر دی جائے گی۔ جیسے کہ ابن عمرؓ، طاوس، عطاءؒ اور

مکحول کی رائے ہے۔ اور ان کے قول کے ساتھ ہی یہ بات اتباعِ سنت کے مطابق بھی ہے۔ اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنت یہ مقرر فرمائی ہے کہ زکواۃ امیروں سے لے کر فقیروں میں لوٹا دی جائے اور یہ مقروض شخص جس پر اس کے مال کے برابر قرضہ ہے اور کچھ مال اس کے پاس ہے ہی نہیں خود زکواۃ لینے کا مستحق ہو جاتا ہے تو اس سے زکواۃ کیونکر وصول کی جائے گی؟ اور یہ کیسے ممکن ہو گا کہ بیک وقت یہ امیر بھی رہے اور فقیر بھی؟ بایں ہمہ یہ زکواۃ کے مصارف میں سے ایک مصرف والوں یعنی غارمین (مقروض اور تاوان برداشت کرنے والوں) میں سے ہے۔ بلکہ یہ تو دو حیثیتوں سے زکواۃ کا مستحق ہے۔

(۱۵۵۲) اور ہمارا خیال ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ کا یہ فرمانا: "ہم مکرّر انہیں زکواۃ دیں گے خواہ ان میں کسی کے پاس سو اونٹ ہی کیوں نہ ہوں"۔ اس امر کی دلیل ہے کہ اس سے ان کی مراد وہی لوگ تھے جن پر قرض تھا۔

ابو عبیدؒ: مجھے مذکورہ بالا روایت ابو معاویہ اور یزید سے حجاج، عمرو ابن مُرّۃ اور مُرّۃ کی وساطت سے حضرت عمرؓ سے پہنچی ہے۔

قرض کا ثبوت ضروری ہے محض مقروض ہونے کا دعویٰ قبول نہ ہوگا

(۱۵۵۳) ابو عبیدؒ: ظاہر ہے کہ مقروض کے بارے میں یہ فیصلہ اس وقت کیا جائے گا جبکہ صحیح طور پر اس کا قرضدار ہونا ثابت ہو جائے۔ لیکن اگر اس کے پاس محض اپنے زبانی بیان کے علاوہ کوئی اور پختہ شہادت نہ ہو تو اس کا دعویٰ قبول نہیں کیا جائے گا اور اس سے زکواۃ لی جائے گی خواہ اس کے پاس زمین کی پیداوار ہو خواہ مویشی۔ جیسے کہ ابن سیرین، ابن شہاب، اوزاعی اور مالکؒ کا نیز بعض اہلِ عراق کا قول ہے۔

(۱۵۵۴) ان کے اس قول کے ساتھ ہی اگر آپ خود بھی بنظرِ غائر اس مسئلہ کو ملاحظہ کریں تو آپ بھی ان کی تائید کریں گے۔ اس لئے کہ کھیتوں اور مویشیوں

پر زکوٰۃ ایک کھلا اور ظاہری فریضہ ہے جس کی ادائی ان کے مالکوں پر لازمی ہے اور وہ قرض جس کے زیر بار ہونے کا یہ دعویٰ کر رہا ہے پوشیدہ اور باطنی ہے کون جانے ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے دعویٰ میں جھوٹا ہو۔ لہٰذا اس کی یہ بات قبول نہیں کی جائے گی۔ اس شخص کا موقف اس شخص کا سا ہوگا جس پر کچھ لوگوں کے حقوق واجب الادا ہوں اور وہ ان سے نکلنے کا دعویٰ کرے اور کہے کہ میں نے تو ان کے حقوق ادا کر دئے ہیں تو اس کا یہ دعویٰ صحیح نہیں مانا جائے گا۔

سیم و زر اور مویشیوں کے مالکوں کے دعاوی کا فرق

(۱۵۵۵) میرے خیال میں یہ صورت اہل عراق کے قول سے زیادہ پسندیدہ ہے جس میں انہوں نے مویشیوں کو سیم و زر سے مشابہ قرار دیتے ہوئے مقروض مالک کے دعوے کو ہی حرف آخر قرار دے دیا ہے۔ بھلا سیم و زر اور مویشی ایک جیسے کیونکر ہو سکتے ہیں جبکہ خود انہی لوگوں کے قول کے مطابق مویشیوں کا مالک اگر یہ دعویٰ کرے کہ اس نے اپنے مویشیوں کی زکوٰۃ فقیروں میں تقسیم کر دی ہے تو یہ دعویٰ اسے زکوٰۃ سے بے نیاز نہیں کرے گا نہ ہی اس کا دعویٰ منظور ہوگا بلکہ اس سے دوبارہ زکوٰۃ لی جائے گی اور خود انہی حضرات کا کہنا ہے کہ اگر ایسا ہی دعویٰ سیم و زر کا مالک کرے تو اس کا یہ دعویٰ مان لیا جائے گا؟

(۱۵۵۶) **ابو عبیدؒ:** - یہ دونوں متضاد فیصلے ہیں۔

جہاں تک سیم و زر کے مالک کے دعویٰ کا تعلق ہے سب بلا اختلاف متفق ہیں کہ اس سے متعلق اس کے تمام دعاوی حرفِ آخر ہوں گے۔ یہ اس لئے کہ اس کا حکم حاکم کے ہاتھ میں نہیں بلکہ اس کا تعلق مسلمانوں کی امانتوں سے ہے۔ لیکن کھیتی اور مویشی پر زکوٰۃ کا فیصلہ حکام کے ہاتھ میں ہے اور ان کی زکوٰۃ لوگوں سے وصول کی جائے گی۔ خواہ وہ خوشی خوشی دیں یا بادلِ ناخواستہ۔

تیار کھیتی یا باغ فروخت کرنے پر اس کی زکوٰۃ کون ادا کرے گا؟

(۱۵۵۷) **ابو عبیدؒ:** - ایسی صورت میں کہ کھجور کے پکنے اور تیار ہونے کے

بعد انہیں کاٹنے سے قبل ہی ان کے درخت فروخت کر دیئے جائیں یا کٹائی سے قبل کھیتی فروخت کر دی جائے۔ مالک بن انس کا فیصلہ ہے کہ ان کی زکواۃ فروخت کرنے والے پر عائد ہوگی۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر پھلوں کی پختگی سے پہلے انہیں فروخت کیا جائے تو زکواۃ خریدار پر عائد ہوگی۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر کھیتوں کا مالک فصل کی کٹائی سے پہلے یا کٹائی کے بعد مر جائے تو اس کی زکواۃ وارث پر عائد ہوگی۔ وہ کہتے ہیں: کہ مالکان جو پھل بھی کھائیں انہیں بھی حساب میں شامل کیا جائے گا۔

ان کا کہنا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی زمین کسی کو کرایہ پر دے اور وہ کرایہ دار اس میں غلہ کاشت کرے۔ اور وہ زمین عُشری ہو تو کرایہ پر لینے والا کاشتکار اس کا عُشر ادا کرے گا اور وہی اس مالک زمین کو اس کا کرایہ بھی ادا کرے گا اور مالک زمین کے ذمّہ کچھ بھی نہ ہوگا۔

(۱۵۵۸) ان تمام امور میں سفیان بن سعید سے بھی ان کی تائید مروی ہے الّا یہ کہ اگر فصل کی کٹائی کے بعد وارث کو زمین ملی ہے تو ایسی صورت میں وارث پر کوئی زکواۃ واجب نہ ہوگی۔

(۱۵۵۹) ابو عبیدؒ:۔ مجھے مالک کا قول زیادہ پسند ہے۔ اس لئے کہ کھیتی اور پھلوں کی پیداوار کی ملکیت پر سال گذرنے کی مہلت نہیں دی جاتی بلکہ جب وہ پکتی اور تیار ہوتی ہے۔ اسی وقت ان پر زکواۃ واجب ہو جاتی ہے۔ لیکن مویشی اور سیم و زر پر سال گذرنے کے بعد زکواۃ واجب ہوتی ہے۔ لہٰذا ان دونوں چیزوں کا حکم زمین کی پیداوار سے جُداگانہ ہے۔

عشری زمین کی شرائط

ابو عبیدؒ:۔ یہ تمام احکام عشری زمین سے متعلق ہیں جو خراج کی نہ ہو۔ اور عشری زمین ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ مندرجہ ذیل چار اقسام میں سے کسی ایک قسم کی ہو:۔

(۱۵۶۰) اولاً: ہر وہ زمین جس کے مالک اسلام قبول کر لیں۔ ایسے مالکوں کی اپنی زمینوں پر ملکیت برقرار رہے گی مثلاً مدینہ، طائف، یمن، بحرین کی زمینیں،

انہی میں مکہ کی زمین کا بھی شمار ہے۔ یہ اگرچہ جنگ کے بعد فتح ہوئی تھی۔ تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر احسان فرمایا۔ نہ ان کی جانوں سے تعرض کیا نہ اُن کے اموال کو غنیمت بنایا۔

(۱۵۶۱) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "مکہ کی غنیمت حلال نہیں ہے۔" (دیکھئے نمبر ۱۷۰ تا ۱۷۱)

ابو عبیدؒ :۔ جب اس بناء پر ان (مکہ والوں) کا مال بلا شرکتِ غیرے انہی کا رہا پھر اس کے بعد وہ مسلمان ہو گئے تو ان کی حیثیت یہ رہی کہ وہ اپنی ملکیت کے ساتھ اسلام لائے اور اسی لئے اُن کی زمینوں کا شمار عشری میں ہوا۔

مکہ کی خصوصی اور امتیازی حیثیت کی طرف اشارہ کرنے والی متعدد احادیث ہیں جنہیں ہم دوسری جگہ بیان کر آئے ہیں۔ (دیکھئے نمبر ۱۵۷ تا ۱۷۱)

(۱۵۶۲) عشری زمین کی دوسری قسم میں تمام وہ زمینیں شامل ہیں جو بزور و قوت فتح کی گئی ہوں۔ لیکن پھر کسی مصلحت کی بناء پر امام انہیں وقف کردہ فے بنانا مناسب نہ سمجھے بلکہ انہیں غنیمت قرار دے کر ان میں سے خُمس (⅕) لے لے اور بقیہ چار حصے (⅘) خصوصی طور پر فاتحین میں تقسیم کر دے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کی زمینوں کے ساتھ کیا۔

چنانچہ ایسی زمینیں جنہیں دی جائیں ان کی ملکیت ہو جاتی ہیں اور اُن کی پیداوار میں سے صرف عشر ہی لیا جائے گا۔ یہی صورت تمام سرحدی علاقوں کی ہو گی جبکہ انہیں خصوصی طور پر فاتحین میں تقسیم کر دیا جائے اور ان میں سے خمس (⅕) اللہ تبارک و تعالیٰ کے معین فرمودہ مدوں کے لئے علیحدہ کر دیا جائے۔

(۱۵۶۳) عشری زمین کی تیسری قسم وہ تمام قدیم زمانہ سے غیر آباد زمینیں ہیں جن کا نہ کوئی مالک ہو نہ آباد کار۔ اور جنہیں امام بطور جاگیر کسی کو دے دے خواہ وہ زمینیں جزیرۂ عرب میں ہوں یا غیر عربی علاقہ میں۔ جیسے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے بعد خلفاء نے یمن، یمامہ اور بصرہ وغیرہ کے علاقوں میں جاگیریں دے کر مثالیں قائم کیں۔

(۱۵۶۴) عشری زمین کی چوتھی قسم میں وہ تمام مردہ زمینیں شامل ہیں جنہیں مسلمان معلوم کر کے ان میں پانی فراہم کرے اور کاشت کرے۔

عشری زمین سے وصول شدہ زکوٰۃ مصارف زکوٰۃ کی مدوں میں خرچ ہوں گی۔

یہ ہیں وہ زمینیں جو سنّت سے عشری (۱/۱۰) یا نصف عشری (۱/۲۰) ثابت ہیں۔ اور ان سب کا ذکر احادیث میں ملتا ہے۔ ان میں جو بھی پیداوار ہو ان کی مقدار اگر پانچ وسق یا اس سے زائد ہو جائے تو اس پر اسی طرح زکوٰۃ واجب ہو گی جس طرح مویشیوں اور سیم و زر پر۔ اور یہ زکوٰۃ خصوصی طور پر دوسرے لوگوں کو چھوڑ کر صرف انہی آٹھ مدوں میں صرف کی جائے گی جن کو اللہ تعالیٰ نے سورۂ براءۃ میں زکوٰۃ کا اہل اور مستحق قرار دیا ہے۔

عشری زمین کے علاوہ دوسری زمینیں فَۓ کی یا صلحی ہوں گی

(۱۵۶۵) مذکورہ بالا زمینوں کے علاوہ دیگر زمینیں یا تو وہ ایسی ہوں گی جو فوجی طاقت کے ذریعہ فتح کی گئی ہوں اور انہیں فَۓ قرار دے دیا گیا ہو، جیسے سواد عراق و جبال، اہواز، فارس، کرمان، اصبہان، رَیّ، اور شام کی زمینیں جن میں وہاں کے شہر شامل نہیں۔ نیز مصر، مغرب کے علاقے یا پھر وہ صلحی زمینیں ہوں گی جیسے نجران، ایلہ، اذرح، دومۃ الجندل، فدک وغیرہ کی قسم کے علاقے جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے صلح کے معاہدے کئے یا پھر وہ علاقے جن سے آپؐ کے بعد ائمہ نے معاہدۂ صلح کئے مثلاً جزیرہ اور ارمینیہ کے بعض علاقے نیز خراسان کی بیشتر آبادیاں ان ہر دو قسم کی زمینیں، یعنی صلحی زمینیں اور فوجی طاقت کے ذریعہ مفتوحہ علاقے کی زمینیں جنہیں فَۓ قرار دے دیا گیا ہو، تمام لوگوں کی عمومی ملکیت رہیں گی جن سے انہیں وظائف اور ان کے بال بچوں کو روزینے دیئے جائیں گے۔ اور انہی کی آمدنی سے امام مفادِ عامہ کے امور انجام دے گا۔

صلحی اور فَۓ کی زمینیں تمام لوگوں کی عمومی (ریاست کی) ملکیت ہیں اور اُن کی آمدنی مفادِ عامہ کے امور میں خرچ کی جائے گی

باب

پیمانوں کا بیان

اس "صاع" کا تعین جس کے ذریعہ زمینوں کی زکوٰۃ، صدقۂ فطر، قسموں کا کفارہ، مناسک کا فدیہ، غسل جنابت (کے پانی کی مقدار) کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ نیز تمام ان پیمانوں کا ذکر جن کے اسماء احادیث میں آئے ہیں

مختلف پیمانوں کے نام

(۱۵۶۶) تمام روایات کے مطالعہ سے ہم نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وہ پیمانے جن کا تذکرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی احادیث اور صحابہ کرام رضؓ اور ان کے بعد تابعین کی روایات میں ملتا ہے آٹھ ہیں: صاع[۱]، مُدّ[۲]، فرق[۳]، قسط[۴]، مُدی[۵]، مختوم[۶]، قفیز[۷]، مکوک[۸]۔ تاہم ان میں سے اہم مُدّ اور صاع ہیں۔

(۱۵۶۷) سفینہ رضؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ایک صاع (پانی سے) غسل فرماتے تھے اور ایک مُد سے طہارت فرماتے تھے۔ اس حدیث کے ایک راوی اسمٰعیل کہتے ہیں: "یا راوی نے یوں کہا تھا: "ایک مُد آپؐ کو پاک کر دیتا تھا۔"[۱]

(۱۵۶۸) جابر بن عبداللہ رضؓ کہتے ہیں: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ایک صاع (پانی سے) غسل فرماتے تھے اور ایک مُد سے طہارت فرماتے تھے۔"[۲]

۱۔ اسے احمد، مسلم، ابن ماجہ اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ ۲۔ یہ روایت بیہقی میں ہے۔

(۱۵۶۹) حضرت عائشہ رضؓ سے روایت ہے: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مُد پانی سے وضو فرماتے تھے اور ایک صاع پانی سے غسل فرماتے تھے۔"؎۱

(۱۵۷۰) ایک اور سند سے یہی مضمون حضرت عائشہ رضؓ ہی سے مروی ہے۔

(۱۵۷۱) حضرت عائشہ رضؓ سے مروی ہے: "اللہ کی قسم میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنابت کا غسل ایک صاع پانی میں مشترکہ طور پر کرتے تھے۔"

(۱۵۷۲) حضرت عائشہ رضؓ کہتی ہیں: "میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک برتن سے غسل کرتے تھے اور وہ فَرَق ہوتا تھا۔

(۱۵۷۳) حضرت عائشہ رضؓ روایت کرتی ہیں: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بڑے لگن (ٹب) میں غسل فرماتے تھے اور وہ فرَق تھا۔ میں اور آپؐ ایک برتن سے غسل کرتے تھے۔"

(۱۵۷۴) ابو رَباح کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضؓ نے ہم سے یہ روایت بیان کی۔ اور ہمارے اور اُن کے درمیان حجاب تھا۔ "میں اور میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم ایک برتن سے غسل کرتے تھے۔" یہ کہتے ہوئے انہوں نے گھر کے ایک برتن کی طرف اشارہ کیا جو فرَق کے برابر تھا۔

فرَق کا تعیّن راوی کہتا ہے کہ فرُق ایک پیمانہ ہے جس میں چھ قسط ہوتے ہیں۔

(۱۵۷۵) ابنِ شہاب کہتے ہیں: "ہمیں یہ روایت پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غسل جنابت ایک لگن (پانی) میں فرماتے تھے جو ایک فرَق (کے برابر) ہوتا تھا۔" پھر وہ کہتے ہیں: "آج وہ تقریباً پانچ مُدّ کا ہے۔"

(۱۵۷۶) حفصہ بنت عبدالرحمٰن۔ زوجہ منذر بن الزبیر — کہتی ہیں کہ انہیں حضرت عائشہ رضؓ نے بتایا کہ وہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک برتن سے غسل کرتے تھے جو تین مدّ کی گنجائش رکھتا تھا۔" اس حدیث کے ایک راوی لیث اپنی

؎۱ - یہ روایت نسائی میں ہے۔

روایت میں یہ اضافہ کرتے ہیں: "یا اس کے قریب"۔

(۱۵۷۷) موسیٰ بن عبداللہ کہتے ہیں کہ میں مجاہد کے پاس تھا کہ ایک برتن لایا گیا جس میں آٹھ یا نو یا دس رطل کی گنجائش ہو گی۔ پھر انہوں نے کہا: "حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اس جیسے (برتن کے پانی) میں غسل فرماتے تھے۔"

(۱۵۷۸) موسیٰ جہنی کہتے ہیں کہ مجاہد کے پاس آٹھ رطل کی گنجائش کا برتن آیا تو انہوں نے کہا کہ حضرت عائشہ رضؓ نے ہمیں بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اس جیسے برتن سے غسل فرماتے تھے۔"

(۱۵۷۹) انس بن مالک رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم دو رطل پانی سے وضو کر لیتے تھے۔"

(۱۵۸۰) ابو عبید رحؒ: غسل کے بارے میں مذکورہ بالا احادیث میں جو مختلف الفاظ ہیں ان سے سننے والے کو یہ وہم ہوتا ہے کہ لفظی اختلافات ضرور معنوی اختلافات رکھتے ہوں گے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ ان سب مختلف الفاظ کا محور پانی کی دو مقررہ مقداروں کے گرد گھوم رہا ہے جو زیادہ سے زیادہ آٹھ رطل اور کم سے کم ایک صاع یعنی پانچ رطل اور ایک تہائی (۵⅓) رطل ہیں۔ اور اہلِ بینش کے لئے ان تمام احادیث کا خلاصہ انہی دو مقداروں میں سے کسی ایک پر پہنچتا ہے۔

صاع کا تعیّن

الغرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل کے پانی کی مقدار انہی دو معینہ مقداروں کے اندر رہتی تھی اور ان میں سے پانی کی جو مقدار بھی آپ صلعم کو مہیا ہوتی اسی میں آپ صلعم غسل فرما لیتے تھے بہر حال وہ پانی صاع سے کم نہ ہوتا تھا جو پانچ رطل اور تہائی رطل ہے اور ڈیڑھ صاع سے بڑھتا نہ تھا جو آٹھ رطل کے برابر ہے۔

فَرَق = ۳ صاع = ۱۶ رطل

(۱۵۸۱) آٹھ رطل کی وہ روایات ہیں جن میں فَرَق کا ذکر ہے اور اس میں رسول اللہ صلعم اور حضرت عائشہ رضؓ دونوں غسل کرتے ہیں۔ اس لئے کہ فَرَق میں تین صاع ہوتے ہیں اور

یہ برابر ہیں سولہ رطل کے۔ اس طرح گویا ان دونوں میں سے ہر ایک کا غسل آٹھ رطل پانی میں ہوا۔

(۱۵۸۲) اسی طرح وہ احادیث جن میں اقساط کا ذکر ہے وہ بھی بالکل فَرَق کے برابر ہیں۔ تفصیل یہ ہے کہ ایک قسط آدھے صاع کا ہوتا ہے اور یہ شرح خود اسی روایت میں مذکور ہے جہاں "فَرَق" کے بعد ہی یہ مذکور ہے "وہ چھ قسط کا ہوتا ہے۔ اس طرح ان کا مجموعہ بھی آٹھ رطل ہی ہو گیا۔

قسط = ½ صاع
فَرَق = ۶ قسط

(۱۵۸۳) رہی وہ حدیث جس میں آپؐ کا تنہا پانچ مدوں سے غسل مذکور ہے تو وہ ہماری ان بیان کردہ احادیث کی طرح ہے جن میں ایک صاع سے غسل کرنے کا آیا ہے اور ایک مد سے وضو کرنے کا۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ آپؐ غسل سے قبل ایک مُد پانی سے وضو فرماتے اور پھر ایک صاع سے غسل فرماتے جو چار مُد کا ہوتا ہے۔ اس طرح خصوصی طور پر آپ کے غسل میں پانچ مُد (پانی) صرف ہوتا۔

صاع = ۴ مُد

(۱۵۸۴) جہاں تک ان روایات کا تعلق ہے جن میں آپؐ کے اور حضرت عائشہؓ (دونوں) کے غسل کے ضمن تین مدوں کا ذکر آیا ہے تو اس کی کوئی توجیہ میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اِلّا یہ کہ وہ مُد یہی بڑا مُد ہو جس سے آج کل مدینہ میں کھجوریں ناپی جاتی ہیں۔ اس طرح مُدوں کا لفظ حدیث کے بیان کرنے والے نے بطورِ تفسیر بیان کیا ہو اور اس سے مُراد یہی (ہمارے موجودہ زمانہ کا مروجہ بڑا) پیمانہ ہو۔

(۱۵۸۵) اور وہ حدیث جس میں یہ ہے کہ آپؐ اور حضرت عائشہؓ (دونوں) مشترکہ طور پر ایک صاع سے غسل کرتے تھے، تو ہمارے نزدیک اس کی توجیہ یہ ہوگی کہ (دونوں میں سے ہر ایک) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علیحدہ ایک صاع سے اور حضرت عائشہ رضؓ علیحدہ ایک صاع سے غسل کرتے تھے۔

مذکورہ بالا احادیث میں غسل کے سلسلہ میں صاع، فَرَق، قسط اور مُد کا ذکر آیا ہے۔

اب ہم وہ روایات لیتے ہیں جن میں زمینوں کی زکوٰۃ کے سلسلہ میں "صاع" کا لفظ آیا ہے :-

وَسق = ٦٠ صاع

(۱۵۸۶) ابو قلابہ کہتے ہیں : "وَسق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے۔"

(۱۵۸۷) یونس، حسن سے، اور مغیرہ ابراہیم سے (ہر دو) روایت کرتے ہیں : "وَسق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے۔"

(۱۵۸۸) اشعث، حسن اور ابن سیرین (دونوں) سے روایت کرتے ہیں : "وَسق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے۔"

(۱۵۸۹) ابو سعید خُدری ـــــ مرفوعاً ـــــ روایت کرتے ہیں : "پانچ وسق سے کم مقدار پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی، اور وسق ساٹھ مختوم کا ہوتا ہے۔"

صاع = مختوم

ابو عبیدؒ :- یہاں مختوم سے مراد بعینہ صاع ہے، اسے "مختوم" اس لئے کہا گیا کہ حکام نے اس کے بالائی حصّہ پر مہر ثبت کر دی تھی تاکہ کوئی نہ اس میں اضافہ کر سکے نہ کمی۔

صاع کے تعیّن میں حجازیوں اور عراقیوں کا اختلاف

صاع کی مقدار کے تعین میں اہلِ حجاز و اہلِ عراق میں اختلاف رہا ہے :-

(عراقی تعیّن) صاع = ۸ رطل ، مُد = ۲ رطل

(۱۵۹۰) ابراہیم کہتے ہیں : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا "صاع" آٹھ رطل کا تھا اور "مُد" دو رطل کا۔

(۱۵۹۱) ابو عبیدؒ :- شریک بن عبداللہ کہا کرتے تھے : "صاع آٹھ رطل سے کچھ کم اور سات رطل سے کچھ زیادہ کا ہوتا ہے۔"

صاع، حجّاجی کے برابر یا کچھ زائد

(۱۵۹۲) عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کہتے ہیں : "صاع" ناپ میں "حجّاجی" سے زیادہ ہوتا ہے۔"

(۱۵۹۳) اور ان کے صاحبزادے محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ، قاضی کوفہ کہتے تھے: "صاع حجّاجی کے برابر یا اس سے کچھ زیادہ ہوتا ہے۔"

(۱۵۹۴) لیکن سفیان کہتے تھے: "وہ (صاع) حجّاجی قفیز کے برابر ہوتا ہے"۔ اور وہ اس میں کچھ کمی بیشی کا ذکر نہیں کرتے۔

(۱۵۹۵) ابو عبیدرحؒ:- حجّاجی، قفیز (پیمانہ) ہے، جسے حجّاج بن یوسف نے حضرت عمرؓ کے صاع کے ناپ پر بنایا تھا۔ اس کے بارے میں یہی مروی ہے:

(۱۵۹۶) موسیٰ بن طلحہ کہتے ہیں: "حجّاجی قفیز حضرت عمرؓ کے صاع کے برابر ہے۔"

(۱۵۹۷) شعبی کہتے ہیں: "حجّاجی قفیز حضرت عمرؓ کے صاع کے برابر ہے۔

حجّاجی = ۱/۴ ہاشمی یعنی ۸ رطل

(۱۵۹۸) ابو عبیدرحؒ:- میں نے متعدد بار محمد کو یہ کہتے سُنا ہے: "حجّاجی ہاشمی کا چوتھائی ہے جو آٹھ رطل پر مشتمل ہے۔"

(۱۵۹۹) ابو عبیدرحؒ:- ہمارے خیال میں اہلِ عراق کا یہ کہنا کہ صاع آٹھ رطل کا ہوتا ہے اس بناء پر ہے کہ انہوں نے یہ سُن لیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ایک صاع سے غسل کرتے تھے۔ اور دوسری حدیث میں یہ سن لیا کہ آپؐ آٹھ رطل (پانی) سے غسل فرماتے تھے۔ نیز ایک اور حدیث جس میں ہے کہ آپؐ دو رطل پانی سے وضو کرتے تھے۔ اس طرح وہ اس وہم میں مبتلا ہو گئے کہ صاع آٹھ رطل کا ہوتا ہے۔ لیکن بایں ہمہ ان کے قول میں ٹھہراؤ نہیں اور انہوں نے اسے اس سے کم بھی بتایا ہے۔

(حجازی تعیّن)
صاع = ۵ ۱/۳ رطل

(۱۶۰۰) البتّہ اس بارے میں جہاں تک میرا علم ہے اہلِ حجاز میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ صاع ان کے نزدیک پانچ رطل اور تہائی رطل ہے۔ اور ان کے عالم و جاہل سب ہی یہ جانتے ہیں اور اسی سے خرید و فروخت میں ان کے ہاں پیمائش ہوتی

ہے۔ اور اس کا علم انہیں ایک نسل سے دوسری نسل کو ملا ہے۔

(۱۶۰۱) یعقوبؒ ایک مدت تک اپنے ساتھیوں کے ہمنوا تھے لیکن بعد میں انہوں نے اہلِ مدینہ کے قول کے مطابق رجوع کر لیا۔

(۱۶۰۲) اور یہی یزید بن ہارون کا فتویٰ بھی تھا۔

(۱۶۰۳) ابو عبیدؒ:۔ اور یہی میرے نزدیک معمول یہ ہے۔ اس لئے کہ اہلِ حجاز کے متفقہ فیصلہ کے بعد جب میں نے حضرت عمرؓ کی روایت میں غور کیا تو اسے بھی اہلِ حجاز کے قول کے مطابق ہی پایا۔

(۱۶۰۴) اسلم راوی ہیں کہ حضرت عمرؓ نے سونے کے مالکوں پر چار دینار جزیہ مقرر کیا۔ اور مسلمانوں کے روزینے میں دو مُدی گیہوں اور تین قسط زیتون کا تیل فی کس ماہانہ مقرر کیا۔۔۔ اور چاندی کے مالکوں پر چالیس درہم۔ اور پندرہ صاع فی کس اور مجھے یہ یاد نہیں رہا کہ چربی (روغن یا چکنائی) میں انہوں نے کیا متعین کیا تھا۔ (دیکھئے نمبر ۱۰۱)

ابو عبیدؒ:۔ میں نے حضرت عمرؓ کی اس حدیث میں غور کیا تو میں نے دیکھا کہ

حضرت عمرؓ کا تعین
دینار = ۱۰ درہم

اُنہوں نے چالیس درہم، چار دینار کے برابر قرار دیئے ہیں۔ اس لئے کہ دینار کا بنیادی اصول یہ ہے کہ ایک دینار دس درہم کے برابر رکھا جائے۔ اسی طرح اُنہوں نے غلہ دو مُدی کو پندرہ صاع کے برابر رکھا۔ بعد ازاں میں نے مختلف مُدوں اور

۲ مُدی = ۱۵ صاع = ۸۰ رِطل

صاعوں کا تقابلی تجزیہ کیا پھر ان کے (اندر سمانے والی اشیاء کے) اوزان معلوم کئے تو اہلِ مدینہ کے قول کے مطابق میں نے دیکھا کہ دو مُدی میں کچھ اُوپر اسّی رِطل کا وزن سماتا ہے۔ اور میں نے پندرہ صاع کا وزن اسّی رِطل پایا۔ وزن کا یہ اضافہ بہت ہی خفیف اور معمولی سا ہے، اور یہ تفاوت یعنی اسّی سے کچھ اُوپر کا اضافہ، میرے خیال میں اس فرق کی وجہ یہ ہے جو دو غلوں کے ناپ اور وزن (کثافتِ اضافی)

لہ۔ یہ امام ابو حنیفہؒ کے مشہور شاگرد ابو یوسف ہیں۔

(اہلِ عراق)
۱۵ صاع = ۱۲۰ رطل

میں ان کے ہلکے یا بھاری ہونے سے ہوتا ہے لیکن اہلِ عراق کے قول کے مطابق میں نے پندرہ صاع کا وزن ایک سو بیس رطل پایا۔ جو بہت بڑا فرق ہے۔ بنا بریں میں نے جان لیا کہ صاع کے بارے میں اہلِ حجاز کا قول صحیح ہے یعنی یہ کہ وہ پانچ رطل اور تہائی رطل کا ہوتا ہے۔

اہلِ حجاز کا قول صحیح ہے

پھر اس نتیجہ کی تصدیق و تائید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی اس حدیث سے ہوگئی۔[۱]

پیمانہ مدینہ کا اور باٹ مکّہ کا

(۱۶۰۵) حضرت ابنِ عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: "پیمانہ مدینہ والوں کا مانا جائے گا اور باٹ مکہ والوں کا۔"

(۱۶۰۶) **ابو عبیدؒ**:۔ بعض نے یہ روایت اس طرح بیان کی ہے: "باٹ مدینہ والوں کا مانا جائے گا اور پیمانہ مکّہ والوں کا۔"

ابو عبیدؒ:۔ اس طرح ہمارے اس موقف کو تین تائیدیں حاصل ہوگئیں۔ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم، روایت عمرؓ کا تجزیہ اور اہلِ حجاز کی متفقہ رائے، اب اس کے بعد دوسرے خیال کو کیا مقام حاصل ہوگا؟

(۱۶۰۷) **ابو عبیدؒ**:۔ یہ ہے صاع کی مقدار کا تعیّن۔ اس لحاظ سے جہاں تک میرا علم ہے بلا کسی اختلاف کے یہ مقدار فرَق کی ایک تہائی ہوئی۔ کیونکہ ایک فرَق تین صاع کا ہوتا ہے۔

بعض احادیث سے فرَق اور صاع کا تعیّن

اس امر کی مزید تشریح احادیث سے ہوتی ہے

(۱۶۰۸) کعب بن عجرۃ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم میرے

---

[۱]۔ تمام معتمد علیہ ذرائع متفق ہیں کہ مکہ میں سونے کا دینار بیاسی اور ۳/۱۰ دانہ جو کے مساوی وزن کا تھا اور درہم ۷/۱۰ مثقال کا۔ اس طرح رطل کا وزن مذکورہ درہم سے ۱۲۸ درہم ہوا۔ (التلخیص الحبیر: ۱۸۳)

پاس تشریف لائے - اس وقت میں اپنی ہانڈی کے نیچے آگ سلگا رہا تھا اور میرے چہرے ـــــ یا ابروؤں پر جوئیں ٹپک رہی تھیں، تو آپؐ نے دریافت فرمایا: "کیا تمہارے سر کی جوئیں تمہیں تکلیف دے رہی ہیں؟" میں نے کہا: "جی ہاں" تو آپؐ نے فرمایا: "تم اپنا سر مونڈ ڈالو اور تین دن کے روزے رکھ لو یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلا دو یا ایک بکری قربان کر دو۔ اس حدیث کی سند کے ایک راوی ایوب کہتے ہیں کہ میں نہیں جانتا کہ ان تینوں کی ترتیب میں پہلے حضورؐ نے کسے رکھا تھا۔

(۱۶۰۹) **ابو عبیدؒ**:- یہی حدیث ایوب ہی کی سند سے سفیان ابن عُیینہ اس طرح بیان کرتے تھے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: "چھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ: غلہ کا ایک فَرَق۔"

(۱۶۱۰) ایک اور سند سے کعب بن عُجرۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے یہ حدیث اس طرح بیان کرتے ہیں: "حضورؐ نے مجھے حکم دیا کہ میں چھ مسکینوں کو غلہ کا ایک فَرَق کھلاؤں"۔

ابو عبیدؒ:- اب یہ بات کھل کر واضح ہو جاتی ہے کہ ایک فَرَق تین صاع کا ہوتا ہے اس لئے کہ ہر مسکین کو نصف صاع ملے گا۔

یہی چیز ایک دوسری حدیث میں بھی واضح ہے۔

(۱۶۱۱) شعبی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے کعب بن عُجرۃ سے دریافت فرمایا: "کیا تمہارے ساتھ کوئی قربانی کا جانور ہے؟" انہوں نے کہا: "نہیں" تو آپؐ نے فرمایا: "اگر تم چاہو تو تین دن کے روزے رکھ لو اور اگر چاہو تو تین صاع کھجور چھ مسکینوں کے درمیان صدقہ کر دو۔ ہر مسکین کو نصف صاع (کے حساب سے) اور اپنا سر مونڈ لو۔

(۱۶۱۲) اس طرح مزید وضاحت ہو گئی کہ فَرَق تین صاع کا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ مسلم بن خالد کی حدیث (نمبر ۱۶۱۰) اور سفیان کی حدیث (نمبر ۱۶۰۹) میں فَرَق مذکور ہے اور یہاں تین صاع کھلانے کا حکم ہے۔

اس کی مزید توضیح اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو مجاہد بیان کرتے ہیں:-

(۱۶۱۳) یحییٰ بن عتیق کہتے ہیں کہ میں نے مجاہد سے قسم کے کفارہ کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے کہا: "ایک فَرَق دس (مسکینوں) کے درمیان (تقسیم کیا جائے گا)"۔ وہ کہتے ہیں کہ پھر میں نے یہ بات حسن بن مسلم کو بتائی تو انہوں نے کہا: "دو مد ترکاری اور آگ کے لئے (زیادہ رکھے ہیں)۔"

(۱۶۱۴) ابو عبیدؒ:۔ (اس روایت کے ایک راوی) عبدالرحمٰن اس روایت کی تشریح یوں کرتے ہیں: "اس کا مطلب یہ ہے کہ مجاہد کے نزدیک قسم کے کفارہ کے سلسلہ میں ایک مُد دیا جائے گا۔ اور فَرَق تین صاع کا ہوتا ہے اور صاع چار مُد کا۔ اس طرح فَرَق بارہ مُد کے مساوی ہوا۔ یہ تمام مقدار دس مسکینوں میں تقسیم کی جائے گی تو اس میں سے دس مُد تو ان مساکین کے کھانے کے لئے ہوں گے یعنی فی کس ایک مُد۔ اور زیادہ بچنے والے دو مُد ان کے درمیان اس لئے تقسیم کر دیئے جائیں گے کہ اس کے ذریعہ اس ایندھن اور ترکاری کا بندوبست کر لیں جو انہیں درکار ہے۔"

ابو عبیدؒ:۔ اور یہی بات حسن بن مسلم نے بھی کہی تھی۔

(۱۶۱۵) ابو عبیدؒ:۔ یہ صاع جس کی اُوپر ہم نے شرح بیان کی ہے وہی صاع ہے جس پر تمام دینی امور میں مسلمانوں کے ناپ کا دارومدار ہے۔ وہ زمینوں کی زکوٰۃ کا معاملہ ہو یا صدقۂ فطر کا، قسم کا کفارہ ہو یا مناسک کے فدیہ کا۔

مُلجَم = ۲½ صاع

میں نے آج کل ہمارے ہاں کے مروّجہ پیمانہ مُلجَم کو ناپا ہے، وہ ڈھائی صاع کا نکلا اور یہ دس مُد کے برابر ہے بشرطیکہ پیمانہ کو (چیز ڈال کر) اوپر سے برابر کر لیا جائے جیسے کہ آج کل بازار میں پیمائش کا طریقہ ہے۔

اکوک = ۲½ صاع
۱۲۰ اکوک مساوی ہیں ۵ وسق کے

(۱۶۱۶) جہاں تک زمینوں کی پیداوار پر زکوٰۃ کا تعلق ہے تو جب گیہوں، جو یا کھجور یا کشمش اس مکّوک کے ایک سو بیس ناپ ہو جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہو جائے گی۔ اب اگر اس پیداوار والی زمین کی سیرابی، بارانی یا نہری ندی نالوں کے پانی سے ہو یا درخت خود اپنی جڑوں سے زمین کے اندر کا پانی پی لیتے

ہوں تو اس پیداوار پر دسواں حصہ (زکواۃ) دیا جائے گا۔ اور اگر رہٹ، چرس وغیرہ کے ذریعہ محنت کر کے سیراب کیا جائے تو اس پیداوار پر بیسواں حصہ زکواۃ دی جائے گی۔ یہ اس لئے کہ زکواۃ پانچ وسق کی مقدار پر واجب ہوتی ہے اور ایک وسق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے، لہٰذا پانچ وسق تین سو صاع کے برابر ہوئے۔ اور یہ مقدار برابر ہوئی ایک سو بیس مکوک کے۔ اس لئے کہ جیسا ہم پہلے بتا چکے ہیں ایک مکوک ڈھائی صاع کے برابر ہوتا ہے۔ اور ہمارے قفیز کے اعتبار سے یہ مقدار ٹھیک پندرہ قفیز ہوگی۔ یہ ہوا زمینوں کی پیداوار پر زکواۃ کا حساب۔

(زکواۃ یا) صدقۂ فطر

(۱۶۱۷) جہاں تک زکواۃ فطر (فطرہ یا صدقۂ فطر) کا تعلق ہے تو اس میں ادا کرنے والے کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ گیہوں کھجور، جو یا کشمش میں سے جو جنس چاہے دے دے۔ اب اگر وہ کھجور، جو یا کشمش دینا پسند کرتا ہے تو یہ مکوک ڈھائی جاتوں (شخصوں) کے عوض کافی ہوگا اس لئے کہ اس میں ڈھائی صاع ہوتے ہیں لیکن اگر وہ گیہوں دینا پسند کرے تو میرے نزدیک دونوں باتوں میں سے زیادہ پسندیدہ یہ ہے کہ وہ ایک صاع سے کم نہ دے اس لئے کہ اکثر روایات سے اسی کی تائید ہوتی ہے اور میرے نزدیک یہ کھجور اور جو سے افضل ہے۔ لیکن اگر وہ نصف صاع گیہوں دے تو بھی اسے کفایت کرے گا کیونکہ متعدد علمائے اس کا فتویٰ بھی دیا ہے۔ تاہم ایک صاع کھجور یا ایک صاع جو دینا میرے نزدیک نصف صاع گیہوں دینے سے بہتر ہے اگرچہ نصف صاع گیہوں سے بھی کام بن جاتا ہے۔ اس لئے کہ ہمارا پسندیدہ طریقہ اتباع سنت سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔

کفارہ، قسم

(۱۶۱۸) اب قسم کے کفارہ کو لیجئے تو اس کے لئے یہ ایک مکوک گیہوں دس مسکینوں میں تقسیم کر دینا کافی ہوگا۔ کیونکہ ہمارے سابقہ بیان کے مطابق یہ دس مُد ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ہمارے مذہب کے مطابق ہر مسکین کو ایک مُد مل جائے گا۔

(۱۶۱۹) لیکن جو قسم کے کفارہ میں فی مسکین نصف صاع کا قائل ہے تو وہ

دو مکوک دس مسکینوں میں تقسیم کرے گا۔

مناسک کا فدیہ

(۱۶۲۰) اب رہا مناسک کا فدیہ مثلاً سر مونڈ لینے یا سلا ہوا لباس پہننے یا اسی قسم کی دیگر مجبوریوں پر جو فدیہ درج ہیں محرم پر واجب ہوتا ہے تو اس کی مقدار میں اہلِ حجاز و اہلِ عراق میں اختلاف ہے۔ اہلِ حجاز ہر مسکین کو ایک مُد دینے کے اور اہلِ عراق ہر مسکین کو نصف صاع دینے کے قائل ہیں۔ اس کی تفصیل کسی دوسری جگہ پر تفصیل سے آئے گی۔ ان شاء اللہ۔

(۱۶۲۱) ابو عبیدؒ:۔ مذکورہ بالا بیان سے آپ کو صاع کے بارے میں مختلف صورتوں کی تفصیل بہم پہنچائی گئی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ صاع پانچ رطل اور

مُد = ۱⅓ رطل

تہائی (۵⅓) رطل کا ہوتا ہے۔ مُدّ اس کا چوتھائی حصہ ہوتا ہے اور وہ (مُد) ایک رطل اور تہائی رطل کا ہوا۔

رطل = ۱۲۸ درہم

اور یہ ہمارے اس رطل کے حساب سے جس کا وزن ایک سو اٹھائیس درہم ہوتا ہے۔ اور درہموں کا وزن بھی جانا ہوا ہے[۱]

درہم کی کہانی

(۱۶۲۲) ابو عبیدؒ:۔ میں نے لوگوں کے احوال سے باخبر اور اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے ——— ایک بزرگ سے سُنا وہ درہم کی کہانی اور اسلام میں ان کے ڈھالے جانے کا سبب بیان کرتے ہوئے کہہ رہے تھے: یہ دراہم جو روئے زمین پر ہمیشہ سے لوگوں کی نقدی کے کام آتے ہیں دو قسم پر مشتمل ہیں۔ ایک تو یہ (سُنے) سودِ وافیہ (بھرپور وزن کے بڑے درہم) اور دوسرے پرانے طبری دراہم، جب اسلام آیا تو یہ انہی شکلوں میں مروج تھے۔ پھر عہدِ اموی میں خلفاء نے نئے دراہم ڈھالنے کا ارادہ کیا تو نتائج پر غور کر لینے کے بعد انہوں نے کہا: یہ سکّے رہتی دُنیا تک رائج رہیں گے؛ کیونکہ فریضۂ زکوٰۃ کے سلسلہ میں آیا ہے: "ہر دو سو یا ہر پانچ اوقیہ پر پانچ درہم

---

[۱] یہ وہ درہم ہیں جن میں سے دس کا وزن سات مثقال ہوتا تھا۔

ایک اوقیہ = ۴۰ درہم

زکواۃ واجب ہوگی" اور ایک اوقیہ چالیس درہم کا ہوتا ہے۔ وہ اس بات سے ڈرے کہ تمام دراہم سود وافیہ (بھرپور وزن کے بڑے) دراہم کے برابر ڈھال دیں، لیکن بعد ازاں یہی صورت اتنی عام ہوگئی کہ اس کے سوا کوئی دوسری شکل لوگ پہچانتے بھی نہ تھے۔

وہ زکواۃ کے سلسلہ میں یہی جانتے تھے کہ جب تک ان سود وافیہ دراہم کی تعداد دوسو یا اس سے زائد نہ ہوجائے ان پر زکواۃ واجب نہیں ہوتی لیکن اس طرح زکواۃ کی مقدار میں کمی ہوتی تھی۔ اب وہ اس بات سے ڈرنے لگے کہ ان تمام دراہم کو طبریہ کے برابر بنا کر یہ قاعدہ بنالیں کہ جب ان دراہم کی تعداد دوسو ہوجائے تو ان پر زکواۃ واجب ہوجائے گی۔ کیونکہ اس طرح مال کے مالک پر زیادتی ہوتی تھی۔ تب انہوں نے یہ چاہا کہ ان دونوں صورتوں کے درمیان کوئی ایسی شکل پیدا کی جائے کہ اس میں زکواۃ بھی پوری ادا ہوجائے اور لوگوں کو نقصان بھی نہ ہو۔ ساتھ ہی یہ صورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی (مقررہ مقدار نصاب وسنت) زکواۃ کے مطابق بھی ہو۔

اس سے قبل لوگ دو حصوں میں زکواۃ ادا کرتے تھے بڑے دراہم سے علیحدہ اور چھوٹوں سے علیحدہ۔ اب جب انہوں نے نئے دراہم ڈھالنے کا عزم مصمم

بڑے درہم کا وزن آٹھ دانق اور چھوٹے کا چار دانق تھا

کرلیا تو انہوں نے بڑے درہم کو تول کر دیکھا تو اس کا وزن آٹھ دانق تھا۔ پھر اُنہوں نے چھوٹے درہم کو تول کر دیکھا کہ اس کا وزن چار دانق ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے بڑے کی زیادتی اور چھوٹے کی کمی کو برابر کرنے کے لئے (اوسط نکال کر) ہر ایک کا وزن چھ دانق کر دیا، پھر مثقال سے اس کا وزن کرلیا۔ کیونکہ مثقال ہمیشہ سے ایک ہی معین وزن کا رہا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایسے دس درہم لئے جن میں سے ایک کا وزن چھ دانق تھا۔ پھر ان (دراہم) کو مثقالوں سے تولا تو وہ پورے سات مثقال ہوئے۔ اس طرح

اِن دراہم ہیں تینوں صورتیں پیدا ہوگئیں۔ ایک تو یہ کہ وہ (دس دراہم) سات (مثقال) کے ہموزن ہوگئے۔ ثانیاً یہ کہ چھوٹے اور بڑے درہموں کے درمیان اعتدال قائم ہوگیا۔ تیسرے یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی زکواۃ سے متعلق سنت سے اسے پورا پورا انطابق حاصل ہوگیا نہ اس میں کوئی کمی رہی نہ بیشی۔

بعدازاں دراہم کے یہ اوزان رائج ہوگئے اور امّت نے متفقہ طور پر اسے قبول کرلیا۔ اور اس میں کسی کو اختلاف نہیں کہ پورے وزن کا درہم چھ دانق کا ہوتا ہے۔ اور اگر اس کے وزن میں کچھ کمی بیشی ہو تو حسب موقع کہا جائے گا کہ اس درہم کا وزن کم یا زیادہ ہے۔

درہم = ۶ دانق

اس طرح لوگ زکواۃ کی ادائی میں بحمداللہ اسی اصل پر باقی ہیں جو سنت و ہدایت نبوت پر مبنی ہے۔ اس سے سرِمُو بھی متجاوز نہیں ہوئے۔ اس میں کسی قسم کا شک و شبہ اور التباس نہیں ہے۔

یہی صورت خرید و فروخت اور دیت سے متعلقہ امور کے معاملات میں چاندی کے سکے رکھنے والوں کے ساتھ جاری رہے گی۔

یہ ہیں وہ تفصیلات جو ہمیں اس ضمن میں پہنچیں۔

ابوعبیدؒ:۔ اس سے قبل بھی درہم کا وزن چھ دانق ہی ہوتا تھا۔ جس کا ذکر بعض احادیث میں آیا ہے۔

(۱۶۲۳) اَصْبَغ بن نُباتہ حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے چار سو اسّی درہموں پر حضرت فاطمہ علیہا السلام کا نکاح مجھ سے کرایا تھا۔ ہر درہم کا وزن چھ (دانق) تھا۔

ابوعبیدؒ:۔ یہی وزن برابر چلا آرہا تھا تا آنکہ بعد میں جیسا کہ ہم نے بتایا وہ سات (مثقال)[۱] کا کردیا گیا۔

---

[۱] - یعنی ۱۰ درہم کا وزن سات مثقال ہوگیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فصل

مسلمانوں، ذمیوں اور اہلِ حرب کے اُن اموال سے وصول کئے جانے والے صدقہ (زکوٰۃ اور دیگر ٹیکسوں) کا بیان جو "عاشر"[ل] کے پاس سے گذارے جاتے ہیں

باب

عاشر اور ٹیکس، وصول کرنے والے کا بیان نیز وہ وعید اور سختی جو اس بارے میں مروی ہے

ناجائز طور سے ناحق ٹیکس وصول کرنے والے کے لئے وعید

(۱۶۲۴) عقبۃ بن عامر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا۔

ل۔ عاشر سے یہاں مراد غیر قانونی ٹیکس اور چنگی وصول کرنے والا ہے۔ ویسے یہ لفظ عشور (چنگی ٹیکس) اور عشر (یا) وصول کرنے والے کے بھی بولا جاتا ہے (جو مسلمانوں سے بارانی یا ندی نہر کے پانی سے سیراب ہونے والی اراضی کی پیداوار پر لیا جاتا ہے جبکہ وہ ۵ وسق ہو جائے) اس باب میں ابو عبید عاشر کی جو مذمت کر رہے ہیں اس کے لئے یہ پورا باب تفصیلی مطالعہ کا مستحق ہے بالخصوص اس باب کا آخری حصہ۔ تاہم یہ یاد رہے کہ اس باب میں جہاں بھی ٹیکس وغیرہ کی مذمت ہے وہ اس ظلم و تشدد کی بناء پر ہے جو ناجائز طور پر لیا اور دیا جاتا ہے۔ وہ ٹیکس جو اپنے صحیح مصارف پر خرچ نہیں کیا جاتا اسی ذیل میں آتا ہے۔

ٹیکس وصول کرنے والا جنت میں نہیں جائے گا۔"

(۱۶۲۵) رویفع بن ثابت کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو یہ فرماتے سُنا "ٹیکس وصول کرنے والا (یعنی عاشر) جہنّم میں جائے گا۔

(۱۶۲۶) عبداللہ بن عمرو کہتے ہیں "ٹیکس وصول کرنے والے سے کسی چیز کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا، وہ جیسا بھی ہو گا اُٹھا کر جہنم میں ڈال دیا جائیگا۔

(۱۶۲۷) خالد بن ثابت کہتے ہیں کہ کعب الاحبار نے مجھے عمرو بن العاص کے ساتھ مصر جاتے وقت یہ وصیّت یا ہدایت کی کہ ٹیکس (چنگی) کو ہاتھ نہ لگانا۔ اور مجھے اس کے لینے سے منع کیا تھا۔

(۱۶۲۸) عبدالرحمٰن القاری کہتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیز رح نے عدی بن ارطاۃ کو لکھا تھا: "لوگوں سے فدیہ کو ختم کر دو، اور لوگوں سے دستر خوان ختم کر دو اور لوگوں سے چنگی (ٹیکس) بند کر دو[1] یہ ٹیکس نہیں بلکہ ظلم ہے اور لوگوں کو نقصان پہنچانا ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَاءَهُمْ	لوگوں کو اُن کی چیزوں میں گھاٹا نہ دو
وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ -	اور زمین میں فساد کرتے ہوئے تباہی نہ مچاؤ۔
(ھود: ۸۴)	

لہٰذا جو تمہارے پاس صدقہ (زکوٰۃ) لائے تو اس سے وہ قبول کر لو اور جو صدقہ نہ لائے تو اللہ اس سے حساب کرے گا۔"

(۱۶۲۹) کُریز بن سلیمان کہتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیز نے عبداللہ بن عوف القاری کو لکھا تھا: رَفح کے اس مکان پر چڑھائی کر دو جسے "چنگی خانہ" (ٹیکس گھر) کہا جاتا ہے اور اسے ڈھا دو، پھر اس کا ملبہ لدوا کر سمندر میں بکھیر دو۔"

ابو عبید رح۔ ہمارے اندازہ کے مطابق رَفح مصر اور رَملہ کے درمیان ایک مقام ہے۔

---

[1] - یہ وہ زائد مطالبات تھے جو حکومت نے عوام کے ذمہ لازم کر دئے تھے جنہیں ظلم قرار دیتے ہوئے حضرت عمر بن عبدالعزیز رح نے انہیں موقوف کر دیا۔

(۱۶۳۰) مالک بن عتاہیہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:
"جو عشور (چنگی) وصول کرنے والے سے ملے وہ اس کی گردن اُڑا دے۔"

(۱۶۳۱) دوسری سند سے ایک قبیلہ جذام کا شخص راوی ہے کہ فلاں ابن عتاہیہ کو یہ کہتے سُنا گیا: جب تم کسی عاشر (عشور وصول کرنے والے) سے ملو تو اسے قتل کر ڈالو۔
راوی کہتا ہے کہ یہاں عاشر سے ان کی مُراد وہ شخص ہے جو ناجائز طور پر صدقہ وصول کرتا ہے۔

(۱۶۳۲) مُسلم بن شکرہ۔ یا مُسلم بن مُصَبّح — سے روایت ہے کہ اُنہوں نے ابن عمرؓ سے دریافت کیا: "کیا آپ کے علم میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے مسلمانوں سے عشر (ٹیکس) وصول کیا ہو؟" تو انہوں نے کہا: "نہیں، میرے علم میں نہیں ہے۔"

(۱۶۳۳) ابراہیم بن مہاجر کہتے ہیں کہ میں نے زیاد بن حُدَیر کو یہ کہتے سُنا کہ میں پہلا عاشر (ٹیکس وصول کرنے والا) ہوں جس نے اسلام میں عشر (ٹیکس) وصول کیا۔" میں نے دریافت کیا کہ تم لوگ کس سے عشر وصول کیا کرتے تھے؟ تو انہوں نے کہا: "ہم مسلمان یا معاہد سے عُشر نہیں وصول کرتے تھے بلکہ بنی تغلب کے نصاریٰ سے عشر وصول کرتے تھے۔"

(۱۶۳۴) عبدالرحمٰن بن مَعقِل کہتے ہیں کہ میں نے زیاد بن حُدَیر سے دریافت کیا: "تم کس سے عشر (ٹیکس) وصول کرتے تھے؟" اُنہوں نے جواب دیا: "ہم نہ مسلمان سے عُشر وصول کرتے تھے نہ معاہد" اس پر میں نے کہا: "پھر کس سے عشر وصول کرتے تھے؟" تو انہوں نے جواب دیا: دار الحرب کے تاجروں سے، جس طرح وہ ہم سے اپنے علاقہ میں داخلہ پر عشر وصول کیا کرتے تھے۔"

(۱۶۳۵) مسروق کہتے ہیں: "مجھے تمہارے اس عمل سے زیادہ کوئی خوفناک عمل ایسا نہیں معلوم جو مجھے جہنّم میں داخل کر دے۔ مجھے اس کا تو خدشہ نہیں کہ میں کسی مسلمان یا معاہدہ پر درہم یا دینار لینے میں ظلم کروں۔ البتّہ میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ یہ رسّی[ل] کا

ل ۔ اس رسّی کی تفصیل کے لئے دیکھئے نمبر ۱۶۴۵۔

سلسلہ کہاں سے آگیا جو نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے اور نہ ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی۔" لوگوں نے ان سے دریافت کیا: "آپ کو کس چیز نے اس کام میں حصّہ لینے پر مجبور کر دیا؟" تو انہوں نے کہا: "زیاد، شریح، اور شیطان نے میرا اس قدر پیچھا لیا کہ مجھے اس میں حصّہ لینا پڑا۔"

(۱۶۳۶) شعبی کہتے ہیں کہ زیاد نے مسروق کو سلسلہ کا عامل بنایا وہ گئے اور وہیں مر گئے" تو زیاد سے دریافت کیا گیا: "وہ اپنی ذمہ داری سے کیسے عہدہ برآ ہوا؟" تو انہوں نے کہا: "بالکل ایسے ہی جیسے تم دیکھتے ہو کہ کپڑا دھوبی کو دیا جاتا ہے اور وہ اسے خوب عمدہ دھو دیتا ہے؟"

(۱۶۳۷) ابو اسحٰق کہتے ہیں کہ میں نے ابو وائل کو یہ کہتے سُنا: "میں سلسلہ میں مسروق کے ساتھ تھا، میں نے کسی حاکم کو ان سے زیادہ پاکباز نہیں پایا، وہ دجلہ کے پانی کے سوا کچھ نہ لیتے تھے۔"

ابو عبید رح :۔ مذکورہ بالا احادیث کی توجیہ جن میں عاشر (ٹیکس یا چنگی وصول کرنے والے) کا ذکر اور ٹیکس یا چنگی وصول کرنے پر ناپسندیدگی یا سخت تنبیہ آئی ہے، یوں کی جائے گی کہ یہ وہ محصولات ہیں جن کا سراغ جاہلیت میں ملتا ہے۔ عرب و عجم کے تمام بادشاہ اس قسم کے ٹیکس وصول کرتے تھے۔ ان کا دستور تھا کہ وہ اپنے علاقہ میں تاجروں کے داخلہ پر ان کے اموال کا دسواں حصّہ (چنگی) لے لیا کرتے تھے۔

(۱۶۳۸) اس کی وضاحت ہمارے بیان کردہ ان مکاتیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوتی ہے جو آپؐ نے مختلف علاقوں مثلاً قبیلہ ثقیف یا بحرین، دومۃ الجندل وغیرہ کے حاکموں کے جواب میں تحریر فرمائے تھے جہاں کے باشندوں نے اسلام قبول کر لیا تھا، جن میں آپؐ کی یہ تصریح ہے: "ان لوگوں کے جانوروں کو یکجا اکٹھا نہیں کیا جائے گا اور نہ ان سے دسواں حصہ (چنگی یا ٹیکس) لیا جائے گا۔ اس طرح نیز دیگر بہت سی روایات سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ یہ جاہلیت کا دستور تھا جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نیز اسلام کے ذریعہ ختم کر کے اس کے بجائے فریضہ زکوٰۃ مقرر کیا جس کی

مقدار چالیسواں حصہ ہے یعنی ہر سو درہم پر پانچ درہم۔ اب جو اس فریضہ کے مطابق وصول کرتا ہے وہ "عاشر" (ٹیکس وصول کرنے والا) نہیں کہلائے گا کیونکہ وہ دسواں حصہ نہیں بلکہ چالیسواں حصہ وصول کر رہا ہے۔

(۱۶۳۹) اس کی تفسیر اس حدیث میں ہے جسے حرب بن عبید اللہ ثقفی اپنے نانا کے توسّط سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے بیان کرتے ہیں: "مسلمانوں پر عشور کی ادائی واجب نہیں۔ عشور تو یہود و نصاریٰ سے لئے جاتے ہیں۔"

(۱۶۴۰) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی وہ حدیث بھی اس کی مزید شرح کرتی ہے جس میں "عاشر" کا لفظ ہے اور جو ہم پہلے درج کر آئے ہیں۔ آپؐ کے الفاظ یہ ہیں: "(عاشر وہ ہے) جو ناجائز اور غلط طریقہ سے صدقہ (زکوٰۃ) لیتا ہے۔"

(۱۶۴۱) **ابو عبیدؒ**:۔ جب وہ معینہ مقدار سے زائد زکوٰۃ وصول کرے تو وہ ناجائز اور ناحق لے رہا ہے۔"

(۱۶۴۲) یہی مفہوم حضرت ابن عمرؓ کی اس روایت کا ہے جس میں سائل نے ان سے دریافت کیا تھا: "کیا تمہارے علم میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے مسلمانوں سے عُشر (۱/۱۰ حصہ) وصول کیا ہو؟" تو انہوں نے جواب دیا تھا: "نہیں، میرے علم میں ایسا کوئی واقعہ نہیں۔"

ابو عبیدؒ:۔ ہمارا خیال ہے کہ اس لاعلمی سے ان کی مراد یہی عُشر ہے زکوٰۃ نہیں، اور وہ زکوٰۃ کی وصولی کا انکار کیونکر کر سکتے تھے جبکہ حضرت عمرؓ اور دیگر خلفاء وظائف دیتے وقت ہی زکوٰۃ لے لیا کرتے تھے اور خود ابن عمرؓ کی رائے بھی یہی تھی کہ انہیں (خلفاء کو) وہ زکوٰۃ دے دی جائے۔

(۱۶۴۳) یہی بات زیاد بن حُدیر کی روایت سے مترشح ہے۔ وہ کہتے ہیں: "ہم کسی مسلم یا معاہد سے عشر نہیں وصول کرتے تھے۔" مطلب یہی ہے کہ ہم مسلمانوں سے ربع عشر (یعنی چالیسواں حصہ) وصول کرتے تھے اور ذمیوں سے نصف عشر (بیسواں حصہ)

یہ وعید سیم و زر کی زکوٰۃ وصول کرنے میں جبر کرنے والوں سے متعلق ہے

(۱۶۴۴) لہٰذا ایسی صورت میں جبکہ عاشر (ٹیکس وصول کرنے والا) مسلمانوں سے

جو کچھ زکواۃ وہ رضا کارانہ لے کر آئیں وصول کرے اور ان پر کسی قسم کا اکراہ و جبر نہ ہو تو ان احادیث کی رو سے وہ اس وعید میں داخل نہ ہو گا۔ لیکن اگر وہ زکواۃ لینے میں ان پر جبر و اکراہ کرتا ہو تو ہم مطمئن نہیں کہ وہ اس وعید کے مستحقین میں نہ ہو۔ خواہ وہ جبراً ان سے چالیسواں حصہ ہی وصول کرتا ہو۔ اس لئے کہ سیم و زر کی زکواۃ میں تو خصوصی طور پر یہی سنت ہے کہ لوگوں پر پورا اعتماد کیا جائے (اور ان پر کوئی دباؤ نہ ڈالا جائے، وہ اپنے اندازہ سے حساب کر کے جو لائیں اس پر شبہ نہ کیا جائے)۔

(۱۶۴۵) یہی پہلو مسروق کی اس حدیث میں نمایاں ہے جسے ہم درج کر آئے ہیں۔ جس میں وہ کہتے ہیں: "میں نہیں سمجھ سکا کہ یہ رسی کہاں سے آگئی ہے جو نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے نہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی؟ یہ رسی تھی جو دریا عبور کرنے سے روکنے کے لئے حائل کی جاتی تھی اور کشتیاں صدقہ (چنگی) ادا کئے بغیر اس سے آگے نہ جا سکتی تھیں۔ چنانچہ مسروق نے اس طریقہ کو بھی لوگوں سے زکواۃ کی جبری وصولی قرار دیتے ہوئے اسے ناپسند کیا۔

(۱۶۴۶) اسی پہلو کی وضاحت ہماری مذکورہ عمر بن عبد العزیز والی روایت کرتی ہے جس میں ہے: "جو صدقہ (زکواۃ) تمہارے پاس لے آئے اس سے تم وہ قبول کر لو۔ اور جو تمہارے پاس نہ لائے اللہ اس سے حساب کرنے والا ہے۔"

(۱۶۴۷) یہی مفہوم حضرت عثمانؓ کی روایت کا ہے جس میں ہے: "اور جس سے بھی ہم زکواۃ لیں گے اس کی شکل یہی ہو گی کہ وہ رضا کارانہ ہمارے پاس زکواۃ لے آئے۔"

(۱۶۴۸) حکام کا طریقہ یہ تھا کہ وہ وظائف دیتے وقت (لینے والوں سے) وصولی سے قبل زکواۃ کے متعلق دریافت کر لیتے تھے، لیکن جب وظائف (لوگوں کو) وصول ہو جاتے تو وہ ان کی امانتوں کی حیثیت اختیار کر لیتے۔

یہ ہوا سیم و زر کی زکواۃ کا مسنون طریقہ۔

لہ۔ یہ "صامت" کا ترجمہ ہے جس سے مراد بے جان مال ہے۔

وہ زکوٰۃ جس کی وصولی کے لئے جبر و اکراہ کی اجازت ہے

اب رہا وہ صدقہ (زکوٰۃ) جس کے وصول کرنے میں لوگوں پر جبر و اکراہ کیا جا سکتا ہے اور جسے روکنے پر ان (روکنے والوں) سے جہاد کیا جائے گا سو یہ مویشیوں اور زرعی پیداوار اور کھجوروں کی زکوٰۃ ہے۔

(۱۶۴۹) اب اگر عاشر ان مذکورہ بالا اقسام پر زکوٰۃ کی وصولی کے ضمن کوئی سختی کرے تو وہ اس وعید و تشدد کا مستحق نہ ہوگا۔ اس کا یہ رویہ کیونکر مکروہ ہو سکتا ہے جبکہ خود حضرت عمر بن الخطاب رض اور ان کے بعد ائمہ نے اسے روا رکھا ہے۔ پھر ہمیں علماء حجاز و عراق و شام وغیرہ کے علماء میں کوئی بھی ایسا نہیں ملتا جو اس رویہ کو مکروہ قرار دیتا ہو اور اسے نہ اپناتا ہو۔ اور ان کی سب کی یہی رائے تھی کہ عاشر جو کچھ لے لے اس سے زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے۔

(۱۶۵۰) ان میں انس بن مالک، حسن اور ابراہیم ہیں۔

(۱۶۵۱) اس بارے میں حضرت عمر رض کا مسلک یہ تھا: وہ مسلمانوں سے تو زکوٰۃ وصول کرتے تھے اور اہلِ حرب سے پورا عُشر (۱/۱۰ حصہ)۔ اس لئے کہ یہ لوگ بھی اپنے علاقہ میں مسلمانوں کے داخلہ پر اتنی مقدار (۱/۱۰ حصہ) لیتے تھے۔ ان ہر دو صنف کے ساتھ ان کا یہ طرزِ عمل بالکل واضح اور عیاں تھا۔

ذمیوں سے عشر لینے کی وجہ

(۱۶۵۲) ابو عبید رح:۔ اس ضمن میں جس کی توجیہ مجھے مشکل معلوم ہوتی تھی وہ ذمیوں سے عشر لینے کا مسئلہ ہے۔ یہ لوگ نہ تو مسلمان ہیں کہ ہم ان سے زکوٰۃ لیں اور نہ اہلِ حرب ہیں کہ ان سے اتنی مقدار وصول کریں جو وہ ہمارے آدمیوں سے لیتے ہیں۔ میرے لئے یہ عقدہ لاینحل بنا رہا تا آنکہ حال ہی میں جب میں نے اس مسئلہ میں تدبّر کیا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ ان سے (تجارتی مال پر) جو کچھ وصول کیا جاتا ہے وہ ان شرائطِ صلح کی بنیاد پر ہوتا ہے جو ان کے ساتھ طے پاتی ہیں۔ فی کس جزیہ اور زمینوں کا خراج اس کے علاوہ ہے۔

(۱۶۵۳) ابو مجلز راوی ہیں کہ حضرت عمرؓ نے عمارؓ، ابن مسعودؓ اور عثمان بن حنیف کو کوفہ بھیجا ـــــ پھر ایک واقعہ بیان کیا جو دوسری جگہ مذکور ہے ۔ وہاں عثمان نے زمین کی پیمائش کی اور اس پر اتنی اتنی مقدار متعین کی ۔ اور ذمیوں کے ان اموال پر جو وہ (تجارت کے سلسلہ میں) لاتے لے جاتے ہیں ۔ ہر بیس درہم پر ایک درہم مقرر کیا، اور ان کے ہر فرد پر ۔ عورتوں اور بچوں کو نکال کر ـــ چوبیس (درہم) مقرر کئے ۔ پھر اپنے اس فیصلہ سے خط کے ذریعہ حضرت عمرؓ کو اطلاع دی، جسے انہوں نے برقرار رکھنے کی اجازت دے دی ۔

ابو عبیدؒ ۔ بنا بریں ان (ذمیوں) کے تاجروں سے جو کچھ وصول کیا جاتا ہے وہ صلح کی بنیاد پر ہے ۔ لہٰذا اب یہ (محصول ادا کرنا) ذمیوں پر مسلمانوں کے لئے واجب ہے ۔ یہی مالک بن انس بھی کہا کرتے تھے ۔ ان کے اس قول کی روایت مجھ سے ابن بُکیر نے اس طرح کی ہے :۔

(۱۶۵۴) ان (ذمیوں) سے معاہدۂ صلح میں یہ شق شامل تھی کہ وہ اپنے علاقوں میں رہیں گے اور جب وہاں سے تجارت کے لئے دوسرے علاقوں سے گذریں گے تو ان سے ہر بار گذرنے پر یہ ٹیکس لیا جائے گا ۔

یہ ہیں اہلِ ذمہ اور اہلِ حرب سے متعلق احکام و روایات ۔ اب رہا وہ معاہدۂ صلح جو انہوں (حضرت عمرؓ) نے بنی تغلب سے کیا تھا سو وہ ایک مشہور معاملہ ہے اور وہ ان شاء اللہ اپنی جگہ پر آئے گا

باب

عاشر مسلمانوں سے زکوٰۃ اور ذمیوں اور اہلِ حرب سے عشور (جنگی یا ٹیکس) کس مقدار میں وصول کریگا

مسلم، ذمی اور غیر ذمی تاجروں سے زکواۃ و عشر کی وصولی کی شرح

(۱۶۵۵) انس بن سیرین کہتے ہیں: "مجھے انس بن مالک نے بلوایا میں نے دیر لگا دی۔ اُنہوں نے پھر مجھے بلوایا تو میں ان کے پاس گیا انہوں نے مجھ سے کہا: میں تو یہ خیال کرتا ہوں کہ اگر میں تمہیں ایسا ویسا پتھر دانتوں سے چبانے کا حکم دے دوں تو تم میری رضا جوئی کی خاطر اس حکم پر عمل کرنے سے بھی دریغ نہ کروگے۔ حیرت ہے کہ میں نے تمہارے لئے اپنا پسندیدہ عمل اختیار کیا لیکن تم نے اسے ناپسند کا دیا ہیں تمہارے لئے حضرت عمرؓ کی سنت (معمول) لکھے دیتا ہوں" میں نے کہا: "آپ حضرت عمرؓ کی سنت میرے لئے لکھ دیجئے۔" چنانچہ انہوں نے لکھا: مسلمانوں سے ہر چالیس درہم پر ایک درہم لیا جائے گا اور ذمیوں سے ہر بیس درہم پر ایک درہم، اور غیر ذمیوں سے ہر دس درہم پر ایک درہم" میں نے ان سے دریافت کیا: "غیر ذمی کون لوگ ہیں؟" انہوں نے کہا: رومی لوگ، جو شام آتے رہتے۔"

(۱۶۵۶) زیاد بن حدیر کہتے ہیں: "حضرت عمرؓ نے مجھے عشر کی وصولی پر مامور فرمایا تو مجھے حکم دیا تھا کہ میں اہلِ حرب تاجروں سے عشر (۱/۱۰) وصول کروں اور ذمی تاجروں سے عشر کا نصف (یعنی ۱/۲۰) اور مسلمان تاجروں سے عشر کا چوتھائی

(۱۶۵۷) زیاد بن حُدَیر کہتے ہیں: "مجھے حضرت عمرؓ نے حکم دیا تھا کہ میں ذمّی تاجروں سے اس رقم کا دگنا وصول کروں جو میں مسلمان تاجروں سے وصول کرتا ہوں۔"

(۱۶۵۸) زیاد بن حُدَیر کہتے ہیں: "مجھے حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ میں بنی تغلب کے نصاریٰ سے عُشر (۱/۱۰) وصول کروں اور اہلِ کتاب نصاریٰ سے عُشر کا نصف (یعنی ۱/۲۰)

(۱۶۵۹) سائب بن یزید کہتے ہیں:۔

"میں حضرت عمرؓ کے عہد میں مدینہ کے بازار پر (چنگی وصول کرنے والا) عامل تھا۔ ہم نبطیوں سے عُشر (۱/۱۰) لیا کرتے تھے۔

چنگی لگانے میں مُلکی مانگ کی رعایت ملحوظ رکھنا

(۱۶۶۰) عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں: "حضرت عمرؓ نبطیوں سے زیتون کے تیل اور گیہوں پر تو نصف عشر (۱/۲۰) لیا کرتے تھے تاکہ مدینہ میں یہ سامان زیادہ مقدار میں پہنچے اور دوسرے دانوں اور دالوں پر دسواں حصّہ لیتے تھے۔"

ذمیوں سے عشور کی وصولی

(۱۶۶۱) زُرَیق بن حیّان دمشقی، جو مصر کی گذرگاہ (کے چنگی ناکہ) پر مامور تھے، کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے انہیں لکھا تھا: "ذمیوں میں سے جو تمہارے پاس سے گذرے، تم اُن سے ان کے تجارتی اموال پر ہر بیس دینار پر ایک دینار لے لینا۔ اگر بیس دینار سے کم کا ہو تو دس دینار تک اسی حساب سے کمی کر دینا۔ اگر دس دینار سے ایک تہائی کی بھی کمی ہو تو اس پر اُن سے کچھ نہ لینا، اور جو کچھ تم ان سے لو اس کی انہیں رسید دے دینا جس کی مدّت سال بھر کی ہوگی۔ (یعنی سال گذرنے کے بعد پھر از سرِ نو اسی کے مطابق عشور لیا جائے گا)

ابو عبیدؒ کہتے ہیں: اس راوی کا نام اہلِ عراق "زُرَیق" کہتے ہیں اور اہلِ شام و مصر "رُزَیق" کہتے ہیں اور موخرالذکر ہی اس کے بارے میں زیادہ واقف ہیں۔

(۱۶۶۲) ایک اور سند سے یہی روایت اسی راوی سے عمر بن عبدالعزیزؒ ہی سے مروی ہے۔

عشور وصول کرتے وقت مالیت کا تخمینہ

(۱۶۶۳) عبداللہ بن محمد بن زیاد بن حُدَیر کہتے ہیں کہ میں اپنے دادا زیاد بن حُدَیر کے ساتھ تھا جو عشور کی وصولی پر مامور تھے۔ چنانچہ ایک نصرانی ایک گھوڑے کے ساتھ وہاں سے گذرا جس کی قیمت انہوں نے بیس ہزار لگائی۔ پھر انہوں نے اس نصرانی سے کہا: "تم چاہو تو ہمیں دو ہزار دے کر گھوڑا لے جاؤ۔ اور اگر چاہو تو ہم تمہیں اٹھارہ ہزار (گھوڑے کے عوض) دے دیں گے۔"

عشور صلحی شرائط کے مطابق لیا جاتا تھا اور عہدِ عمر سے قبل اس کا رواج نہ تھا

(۱۶۶۴) ابو عبیدؒ:۔ جیسا کہ ہم پہلے آپ کو بتا چکے ہیں حضرت عمرؓ نے عشور کی وصولی کے سلسلہ میں یہ جو کارروائیاں کیں اُن کی بنیاد ان صلح ناموں پر تھی جو ان کے ساتھ طے پائے تھے، یہ کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے کہ آپؐ نے جن سے صلح کی تھی ان سے اس قسم کی کوئی شرط ان کے ساتھ نہیں رکھی تھی۔ اسی طرح حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں بھی۔ جہاں تک غیر عربی ممالک کی فتوحات کا تعلق ہے۔ یہ سلسلہ حضرت عمرؓ کے دور میں جاری ہوا، لہٰذا اس قسم کے مسائل انہی کے دور میں رونما ہوئے۔

(۱۶۶۵) شعبی کہتے ہیں: "سب سے پہلے اسلام میں جس نے عُشر کو رائج کیا وہ حضرت عمرؓ ہیں۔"

(۱۶۶۶) ابو عبیدؒ:۔ ابن شہاب حضرت عمرؓ کے اس عمل پر کچھ ایسی تاویل کرتے تھے جو اگر دوسرے انداز سے ہوتی تو مجھے زیادہ پسندیدہ ہوتی۔

(۱۶۶۷) مالک بن انس کہتے ہیں کہ میں نے ابن شہاب زُہری سے دریافت کیا کہ حضرت عمرؓ نے ذمیوں سے عُشر کیوں وصول کیا تھا؟ تو اُنہوں نے کہا: "ان سے جاہلیت میں یہ لیا جاتا تھا چنانچہ حضرت عمرؓ نے اسے (اسلام میں بھی) بحال رکھا۔"

(۱۶۶۸) ابو عبیدؒ:۔ اس ضمن میں ہماری مذکورہ پہلی توجیہ اَولیٰ ہے جس کی رو سے حضرت عمرؓ کا یہ عمل صلح کی شرائط کی بناء پر تھا۔ حضرت عمرؓ کے عمل سے ہماری

اس تاویل کو زیادہ مشابہت حاصل ہے ۔ اور خود مالک بھی یہی کہا کرتے تھے ؛۔

عشور (چنگی) کے متعلق اہلِ عراق کا قول :۔

(i) عشور سو یا دو سو درہم کی مالیت کے تجارتی سامان پر لیا جائے گا

(۱۶۶۹) **ابو عبید** ؒ :۔ جب ذمی عشور وصول کرنے والے کے پاس سے اپنا مال (تجارت) لے کر گذرے تو سفیان کہا کرتے تھے کہ عاشر (محصل) اس مال سے اس وقت تک کچھ نہیں لے گا تا آنکہ اس کی قیمت سو درہم نہ ہو جائے سو درہم قیمت ہونے پر وہ اس پر نصف عشر ($\frac{1}{20}$) وصول کرے گا۔

(۱۶۷۰) لیکن سفیان کے علاوہ دیگر اہلِ عراق کا کہنا ہے : " محصّل اس وقت تک اس کے مال پر کوئی عشور وصول نہ کرے گا جب تک کہ اس کی قیمت دو سو درہم نہ ہو جائے ۔

(ii) ذمی مقروض ہونے کا دعویٰ کرے تو عشور معاف ہو جائے گا

(۱۶۷۱) ان کا کہنا یہ بھی ہے کہ اگر وہ (تاجر ذمی) کہے کہ میں مقروض ہوں، یا یہ کہے کہ یہ مال میرا نہیں ہے اور اس پر قسم بھی کھالے تو اس کی بات صحیح مانی جائے گی اور اس سے اس مال پر کچھ عشور نہ لیا جائے گا۔

(iii) عشور دیرپا اشیاء پر لیا جائے گا جلد خراب ہو جانے والی چیزوں پر نہیں لیا جائے گا

(۱۶۷۲) ان کا کہنا یہ بھی ہے کہ اس سے سیم و زر، اسباب و سامان، اور غلام اور اسی قسم کے دیگر اموال پر عشور لیا جائے گا جو لوگوں کے پاس باقی رہتے ہوں، لیکن اگر وہ پھل وغیرہ کی قسم کی چیزیں لائے جو لوگوں کے پاس زیادہ (وقت تک)

نہیں پہنچتی ہیں تو ان پر اس سے کچھ نہیں لیا جائے گا۔

(۱۷) ایک ہی مال پر کئی بار عشور نہیں لیا جائے گا

(۱۶۷۳) ان کا قول یہ بھی ہے کہ ایک ہی مال پر اس سے سال میں ایک دفعہ سے زیادہ عشور نہیں لیا جائے گا خواہ وہ اسے لے کر کئی بار آمد و رفت کرے۔

یہ ہے اہلِ عراق کا قول۔

امام مالکؒ کا عراقی فقہاء سے اختلاف

(۱۶۷۴) جہاں تک مالکؒ کا تعلق ہے وہ اس بارے میں ان تمام حضرات سے زیادہ سخت ہیں۔ ان کا کہنا ہے: "جب ذمی تجارت کا مال لے کر عاشر کے پاس سے گذرے تو وہ اس سے نصف عشر (۱/۲۰) لے گا خواہ وہ مال دو سو (درہم) کا نہ ہو۔" ان کا کہنا ہے: "اور اگر وہ دعویٰ کرے کہ اس پر قرض ہے تب بھی اس کی بات نہیں مانی جائے گی اور اس سے نصف عشر (۱/۲۰) لے لیا جائے گا۔" وہ کہتے کہ اسی طرح اگر وہ پھل لے کر گذرے یا کوئی اور باقی رہنے والی چیز یا نہ باقی رہنے والی چیز۔ بہر حال اس سے عشور لیا جائے گا بشرطیکہ وہ مال تجارت ہو۔"

(۱۶۷۵) وہ مزید کہتے ہیں: "اور جب وہ گذرے گا خواہ وہ اپنا مال لے کر سال میں کئی بار گذرے۔ ہر بار اس سے (اس مال پر) عشور لیا جائے گا۔"

مجھے مالکؒ کے یہ تمام اقوال یا ان میں سے بعض یحییٰ بن بُکیر نے بتائے ہیں۔

ابو عبیدؒ کا محاکمہ

ابو عبیدؒ:۔ ان تمام مختلف اقوال کی تاویلات و توجیہات ہیں:۔

(۱۶۷۶) اہلِ عراق کے وہ لوگ جن کا کہنا ہے کہ ذمی سے اس وقت تک کچھ نہیں لیا جائے گا تا آنکہ اس کے مال تجارت کی قیمت، دو سو درہم نہ ہو جائے تو ان حضرات نے اس مال کو زکوٰۃ سے متشابہ قرار دیا ہے۔ ان کے اس طرف جانے کی وجہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے جب لوگوں کے تجارتی اموال پر محصول متعین کیا تو کہا تھا: مسلمانوں

سے اتنا اتنا لیا جائے گا، اور ذمیوں سے اتنا، اور اہلِ حرب سے اتنا۔ اور انہوں نے اس ضمن میں مال کی کم از کم قیمت کا کوئی تعین نہیں کیا تھا۔

ان کا کہنا ہے: پھر ہم نے حضرت عمرؓ کو دیکھا کہ انہوں نے ایک حق کے ضمن میں ذمیوں کے اموال مسلمانوں کے اموال میں شامل کر لئے تو اسی بنیاد پر ہم نے ان (ذمیوں) کے اموال کے تعین کو زکواۃ پر محمول کر لیا۔ اس لئے کہ کم سے کم زکواۃ کے لئے ایک معین حد ہے اور وہ ہے دوسو (درہم) لہٰذا ہم نے یہی حد ذمیوں کے لئے مقرر کردی اور اس سے کمتر کو کسی شمار میں نہ رکھا۔

(۱۶۷۷) جہاں تک مالکؒ اور اہل حجاز کا مسلک ہے کہ دوسو کو نظر انداز کرتے ہوئے اس سے کمتر پر بھی عشور وصول کیا جائے گا۔ سو اس بارے میں ان کا قول یہ ہے کہ ذمیوں سے جو کچھ وصول کیا جاتا ہے وہ زکواۃ تو ہوتا نہیں کہ اس بارے میں اس کے نصاب کی رعایت کی جائے۔ وہ تو اس جزیہ کی حیثیت کی شئے ہے جو ذمیوں سے فی کس کے حساب سے وصول کیا جاتا۔ اور ہر امیر و غریب پر حسب استطاعت اس کی ادائی فرض ہوتی ہے اور اس بارے میں کوئی تعیّن نہیں کہ جب کم از کم اتنی ملکیت ہو تو جزیہ دیں بلکہ وہ تو ان شرائط میں شامل ہے جس پر ان سے صلح کی گئی۔

ان کا کہنا ہے: اسی طرح ان سے ان تجارتی اموال پر عشور وصول کیا جائے گا جسے لے کر وہ گذریں خواہ وہ تھوڑا ہو یا زیادہ۔

(۱۶۷۸) جہاں تک سفیانؒ کی سو (درہم) کی قید کا تعلق ہے کہ اس قیمت کے مال پر عشور لیا جائے اور اس سے کمتر پر نہیں تو اس بارے میں ان کا یہ مذہب اس بناء پر ہے کہ انہوں نے جب یہ دیکھا کہ ذمیوں پر مسلمانوں کا دگنا مقرر کیا گیا ہے تو انہوں نے اصل مال پر فرع کو قیاس کرتے ہوئے ذمیوں پر سو پر پانچ مقرر کردئے جس طرح ان (ذمیوں) پر دوسو پر دس واجب ہوتے ہیں تاکہ فیصلہ کے اجزاء باہم گر مطابقت اختیار کرلیں اور انہوں نے سو سے کم کو معاف کر دیا۔ جس طرح مسلمانوں کے لئے

دوسو سے کم پر معافی ہے۔ اس طرح ذمی کے ایک سو مسلمانوں کے دوسو کے بالکل برابر ہوگئے یہ ہے ذمیوں کے بارے میں ان کی رائے مجھے نہیں معلوم کہ اُنہوں نے اہلِ حرب کے لئے کیا مقرر کیا۔ بہر حال انہیں اس بارے میں یہ کہنا چاہیئے کہ جب ان (اہل حرب) میں سے کوئی پچاس درہم کا سامان لے کر گذرے تو اس سے عشر وصول کیا جائے۔

(۱۶۷۹) **ابو عبیدؒ:** میرے نزدیک ان تمام اقوال میں سفیان کا قول سب سے زیادہ مبنی بر عدل، اور حضرت عمرؓ کے منشاء سے زیادہ مشابہ ہے۔ ساتھ ہی عمر بن عبدالعزیز نے اپنے اس خط میں جو انہوں نے زُریق بن حیان کو لکھا تھا، اس کی تفسیر کر دی ہے جسے ہم پہلے بیان کر آئے ہیں۔ اُنہوں نے ان کے نام اپنے خط میں لکھا تھا: "ذمیوں میں سے جو بھی تمہارے پاس سے گذرے ان کے مال تجارت میں سے تم ہر بیس دینار میں سے ایک دینار لینا، اور اس سے کم ہو تو اسی حساب سے کم لینا تا آنکہ یہ رقم دس دینار تک ہو جائے پھر اگر اس مقدار سے تہائی دینار بھی کم ہو جائے تو اس پر کچھ نہ لینا۔" (دیکھئے نمبر ۱۶۶۱)

(۱۶۸۰) **ابو عبیدؒ:** اس لئے کہ زکواۃ میں دس دینار برابر ہوتے ہیں سو درہم کے۔ اور یہی ہمارے نزدیک حضرت عمرؓ کی روایت کی تاویل ہے جسے عمر بن عبدالعزیز کی تفسیر سے تائید بھی حاصل ہے۔ اور اس بارے میں ان سے زیادہ علم رکھنے والا کوئی اور مفسّر موجود بھی نہیں ہے اور یہی سفیان کا قول بھی ہے۔

یہ ہے اس کم سے کم رقم کا تعین جس میں ذمیوں اور اہلِ حرب پر حقوق واجب الادا ہوتے ہیں۔

(۱۶۸۱) اب رہا ان لوگوں کا ذمی کے بارے میں یہ کہنا کہ اگر وہ دعویٰ کرے کہ وہ اتنے کا مقروض ہے جتنے کا یہ کل مال ہے تو سفیان اور اہلِ عراق کے قول کے مطابق اس کا یہ دعویٰ قبول کرتے ہوئے اس سے کچھ نہیں لیا جائے گا خواہ اس کے پاس اپنے دعویٰ کی تصدیق کے لئے کوئی ثبوت بھی نہ ہو۔ اس کے برخلاف مالک اور اہلِ حجاز کا قول اس بارے میں یہ ہے کہ اس ذمی کا دعویٰ قبول نہیں کیا جائے گا اور اس سے عشور لیا جائے گا خواہ وہ دعویٰ کی صحت پر ثبوت بھی پیش کر دے۔ لیکن اس مسئلہ میں میرا پسندیدہ طریقہ ان دونوں

اقوال کے بین بین ہے اور وہ یہ کہ اگر اس کے مقروض ہونے کی گواہی مسلمانوں میں سے کوئی دے دے تو اس کا دعویٰ تسلیم کیا جائے گا اور اس کے مال میں سے کچھ نہیں لیا جائے گا۔ اس لئے کہ قرض خود ایک ایسا حق ہے جو اس مال کے مالک پر واجب ہو چکا ہے اور وہ اس کے حق میں جزیہ سے زیادہ قابلِ ادائی ہے۔ اس لئے کہ اگرچہ مسلمانوں کا حق، جزیہ بھی اس کے ذمہ واجب الادا ہے تاہم یہ نہیں ہو سکتا کہ ان حق والوں کو پوری طرح شمار کر کے اس ذمی کے مال کو حصوں میں بانٹ کر ان مسلمانوں اور اس کے قرضخواہ کے درمیان بانٹ دیا جائے۔ اور یہ بھی نہیں معلوم کہ اس سے کتنا کچھ لیا جائے گا جبکہ قرضخواہ کا حق معلوم ہے۔ بناء بریں ہم نے دوسروں کی بہ نسبت اس (قرضخواہ) کو زیادہ مستحق قرار دیا ہے۔ لیکن اگر اس ذمی کے قرض کا ثبوت صرف اس کے زبانی دعویٰ سے ہو تو اسے رد کر دیا جائے گا کیونکہ ممکن ہے کہ اس کے ذمہ مسلمانوں کا جو واجب الادا حق ہے وہ اپنے دعویٰ سے اس سے بچنا چاہتا ہو، لہٰذا اس بارے میں اس پر اس درجہ اعتماد نہیں کیا جا سکتا جتنا کہ سیم و زر کی زکواۃ کے بارے میں مسلمانوں پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ اس ذمی پر جو محصولات واجب الادا ہیں وہ فَئے ہیں۔ اور اس کا حکم زکواۃ سے بہرحال جُداگانہ ہوتا ہے۔

(۱۶۸۲) اب رہا یہ اختلافی مسئلہ کہ اگر تاجر سال میں کئی بار آمد و رفت کرتے ہوئے عاشر کے پاس سے گذرے تو اس کے ساتھ کیسے معاملہ کیا جائے؟ اس بارے میں سفیان اور اہلِ عراق کا قول یہ ہے کہ اس تمام آمد و رفت کے چکروں میں اس سے صرف ایک مرتبہ ہی عشور لیا جائے گا، جبکہ مالکؒ اور اہلِ حجاز کہتے ہیں کہ ہر بار جب وہ گذرے اس سے عشور لیا جائے گا، خواہ یہ گذرنا سال میں کئی بار کیوں نہ ہو جائے۔ بشرطیکہ اس کی یہ آمد و رفت ایک مُلک سے دوسرے مُلک میں ہو۔ اس باب میں دونوں اماموں ــــ عمر بن الخطابؓ اور عمر بن عبدالعزیزؒ ــــ سے جو روایات ہمیں پہنچی ہیں وہ ہمیں غور و فکر سے بے نیاز کر دیتی ہیں

(۱۶۸۳) ابن زیاد بن حُدَیر کہتے ہیں کہ ان کے باپ ایک نصرانی سے ہر سال دو مرتبہ عشور وصول کرتے تھے۔ وہ نصرانی حضرت عمرؓ کے پاس گیا اور اُن سے کہا: "اے امیرالمومنین! آپ کا محصل (عامل) مجھ سے سال میں دو مرتبہ عُشر لیتا ہے۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا: "اسے

اس کی اجازت نہیں ہے، اسے تو ہر سال صرف ایک مرتبہ وصول کرنے کی اجازت ہے"۔ وہ شخص پھر حضرت عمرؓ کے پاس آیا اور کہنے لگا: "میں نصرانی شیخ ہوں" تو حضرت عمرؓ نے فرمایا: "اور میں مسلم شیخ ہوں، تمہارے معاملہ میں میں نے چٹھی بھیج دی ہے"۔

(۱۶۸۴) جریر بن حازم کہتے ہیں: "میں نے عمر بن عبدالعزیز کی وہ چٹھی پڑھی ہے جو انہوں نے عدی بن ارطاۃ کو بھیجی تھی۔ اس میں درج تھا: "عشور لے لینے کے بعد پھر انہیں رسید لکھ دیا کرو تاکہ اس مال یا اس کے منافع پر کوئی زکوٰۃ ایک سال تک نہ لی جائے لیکن اگر (سابقہ درآمد کئے ہوئے) مال کے علاوہ کوئی اور (نیا) مال لے کر گذرے تو اس پر عشور لیا جائے"۔

(۱۶۸۵) **ابو عبیدؒ**:۔ عمر (بن عبدالعزیز) کی یہ روایت اہلِ حجاز و اہلِ عراق کے درمیان انصاف کر رہی ہے۔ اس کی رو سے اگر تاجر بعینہٖ وہی (سابقہ) مال لے کر دوبارہ گذرے جسے لے کر وہ پہلی بار گذرا تھا تو اُس پر یا اس کے منافع پر اس سال اس تاجر سے ایک مرتبہ کے سوا مزید کچھ نہیں لیا جائے گا۔ اس لئے کہ وہ حق جو اس پر واجب تھا، وہ ادا کر چکا ہے۔ لہٰذا ایک مال پر ایک واجبی حق دو مرتبہ ادا نہیں کیا جائے گا۔ لیکن اگر وہ اس مال کے علاوہ کوئی اور مال لے کر گذرے تو اس پر سے اس کا حق لیا جائے گا، خواہ یہ عمل سال میں کئی بار کیوں نہ دہرائے بشرطیکہ وہ اپنے ملک واپسی کے بعد پھر پہلے مال کے علاوہ دوسرا مال لے کر آئے۔ اس لئے کہ پہلا مال دوسرے مال کی جگہ نہیں لے سکتا، اسے اس بارے میں کسی طرح مسلمان سے زیادہ مراعات حاصل نہیں ہو سکتیں کہ اگر وہ بھی بغیر زکوٰۃ ادا کیا ہوا مال لے کر گذرے گا تو اس سے بھی زکوٰۃ لے لی جائے گی۔ پھر اگر اسی سال وہ دوسرا ایسا مال لے کر گذرے گا جس پر زکوٰۃ لی گئی ہو تو اس پر بھی اس سے زکوٰۃ لے لی جائے گی اس لئے کہ پہلی زکوٰۃ کسی طرح بھی دوسرے مال کی زکوٰۃ کی جگہ نہیں لے سکتی۔

ابو عبیدؒ:۔ مذکورہ بالا احکام ذمیوں سے متعلق ہیں۔

اہلِ حرب سے عشور کی وصولی

(۱۶۸۶) اب رہے اہلِ حرب سو ان کے بارے میں سب کا اتفاق ہے کہ جب حربی اپنے علاقہ میں واپس جاکر اپنے اسی مال کو یا دوسرے مال کو لے کر دوبارہ آئے تو اس سے ہر مرتبہ گذرنے پر عشر لیا جائے گا۔ اس لئے کہ جب وہ دارالحرب میں چلا جاتا ہے اس پر سے مسلمانوں کے احکام ختم ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ جب وہ دوبارہ دارالاسلام آئے گا تو اس پر از سرِ نو حکم جاری ہوگا بالکل اسی طرح جیسے وہ پہلے کبھی دارالاسلام میں داخل نہ ہوا ہو۔ اس کے اور بالکل پہلی بار گذرنے والے کے درمیان کوئی فرق نہیں ہوگا۔

(۱۶۸۷) اور سب کے سب بالاتفاق یہ کہتے ہیں کہ اگر حربی اپنے مقروض ہونے یا مال کے کسی اور کی ملکیت ہونے کا کوئی دعویٰ کرے تو اس کی تصدیق نہیں کی جائے گی بلکہ ہر حال میں اس سے عشور لیا جائے گا۔ البتہ صرف اہلِ عراق کا کہنا ہے کہ ایک بات میں حربی کی تصدیق کی جائے گی اور وہ یہ ہے کہ اگر وہ لونڈیوں کو لے کر گذرے اور کہے کہ یہ میری اولاد کی مائیں (یعنی میری مستعملہ لونڈیاں) ہیں تو اس کی یہ بات قبول کرتے ہوئے اس سے ان کی قیمت کا عشر (۱/۱۰) نہیں لیا جائے گا۔

مشکوک دعویدار سے حلف اُٹھوانا

(۱۶۸۸) ابو عبیدؒ:۔ اگر عاشر (محصل) کو کسی مسلمان یا ذمی یا حربی کا دعویٰ مشکوک نظر آئے اور وہ اس پر اسے قسم کھلوانا چاہے تو اس بارے میں سفیانؒ کی رائے یہ ہے کہ مسلمانوں سے حلف نہ اٹھوایا جائے اس لئے کہ زکوٰۃ کے بارے میں وہ امانت دار اور قابلِ اعتماد ہیں۔

(۱۶۸۹) لیکن سفیانؒ کے علاوہ دیگر اہلِ عراق کا قول ہے کہ ان سے حلف اُٹھوایا جائے گا۔ اسی طرح ذمی بھی مسلمانوں کی حیثیت رکھیں گے، اور جن امور میں مسلمانوں کی تصدیق کی جائے گی ذمیوں کی بھی کی جائے گی۔

(۱۶۹۰) لیکن مالکؒ کا خیال ہے کہ مسلمان کا قول قبول کر لیا جائے گا اور ذمی

کا قول یا قسم معتبر نہیں ہو گی۔ بھلا اس کی قسم کیسے مان لی جائے گی جبکہ اس کا پیش کردہ ثبوت ہی قبول نہیں کیا جاتا؟

ابو عبیدؒ:۔ قسم کھلانے کے متعلق قدیم زمانہ سے اختلاف چلا آرہا ہے:۔

(۱۶۹۱) قرۃ بن خالد بنو ضبۃ کے ایک شخص سے روایت کرتے ہیں: "میں رمضان میں حمید بن عبدالرحمن حمیری کے پاس سے جو سلسلہ پر متعین تھے، گذرا۔ انہوں نے میری کشتی کو رکوانے کا حکم دیا چنانچہ وہ روک لی گئی۔ پھر انہوں نے مجھ سے اس بات پر حلف لیا کہ غلہ کی جس مقدار اور صنف کا میں نے ذکر کیا ہے وہی کچھ میری کشتی میں ہے۔"

(۱۶۹۲) ابووائل کہتے ہیں: "میں سلسلہ میں عبداللہ بن معقل کے پاس سے گذرا جو پل پر عشور کی وصولی کے لئے متعین تھے۔ وہ لوگوں سے قسم لیتے تھے۔ اس پر میں نے ان سے کہا: "اے ابن معقل! لوگوں سے حلف کیوں اٹھواتے ہو؟ انہیں جہنم میں ڈال رہے ہو۔ خود بھی تباہ ہو رہے ہو اور انہیں بھی ہلاک کر رہے ہو؟" تو انہوں نے کہا: "اگر میں ایسا نہ کروں تو یہ مجھے کچھ بھی نہیں دیں گے"۔ میں نے ان سے کہا: "تمہارا کیا بگڑتا ہے؟ لوگ جو کچھ تمہیں دیں وہی ان سے لے لیا کرو۔"

باب

بنی تغلب سے عُشر کی وصولی اور اُن سے دُگنا صدقہ (زکواۃ) وصول کرنا

(۱۶۹۳) داود بن کُردُوس کہتے ہیں: "میں نے بنی تغلب کی طرف سے حضرت عمر ابن الخطابؓ سے صلح کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وہ (بنی تغلب) دریائے فرات پار کر چکے تھے اور رومیوں سے جاکر ملنا چاہتے تھے۔ اس صلح نامہ کی شرائط یہ تھیں: یہ (بنی تغلب) کسی بچہ کو بپتسمہ نہیں دیں گے۔ اور اُنہیں اپنے دین کے سوا کسی دین کو قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ اور یہ کہ ان سے عشر دگنا وصول کیا جائے گا یعنی ہر بیس درہم پر ایک درہم۔" راوی کہتا ہے کہ داود کہا کرتے تھے: "اب بنی تغلب سے ہمارا کوئی عہد و ذمہ باقی نہیں رہا اس لئے کہ وہ اپنے دین میں (رکھنے کے لئے اپنے بچوں کو) بپتسمہ کر رہے ہیں۔"

بنی تغلب سے شرائطِ صلح

(۱۶۹۴) زُرعۃ بن نُعمان (یا نعمان بن زرعہ) کہتے ہیں کہ جب حضرت عمرؓ بن الخطاب نے بنی تغلب سے جزیہ وصول کرنا چاہا اور وہ دیگر علاقوں میں نکل کر منتشر ہونے لگے تو میں نے ان کے بارے میں حضرت عمرؓ سے گفتگو کرنا چاہی۔ میں نے حضرت عمرؓ سے کہا: "اے امیر المومنین! بنی تغلب عرب ہیں اور جزیہ کے نام سے گھبراتے ہیں؎ یہ لوگ کھیتی باڑی اں

؎۔ بنی تغلب چاہتے تھے کہ ان سے مسلمانوں کے برابر صدقہ لیا جائے لیکن حضرت عمرؓ نے مسلمانوں کے فریضہ کو ان پر عائد کرنا پسند نہ کیا تو انہوں نے اس بات پر صلح کر لی کہ جو کچھ ہم سے لیا جائے اس کا نام بجائے جزیہ کے صدقہ رکھا جائے۔ بیہقی، کتاب الخراج یحییٰ بن آدم نمبر ۲۰۶ و ۲۰۸ و کتاب الخراج لابی یوسف: ۱۲۲ (از حاشیہ کتاب الاموال)

اور مویشیوں کے علاوہ کچھ مال نہیں رکھتے ۔ البتہ یہ اپنے دشمنوں کو زک پہنچانے والے لوگ ہیں۔ لہٰذا آپ ان (کو اپنے علاقہ) سے (دور کرکے) اپنے دشمنوں کو تقویت نہ پہنچائیے"۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اس شرط پر ان سے صلح کرلی کہ میں ان سے صدقہ (زکواۃ) کا دگنا وصول کروں اور ساتھ ہی ان سے یہ شرط بھی کی کہ وہ اپنی اولاد کو عیسائی نہ بنائیں۔

(۱۶۹۵) مغیرہ کہتے ہیں: مجھے بتایا گیا ہے کہ حضرت علیؓ نے کہا تھا: "اگر بنی تغلب کا معاملہ پوری طرح میرے ہاتھ میں آگیا تو ان کے بارے میں میری رائے یہ ہوگی کہ ان کے جنگجو افراد کو قتل کردیا جائے اور بال بچوں کو غلام بنا لیا جائے۔ اس لئے کہ انہوں نے عہد شکنی کی ہے اور اب جبکہ وہ اپنی اولاد کو عیسائی بنا رہے ہیں ہم پر ان کا کوئی عہد و ذمہ باقی نہیں ہے۔"

(۱۶۹۶) ابن شہاب کہتے ہیں: "اہلِ کتاب کے مویشیوں پر زکواۃ وصول کرنے کا تو ہمیں کوئی علم نہیں ان سے تو صرف جزیہ ہی لیا جاتا ہے۔ البتہ بنی تغلب کے عیسائیوں سے —— جن کی کل ملکیت مویشی تھی —— ان کے اموال پر خراج لیا جاتا تھا جو اتنا بڑھا چڑھا کر لیا جاتا تھا کہ وہ صدقہ (زکواۃ) کا دگنا یا اس سے کچھ زیادہ ہی ہو جاتا تھا۔"

ابو عبیدؒ: یہ ہے بنی تغلب سے وصول کئے جانے والے خراج کی تفصیل، جو مسلمانوں کی زکواۃ (صدقہ) کا دگنا ہے۔ ہم اس کی شرح کتاب الفئ کے شروع میں کرچکے ہیں (دیکھئے نمبر ۶۹، ۷۲)

حضرت عمرؓ نے بنی تغلب کے بارے میں دو فیصلے کئے تھے:۔

عرب ہونے کے باوجود حضرت عمرؓ کا بنی تغلب کو کچھ مال لے کر چھوڑ دینا اور اس کی توجیہ

(۱۶۹۷) ایک تو یہ کہ جب بنی تغلب نے عرب ہونے کے باوجود حضرت عمرؓ کو اپنے اموال کا ایک حصہ دیا تو انہوں نے ان کی جان بخشی کردی حالانکہ ان (کے جیسے عربوں) پر جو قانون جاری تھا اس کے لحاظ سے وہ یا تو اسلام قبول کرتے یا انہیں قتل کردیا جاتا

جہاں تک ہمارا خیال ہے حضرت عمرؓ نے ان سے جو مال قبول کیا تھا اس کے دو سبب تھے ایک تو یہ کہ وہ عیسائیت اختیار کئے ہوئے تھے۔ دوسرا سبب یہ حدیث تھی جو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے سُنی تھی اور جو ان کی نظر میں اس قبیلہ پر صادق آتی تھی۔

(۱۶۹۸) سعید بن العاص کہتے ہیں کہ انہوں نے حضرت عمرؓ کو یہ کہتے سُنا" اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو یہ فرماتے نہ سُنا ہوتا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس دین کی حفاظت ساحل فرات پر (خاندان) ربیعہ کے نصاری سے کرائے گا تو میں کسی عرب کو اسلام قبول کئے یا پھر قتل کئے بغیر نہ چھوڑتا۔"

انہی وجوہ کی بناء پر انہوں نے مال قبول کر کے ان کی جان بخشی کر دی۔ یہ ہوا حضرت عمرؓ کا ایک فیصلہ۔

(۱۶۹۹) ان کا دوسرا فیصلہ یہ ہے کہ جب اُنہوں نے ان کی جان بخشی کر کے ان سے مال قبول کر لیا تو انہوں نے دیگر تمام ذمیوں کی طرح ان سے لئے جانے والے اس مال کو "جزیہ" نہ قرار دیا بلکہ اس کا نام دگنا "صدقہ (زکواۃ)" رکھا۔

بنی تغلب کے جزیہ کو دُگنی زکواۃ کہنے کی مصلحت

ہمارے خیال میں انہوں نے جزیہ کا نام اُڑا کر یہ صورت اس لئے جائز رکھی کہ انہیں بنی تغلب کی طرف سے یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ وہ جزیہ کے نام سے بیزاری و ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں اور وہ خطرہ محسوس کرتے تھے کہ اگر انہیں (اسی نام پر) مجبور کیا گیا تو وہ رومیوں سے جا ملیں گے اور اسلام کے خلاف ان کے مددگار بن جائیں گے۔ پھر ان پر یہ حقیقت بھی منکشف تھی کہ اگر ان سے واجبی جزیہ لینے کے ساتھ ہی اتنی رعایت کر دی جائے کہ اس کا نام (جزیہ) باقی نہ رکھا جائے تو اس سے مسلمانوں کو کوئی گزند نہ پہنچے گا۔ بناء بریں اُنہوں نے ان کے لئے جزیہ کا لفظ اُڑا دیا اور اس کی واجب الادا رقم "صدقہ" کے نام سے لینے لگے جو مسلمانوں سے وصول کی جانے والی زکواۃ کی دگنی ہوتی تھی۔ اس طرح ایک طرف تو ان کے مخالفین سے جا ملنے کے اندیشہ کا سدِّباب ہو گیا اور دوسری طرف ان کے ذمہ مسلمانوں کے جو واجب الادا حقوق تھے

کرلینے اور اس کے اسباب کے بارے میں تذکرہ کر چکے ہیں اور وہاں یہ بھی بتا چکے ہیں کہ اس بارے میں ان میں اور عجمیوں میں کیا فرق ہے۔

عربوں میں سے اہلِ کتاب و مشرکین، نیز عربوں اور عجمیوں کا فرق

(۱۷۰۵) اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عربوں میں سے صرف اہلِ کتاب کو یہ حق دیا ہے کہ وہ جزیہ دے کر اپنی جان بچالیں اور بقیہ تمام غیر اہلِ کتاب عربوں کے لئے ایک ہی صورت رکھی ہے کہ وہ اسلام قبول کرلیں ورنہ قتل کر دئے جائیں لیکن عجمی خواہ وہ اہلِ کتاب ہوں یا غیر اہلِ کتاب ان سے جزیہ قبول کرلیا جائے گا۔ اور یہ لوگ مجوس ہیں۔

(۱۷۰۶) اس کی توجیہ میں بعض علماء کا قول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان (مجوس) سے جزیہ اس لئے قبول کیا تھا کہ وہ اہلِ کتاب ہیں اور اس کی تاویل میں وہ یہ آیت کریمہ پیش کرتے ہیں:

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ۔

(التوبۃ ۹: ۲۹)

اہلِ کتاب میں سے ان لوگوں سے جنگ کرو جو اللہ اور روزِ آخر پر ایمان نہیں لاتے، اور نہ ان چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں جنہیں اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا اور جو دینِ حق اختیار نہیں کرتے، تا آنکہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کر دیں اور وہ تابعیت اختیار کرلیں۔

(۱۷۰۷) یہ علماء حضرت علیؓ سے بھی ایک روایت بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا "وہ لوگ (مجوس) اہلِ کتاب ہیں۔"

(۱۷۰۸) **ابو عبیدؒ:** ہمیں اس روایت کی سند معلوم ہے، اس قسم کی روایت قابلِ اعتماد نہیں کیونکہ اس میں ایک راوی سعید بن مرزبان ہے۔ بہرحال ہمارے نزدیک حضرت علیؓ سے یہ روایت محفوظ (اور صحیح) نہیں ہے۔ اگر اس کی کوئی بنیاد بھی ہوتی

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ذبیحوں اور ان میں شادی بیاہ کرنے کو حرام نہ قرار دیتے۔ اور آپؐ سے زیادہ اس حقیقت کا کون واقف ہو سکتا تھا۔ اور اس میں قرآن مجید کی مخالفت کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، نہ ہی تحلیل و تحریم کے کسی حکم میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکموں میں کوئی فرق ہو سکتا ہے۔ رسول اللہؐ کبھی بھی ایسا فیصلہ نہیں کرتے تھے

سنّت احکامِ قرآنی کی شارح ہے، مثالیں

جو قرآن کے فیصلہ سے مختلف ہوتا ہو، حقیقت یہ ہے کہ سنت قرآنی احکام کی شرح و تفسیر کرتی ہے اور قرآن مجید کے قوانین و حدود کی وضاحت کرتی ہے۔ اس کی مثال قرآن مجید کی اس آیت میں ملاحظہ فرمائیے جس میں حدود کا ذکر کرتے ہوئے کہا جا رہا ہے۔

اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا مِائَۃَ جَلْدَۃٍ ۔ (النور ۲۴ : ۲)	زانیہ اور زناکار مرد ان دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔

تو بظاہر یہ حکم عمومیت رکھتا ہے اور اس کا اطلاق ہر زناکار پر ہوتا ہے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فیصلہ سے یہ بتایا کہ یہ حکم رجم شادی شدہ افراد کے لئے ہے۔ اور فیصلہ میں قرآن مجید کی کوئی مخالفت نہیں ہے، بلکہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً ایسا کیا تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے مذکورہ بالا آیت میں غیر شادی شدہ افراد کے لئے سو کوڑے کا حکم دیا ہے۔ دوسروں کے لئے یہ حکم نہیں ہے۔

(۱۰۹) اسی طرح فرائض بیان کرتے ہوئے جب قرآن مجید میں آیا ہے:

یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ فِیْٓ اَوْلَادِکُمْ لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ ۝ (النساء ۴ : ۱۱)	تمہیں اپنی اولاد میں (تقسیم میراث کے ضمن) اللہ حکم دیتا ہے کہ مرد کو دو عورتوں کے حصہ کے برابر دو۔

اس طرح یہ آیت ہر بچہ اور ہر اولاد کو اپنے اندر لے لیتی ہے۔ لیکن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لَا یَرِثُ الْمُسْلِمُ الْکَافِرَ وَلَا الْکَافِرُ الْمُسْلِمُ — مسلمان کافر کا وارث نہیں ہو گا۔ اور نہ کافر مسلمان کا۔

تو یہ ارشادِ رسولؐ قرآن کے مخالف نہیں ہوا بلکہ اس سے یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے باہمی میراث کے حاصل کرنے میں ایک دین رکھنے والوں کو، مراد لیا ہے نہ کہ دو مختلف دین رکھنے والے۔

(۱۷۱۰) اسی طرح جب اللہ تعالیٰ نے وضو کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْھَکُمْ وَاَیْدِیَکُمْ اِلَی الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِکُمْ وَاَرْجُلَکُمْ اِلَی الْکَعْبَیْنِ — اے ایمان والو! جب تم نماز کے لئے اٹھو تو اپنے چہرے اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں تک دھو لو اور اپنے سروں پر مسح کرو اور ٹانگوں کو ٹخنوں تک (دھو لو)

(المائدہ: ۶)

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے چمڑی موزوں پر خود مسح کیا اور اس کا حکم بھی دیا۔ اس طرح آپؐ نے ہمیں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے ٹانگیں دھونے کا جو حکم دیا ہے اس سے مراد وہ پاؤں ہیں جن پر چمڑی موزے نہ ہوں۔

یہی حال تمام قرآنی شرائع و قوانین کا ہے کہ وہ بالاجمال نازل ہوئے ہیں تا آنکہ سنت ان کی شرح و تفسیر کرتی ہے۔

(۱۷۱۱) بنا بریں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا تمام عجمیوں سے جزیہ لینے کا عمل خواہ وہ اہل کتاب ہوں یا نہ ہوں۔ اور عربوں میں سے صرف اہلِ کتاب سے جزیہ لینا اور غیر اہلِ کتاب عربوں کو اس حکم سے مستثنیٰ کر دینا ایک ایسا تفسیری عمل ہے کہ جب آپؐ نے ایسا کیا تو ہمیں آپؐ کے عمل سے (اس آیت کے معنی سمجھنے میں یہ) ثبوت ملا کہ اس میں جزیہ قبول کرنے کے لئے جو اہلِ کتاب ہونے کی شرط ہے وہ عربوں کے لئے خاص ہے لیکن جہاں تک عجمیوں کا تعلق ہے ان سے ہر حال (خواہ وہ اہلِ کتاب ہوں یا نہ ہوں) جزیہ لے لیا جائے گا۔

صابئین سے جزیہ

(۱۷۱۲) اس بات کی مزید وضاحت امّت کے اس اجماع سے ہوتی ہے جو اس نے رسول اللہ ؐ کے بعد صابئین سے جزیہ

قبول کرنے میں کیا، جبکہ اس بارے میں قرآن مجید سے کوئی قانون نہیں مل رہا تھا۔ ہمارا خیال ہے کہ لوگوں نے یہ فیصلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی مجوس کے بارے میں معمول بہ سنت کے پیشِ نظر کیا اور یہ فیصلہ اس لئے روا رکھا گیا کہ صابئین مجوس سے مشابہت رکھتے تھے اس لئے کہ تمام تر یا بیشتر مسلمان ان کے ذبیحوں اور ان میں شادی بیاہ کرنے کو مکروہ خیال کرتے تھے اس لئے کہ ان کی نظر میں وہ مجوس کی حیثیت رکھتے تھے۔

اور یہ چیز متعدد علماء نے کہی ہے:-

(۱۷۱۳) مُطرف کہتے ہیں کہ ہم حَکَم بن عتیبہ کے پاس تھے تو انہیں ایک شخص نے حسن بصری کے متعلق یہ بتایا کہ وہ صابئین کے بارے میں کہا کرتے تھے: "وہ بمنزلہ مجوس ہیں" تو اس پر حَکَم نے کہا: "کیا میں تمہیں یہ بات نہیں بتا چکا ہوں؟"

(۱۷۱۴) مجاہد کہتے ہیں: "صابئین مشرکوں کی ایک قوم ہے جو یہود و نصاریٰ کے بین بین ہوتی ہے۔ اور ان کے پاس کوئی کتاب (الٰہی) نہیں۔

یہودیت و عیسائیت کے سوا ہر دین کو مجوسیت پر قیاس کیا جائے گا

(۱۷۱۵) ایسی ہی روایت اوزاعی سے مروی ہے کہ وہ کہا کرتے تھے: "اسلام کے بعد یہودیت و عیسائیت کے سوا جو بھی دین ہے اس کی حیثیت مجوس کی سی ہے۔

یعنی ان پر وہی احکام جاری ہوں گے جو مجوس پر ہوتے ہیں۔

(۱۷۱۶) اور یہی مالک کا بھی قول ہے۔

(۱۷۱۷) اس مسئلہ میں اہلِ عراق نے باہم اختلاف کیا ہے چنانچہ ان کی اکثریت کا قول ہے کہ صابئین بمنزلہ مجوس ہیں۔

(۱۷۱۸) اور ان میں سے ایک قلیل جماعت کا قول ہے: "ان کی حیثیت نصاریٰ کی سی ہے۔"

(۱۷۱۹) جابر بن زید سے صابئین کے بارے میں دریافت کیا گیا کہ آیا وہ اہلِ کتاب

ہیں اور اُن کا کھانا اور ان کی عورتیں مسلمانوں کے لئے حلال ہیں ؟" تو انہوں نے کہا: "ہاں"

ابو عبیدرح :- ہماری تائید مجاہدرح ، حسنؒ ، عکرمہؒ اور اوزاعیؒ و مالکؒ کے قول کو حاصل ہے جس کے بموجب ان کی حیثیت مجوس کی سی ہوتی ہے ۔ اس لئے کہ قرآن مجید سے اُن کے پاس کسی کتاب الٰہی کے ہونے کی تصدیق نہیں ہوتی ۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

فصل

صدقہ (زکوٰۃ) کے مصارف

باب

وہ مستحقینِ زکوٰۃ جن کے لئے اسے وصول کرنا درست ہے، اور جن لوگوں کے لئے زکوٰۃ حلال یا حرام ہے اُن کے درمیان حدِ فاصل کا بیان

(۱۷۲۰) قبیصہ بن مُخارق کہتے ہیں کہ میں ایک تاوان کے بوجھ تلے دبنے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا تو آپؐ نے فرمایا! "ہمارے پاس زکواۃ آنے تک ٹھہرے رہو، اس کے بعد ہم یا تو اس کی ادائی میں تمہاری مدد کریں گے یا پھر اس بارِ تاوان کو تم سے اٹھا کر اپنے ذمہ لے لینگے۔ اور یاد رکھو کہ تین آدمیوں کے سوا کسی کو سوال کرنا حلال نہیں ہے، ایک تو وہ شخص

تین آدمیوں کو سوال کرنا جائز ہے

جو لوگوں کی موجودگی میں کوئی تاوان اپنے ذمہ لے لے وہ اس کے ادا ہونے تک سوال جاری رکھ سکتا ہے۔ پھر وہ سوال سے باز رہیگا۔ دوسرے وہ شخص جسے کوئی ایسی آفت پہنچے جس سے اس کا مال تباہ و برباد ہو جائے تو وہ اس وقت تک سوال کرنے کا حق رکھتا ہے کہ اس کی حالت سدھر جائے۔ پھر وہ سوال سے رک جائیگا۔ تیسرا شخص وہ ہے جو محتاج و ضرورتمند ہو جائے اور اس کی قوم کے تین سمجھدار آدمی اس امر کی گواہی دیں کہ واقعی یہ ضرورتمند اور فاقہ میں مبتلا ہے اور اس کے لئے سوال کرنا حلال ہو چکا ہے۔ تو یہ شخص اس وقت تک سوال جاری رکھے گا: تا آنکہ اس کی حالت سدھر جائے پھر باز

رہے گا۔ ان کے سوا جو بھیکیں (مانگی جارہی) ہیں۔ وہ حرامخوری ہیں۔

(۱۷۲۱) ابوبکرؓ روایت کرتے ہیں کہ میں قبیصہ بن مخارق کے پاس تھا کہ ان کی قوم کے کچھ لوگ اپنے کسی آدمی کے نکاح کے سلسلہ میں ان سے سوال کرنے کے لئے آئے، لیکن انہوں نے ان لوگوں کو کچھ بھی نہ دیا، جب وہ چلے گئے تو میں نے ان سے کہا "تمہاری قوم کے کچھ لوگ اپنے آدمی کے نکاح کے سلسلہ میں تم سے مدد مانگنے کے لئے آئے تھے کیا وجہ ہے کہ تم نے انہیں کچھ بھی نہ دیا۔ حالانکہ تم اپنی قوم کے سردار ہو؟" تو انہوں نے کہا: "اگر ان کا یہ آدمی فلاں فلاں کام کر لیتا۔ یہاں انہوں نے کچھ کام بتائے۔ تو یہ لوگوں سے بھیک مانگنے کے مقابلہ میں بہتر ہوتا، اس لئے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو یہ فرماتے سنا ہے۔ تین آدمیوں کے سوا کسی کو سوال کرنا حلال نہیں ہے۔" پھر انہوں نے وہی تفصیل بیان کی جو اوپر کی حدیث میں بیان کی گئی۔

ابوعبیدؒ:۔ میرا خیال ہے کہ اوپر کی حدیث کے راوی ابوبکر سے مراد کنانہ بن نعیم ہے اس سند کے ایک راوی اوزاعی نے انہیں بجائے نام کے ان کی کنیت سے پکارا ہے۔

(۱۷۲۲) بہز بن حکیم اپنے باپ اور دادا کے واسطہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا: "یارسول اللہؐ! ہم ایسی قوم کے افراد ہیں جو آپس میں ایک دوسرے سے اپنے اموال کو مانگتے رہتے ہیں" تو آپؐ نے فرمایا "سخت آفت پڑنے پر یا تنگ حال و قرض میں آدمی سوال کرسکتا ہے۔ لیکن جونہی ضرورت پوری ہو جائے یا حالت سدھرنے لگے تو احتیاط برتے اور سوال سے بچتا رہے[1]

(۱۷۲۳) یحیٰی بن ابی کثیر کہتے ہیں کہ ایک شخص ابن عمرؓ کے پاس آیا اور ان کے سامنے دست سوال دراز کیا، تو انہوں نے اس سائل سے کہا: "اگر تم کسی خوفناک خون یا دردناک تاوان یا بے عزت کرنے والے فقر میں مبتلا ہو تب تو تمہارا حق واجب ہے ورنہ تمہارا کوئی حق نہیں" راوی کہتا ہے کہ پھر وہ سائل حضرت حسن بن علیؓ کے پاس گیا تو انہوں نے بھی اسے ایسا ہی جواب دیا"

---

[1] ابوداؤد اور بیہقی نے حضرت انسؓ سے یہ روایت اس انصاری کے قصہ میں بیان کی ہے۔ جس کا بوریا اور کاسہ رسول اللہؐ نے فروخت کرکے اس کے عوض اسے رسّی اور کلہاڑی خرید کردی تھی اور حکم دیا تھا کہ وہ لکڑیاں جمع کرکے فروخت کرے اور گزارہ کرے۔ (از حاشیہ کتاب الاموال)

(۱۷۲۴) ابو عبیدؒ :۔ شریک اسی روایت کو ابواسحٰق اور رجال بن ابی جبال کے واسطہ سے ابن عمر، حسن، حسین، اسماء بنت عمیسؓ، اور عبداللہ بن جعفر سے روایت کرتے تھے۔

تونگر یا کمانے کی طاقت رکھنے والا زکوٰۃ کا حقدار نہیں

(۱۷۲۵) عبیداللہ بن عدی بن الخیار کہتے ہیں کہ انہیں دو آدمیوں نے ـــ جن کے متعلق انہوں نے تفصیل بتائی ـــ بتایا: "ہم دونوں حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے، اس وقت لوگ آپؐ سے زکوٰۃ مانگ رہے تھے۔ ہم لوگوں کے ہجوم کو چیرتے ہوئے آپؐ کے پاس پہنچے اور ہم نے بھی آپؐ سے زکوٰۃ کا سوال کیا، آپؐ نے اوپر سے نیچے تک ہم پر نگاہ ڈالتے ہوئے ہمیں مضبوط و توانا پایا، پھر فرمایا: "اگر تم چاہو تو میں تمہارا سوال پورا کردوں لیکن دیکھو کسی تونگر یا کمانے کی طاقت رکھنے والے مضبوط و توانا شخص کے لئے اس (زکوٰۃ) میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

(۱۷۲۶) عبداللہ بن عمروؓ کہتے ہیں۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: زکوٰۃ نہ تو کسی امیر کے لئے حلال ہے اور نہ ایسے طاقتور صحت مند کے لئے جس ہاتھ پیر چل رہے ہوں۔

پانچ صورتیں جن میں تونگر زکوٰۃ لے سکتا ہے

(۱۷۲۷) عطا ابن یسار سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا "پانچ آدمیوں کے سوا کسی تونگر کو زکوٰۃ حلال نہیں ہے، ان میں سے ایک تو وہ ہے جو زکوٰۃ کی تحصیل پر مامور ہو، دوسرا وہ جو اسے اپنے مال سے خرید لے تیسرا وہ کہ جس کا پڑوسی فقیر ہو۔ اور اسے (پڑوسی کو) کچھ زکوٰۃ دی جائے پھر وہ فقیر اس میں سے اس (امیر) کو تحفۃً دیدے، چوتھا غازی اور پانچواں وہ جس پر تاوان پڑ جائے۔"

تونگری کی وہ مقدار جس کے بعد زکوٰۃ لینا مذموم ہے

(۱۷۲۸) عبداللہ بن مسعودؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو بھی تونگری میں (بغیر ضرورت کے) دست سوال دراز کرے گا روز قیامت اس کی وہ بھیک اس کے چہرے پر خراش اور زخموں کی شکل میں نمودار ہوگی،" آپؐ سے دریافت کیا گیا: "یا رسول اللہؐ! تونگری کی تعریف کیا ہے؟" آپؐ نے فرمایا: پچاس درہم یا اس کے

حساب سے سونے کی موجودگی۔"

(۱۷۲۹) ایک اور سند سے بھی یہی مضمون ابن مسعودؓ ہی سے مروی ہے۔

(۱۷۳۰) اور حجاج و حکم کے واسطے سے حضرت علیؓ سے بھی۔

(۱۷۳۱) سعد بن ابی وقاصؓ سے مروی ہے کہ (صحابہ) کہتے تھے: "جس کے پاس پچاس درہم یا اس کے مساوی سونا ہو اسے زکوٰۃ لینا حلال نہیں ہے۔"

(۱۷۳۲) عطاء بن یسار ایک اسدی (بنی اسد کے ایک شخص) سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا لیکن آپؐ نے اسے کچھ نہ دیا، اس پر وہ ناراض ہو گیا، تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم میں سے ایک ہمارے پاس آ کر دست سوال دراز کرتا ہے۔ پھر اگر ہمارے پاس اسے دینے کے لئے کچھ نہیں ہوتا تو وہ بگڑ جاتا ہے یاد رکھو جس کے پاس ایک اُوقِیَہ (۴۰ درہم) یا اس کے مساوی مال ہو اور وہ سوال کر رہا ہے تو وہ (بلا ضرورت) لوگوں کو اپنے بار بار اور باصرار سوال سے پریشان کرنے والا سائل ہے[1]

(۱۷۳۳) عطاء بن یسار ایک اسدی سے روایت کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا تو ایک شخص آپؐ سے سوال کر رہا تھا، پھر انہوں نے مذکورہ بالا اوقیہ

---

[1] ابو داؤد میں بنی اسد کے ایک شخص روایت کرتے ہیں: میں اور میرے اہل و عیال بقیع الغرقد میں اترے۔ میرے گھر والوں نے کہا کہ تم رسول اللہؐ سے جا کر ہمارے کھانے کے لئے کچھ مانگ لاؤ۔ چنانچہ میں رسول اللہؐ کے پاس پہنچا۔ میں نے وہاں آپؐ سے ایک شخص کو مانگتے دیکھا۔ رسول اللہؐ اسے یہ جواب دے رہے تھے "میرے پاس تمہیں دینے کے لئے کچھ نہیں ہے،" وہ شخص غضب ناک ہو کر واپس ہو رہا تھا۔ اور کہہ رہا تھا: میری قسم۔ آپؐ جسے چاہتے ہیں دے دیتے ہیں"، رسول اللہؐ نے کہا "یہ اس لئے غصہ ہو رہا ہے کہ میرے پاس اسے دینے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ دیکھو تم میں سے جس کے پاس ایک اوقیہ یا اس کے مساوی قیمت کا سامان ہو تو اس کا مانگنا ہٹ دھرمی ہے" یہ سن کر میں نے اپنے دل میں کہا ہمارے پاس جو اونٹنی ہے۔ وہ تو اوقیہ سے زیادہ قیمتی ہے۔ اوقیہ تو چالیس درہم کا ہوتا ہے۔ پھر میں آپؐ سے کچھ مطالبہ کئے بغیر ہی واپس آ گیا۔ بعد ازاں حضورؐ کے پاس جو اور کشمش آئے تو آپؐ نے وہ ہم میں تقسیم فرما دیئے تا آنکہ اللہ نے ہمیں تونگر کر دیا۔" یہ روایت احمد اور نسائی میں بھی ہے

(از حاشیہ کتاب الاموال)

والی حدیث بیان کی۔

(۱۷۳۴) میمون بن مہران سے روایت ہے کہ ایک عورت زکواۃ مانگتے ہوئے حضرت عمرؓ بن الخطاب کے پاس آئی تو حضرت عمرؓ نے اس سے کہا: "اگر تیرے پاس ایک اُوقیہ ہے تو زکواۃ لینا تیرے لئے حلال نہیں ہے"۔ راوی کہتا ہے کہ ایک اوقیہ اس زمانہ میں چالیس درہم کے برابر تھا۔ اس پر اس عورت نے کہا: "میرا یہ اونٹ اوقیہ سے بہتر ہے"۔ اس روایت کے ایک راوی جعفر بن برقان کہتے ہیں کہ میں نے میمون سے دریافت کیا: "کیا حضرت عمرؓ نے اس عورت کو کچھ دیا تھا؟" تو انہوں نے کہا: "مجھے معلوم نہیں"۔

(۱۷۳۵) سہل بن الحنظلیہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس نے تونگری کے ہوتے ہوئے لوگوں سے سوال کیا تو وہ جہنم میں اضافہ کر رہا ہے"۔ میں نے دریافت کیا: "یا رسول اللہؐ تونگری ہوتے ہوئے" سے کیا مراد ہے؟ آپؐ نے فرمایا: "یہ کہ تمہیں معلوم ہو کہ تمہارے گھر میں گھر والوں کے لئے صبح یا شام کی خوراک موجود ہے[1]"۔

(۱۷۳۶) سہل بن الحنظلیہ انصاری کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو کثرت طلبی کے لئے تونگری کے باوجود سوال کرتا ہے تو وہ آگ کی کثرت طلب کر رہا ہے"۔ ایک شخص نے دریافت کیا: "تونگری کیا ہے؟" فرمایا: "صبح یا شام کا کھانا"۔

مختلف مقداروں کا تجزیہ اور اوقیہ کو ترجیح

ابو عبیدؒ: میرا خیال ہے کہ فقر و غنی کے درمیان فیصلہ کرنے والی یہ احادیث و روایات مختلف اوقات (ادحالات) کے مدنظر آتی ہیں، چنانچہ ایک روایت میں غنی کی تعبیر

---

[1] ابوداؤد میں یہ روایت ہے: رسول اللہؐ کے پاس عیینہ بن حصن اور اقرع بن حابس آئے اور انہوں نے آپؐ سے کچھ مانگا، جس کو آپؐ نے پورا کر دیا۔ ۔ ۔ ۔ اس روایت کے آخر میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: جس کے پاس بقدر آسودگی ہو اور پھر بھی وہ مانگے تو وہ آگ میں اضافہ کر رہا ہے۔ لوگوں نے دریافت کیا: یا رسول اللہؐ "بقدر آسودگی جس کے بعد سوال روا نہیں" کا کیا مفہوم ہے؟ آپؐ نے فرمایا: صبح شام کی خوراک جو اسے کافی ہو۔" (از حاشیہ کتاب الاموال)

حالت سدھر جانے ،، سے کی گئی ہے دوسری میں "پچاس درہم کی موجودگی ،، سے ، تیسری میں "ایک اُوقیہ کی موجودگی ،، سے اور چوتھی میں "صبح یا شام کی خوراک ،، سے ، اور ان میں سے ہر قول پر ایک جماعت نے اپنے مسلک کی بنیاد رکھی ہے ۔

(۱۷۳۷) جہاں تک قبیصہ بن مخارق کی حدیث ہے جس میں غنی کی تعبیر "حالت کے سدھرنے سے کی گئی ہے ۔ وہ ان تمام اقوال میں وسیع تر مفہوم رکھتی ہے ۔ لیکن اس میں نہ تو مال کی کوئی ایسی حد مقرر کی گئی ہے جس پر پہنچنے کے بعد سوال کرنا چھوڑ دیا جاتے ۔ نہ ہی وقت کی قید ہے کہ جس تک پہنچنے پر اس کی "حالت کا سدھار ،، پورا ہو جاتے ۔

جن حضرات نے اس پر اپنے مسلک کی بنیاد رکھی ہے ۔ وہ اس کی توجیہ میں کہتے ہیں کہ اس سے مراد ہے درختوں والی زمین کا اتنا بڑا سرسبز ٹکڑا جس کی آمدنی اُسے اور اہل وعیال کو سال بھر تک گذر بسر کے لئے کافی ہو ۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ جب وہ شخص ایسے زمین کے ٹکڑے کا مالک ہو جائے تو پھر اس پر زکوٰۃ حرام ہو جاتی ہے اور اس سے پہلے پہلے زکوٰۃ اس کے لئے حلال ہے ۔

ابو عبیدؒ : لیکن مجھے یہ تاویل پسند نہیں کیونکہ یہ علماء کا طریق کار اور ان کا مذہب نہیں ہے ۔

(۱۷۳۸) دوسری طرف سہل بن الحنظلیہ کی صبح یا شام کی خوراک کی موجودگی والی حدیث ہے جس میں اس بارے میں سب سے زیادہ تنگی پائی جاتی ہے ۔ جہاں تک میرا خیال ہے اس کی توجیہ یہ نہیں کہ جو صبح یا شام کی خوراک کے سوا دنیا کی کسی چیز کا بھی مالک نہیں ہو ۔ اس پر زکوٰۃ حرام ہے ۔ نہ ہی اس کے یہ معنی ہیں کہ اگر ایسے شخص کو جو صبح یا شام کی خوراک سے زیادہ کا مالک ہو زکوٰۃ دیدی جائے تو وہ تونگر کو دیئے جانے کی وجہ سے زکوٰۃ دینے والے کو سودمند نہ ہو گی ۔ بلکہ ہماری رائے میں اس کے معنی اسی حدیث کے تشریحی الفاظ "جو کثرت طلبی کے لئے سوال کرے ،، کے بموجب یہ ہیں کہ اگر سائل کا مقصد سوال سے یہ نہ ہو کہ اپنی ضروریات بھر پا لینے کے بعد سوال سے باز رہے بلکہ وہ اسے ہمیشہ کے لئے مال بڑھانے اور کھانے پینے کا ذریعہ بنا رہا ہے تو وہ جہنم میں اضافہ کر رہا ہے خواہ وہ نادار ہی کیوں نہ ہو اور صبح یا شام کی خوراک کے برابر بھی نہ رکھتا ہو ۔ واللہ اعلم

ملاحظہ فرمایئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں سوال میں "کثرت طلبی" کی شرط رکھی ہے، اور اس مضمون کو مندرجہ ذیل احادیث و روایات کے مضامین سے مماثلت حاصل ہے:

(۱۷۳۹) حُبشی بن جُنادہ سُلولیؓ — جو حجۃ الوداع میں شریک تھے — کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس نے فقر و احتیاج کے بغیر دست سوال دراز کیا وہ آگ کھا رہا ہے۔"

(۱۷۴۰) شعبی کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ "جس نے اپنا مال بڑھانے کے لئے لوگوں سے سوال کیا۔ تو وہ (بھیک) جہنم کا تپتا پتھر ہے۔ جسے وہ لقمہ بنا رہا ہے۔ اب جو چاہے اس میں سے کم لے اور جو چاہے زیادہ لے لے۔"

ابو عبیدؒ: میرے خیال میں ان روایات کا محوری نقطہ یہ ہے کہ زکواۃ مانگ کر دولت بڑھانا یا اسے ذریعہ اکتساب بنا کر غنیمت بنا لینا ناپسندیدہ کام ہے۔ یہ تمام سخت گیری اور وعید خود سائل کے خلاف ہے۔ اب رہا وہ شخص جو ایسے سائل کو اپنے مال کی زکواۃ دیدیتا ہے۔ جس کے پاس صبح یا شام کے کھانے سے زائد مال موجود ہو تو معطی کو اس کی زکواۃ کفایت کرے گی۔ اِنشاءاللہ۔

اسی فیصلہ پر لوگوں کا عمل ہے اور علماء کا یہی فتویٰ ہے۔

(۱۷۴۱) جہاں تک عبد اللہ کی پچاس درہم کی موجودگی کا تعین کرنے والی حدیث اور اسدی کی ایک اوقیہ کی شرط والی حدیث کا تعلق ہے۔ تو غنی اور فقر کے درمیان حدِ فاصل کے سلسلہ میں اکثر فقہا کی طرح میں بھی اسی حد پر ٹھہرتا ہوں، یہی وہ مقدار ہے جس کے برابر ہونے پر زکواۃ حرام اور جس سے کم ہونے پہ زکواۃ حلال ہو جائیگی۔

(۱۷۴۲) چنانچہ سفیانؒ عبد اللہ کی حدیث پر اعتماد کرتے ہوئے اس شخص کو زکواۃ کا مستحق نہیں سمجھتے۔ جس کے پاس پچاس درہم یا اس سے زائد ہوں۔

(۱۷۴۳) اور جہاں تک میرا علم ہے مالک بن انسؒ، اسدی کی ایک اوقیہ والی حدیث سے استدلال کرتے تھے، اس لئے کہ وہ خود بھی اسے زید بن اسلم سے روایت کرتے تھے۔

(۱۷۴۴) **ابوعبیدؒ**:۔ اور بعض راویوں نے ان سے یہ روایت کی ہے کہ اس بارے میں انہوں نے کوئی حد مقرر نہیں کی اور ان کا یہی قول میرے نزدیک ارجح و محفوظ ہے

(۱۷۴۵) **ابوعبیدؒ**:۔ مذکورہ بالا دونوں احادیث میں سے اوقیہ والی حدیث مجھے زیادہ اچھی اور سنداً اصح معلوم ہوتی ہے، اگرچہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی کا نام مذکور نہیں، تاہم یہ متیقن ہے کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے اور آپؐ کے منہ سے یہ حدیث سنی ہے۔

اس حدیث کی یہی صورت مالک اور لیث بن سعد کی روایت کردہ احادیث میں ہے گو علماء نے اس کی حدیث گوارا کرلی ہے۔

لیکن بایں ہمہ اس کی تائید میں ہمیں ایک اور حدیث ملتی ہے۔

(۱۷۴۶) ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے کہا: "یارسول اللہؐ! میرے پاس ایک دینار ہے، آپؐ نے فرمایا! اسے اپنے اوپر خرچ کرو، اس شخص نے کہا: میرے پاس دوسرا ہے، آپؐ نے فرمایا: اسے اپنے گھر والوں پر خرچ کرو، اس شخص نے کہا میرے پاس ایک اور ہے، آپؐ نے فرمایا: اسے اپنی اولاد پر خرچ کرو۔ اس شخص نے کہا میرے پاس ایک اور ہے آپؐ نے فرمایا: اسے اپنے خادم پر خرچ کرو۔ پھر اس شخص نے کہا میرے پاس ایک اور ہے آپؐ نے فرمایا: تم اس کے مصرف کو زیادہ سمجھ سکتے ہو۔"

ابوعبیدؒ:۔ ملاحظہ فرمایئے اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے چار دینار تک اپنے اور اپنے بال بچوں پر خرچ کرنے کا حکم دے رہے ہیں، واضح رہے کہ چار دینار برابر ہیں ایک اوقیہ کے، اس لئے کہ ایک دینار دس درہم کے مساوی ہوتا ہے۔ پھر جب اس مقدار سے رقم زائد ہوتی ہے تب آپؐ نے اسے یہ کہتے ہوئے صدقہ کے معاملہ میں اختیار سونپ دیا کہ تم اس کے مصرف کو زیادہ سمجھ سکتے ہو۔ یعنی اب تمہاری مرضی ہے جی چاہے تو اسے صدقہ کردو، اس لئے کہ آپؐ نے ایک اوقیہ سے پہلے پہلے اسے فقیر خیال فرمایا۔ اور اس کے بعد غنی۔

(۱۷۴۷) آپ کی ایک اور حدیث سے بھی اس مضمون کی شرح ہو رہی ہے

آپؐ نے فرمایا: صدقہ تونگری کے بعد دیا جاتا ہے اور اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے، اور پہلے ان پر خرچ کرو جن کی تم کفالت کر رہے ہو"۔

۱۷۴۸]
۱۷۴۹] ابوعبیدؒ یہ حدیث دو سندوں سے حضرت ابوہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ نیز ایک اور سند سے اسے حکیم بن حزام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیںؓ۔

اسی طرح ہماری مذکورہ حضرت عمرؓ والی روایت بھی اُوقیہ سے متعلق ہے۔

یہ اوقیہ گھر، لباس خادم (غلام) اور گھر کے ضروری اسباب کے علاوہ ہونا چاہیئے

بنا بریں ہم بھی اسی قول کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس حدیث کی صحیح توجیہ یہ ہوگی کہ یہ اوقیہ جس کا وہ شخص مالک ہو، اس گھر کے علاوہ ہو جو اسے اور اس کے بال بچوں کو پناہ دے رہا ہو۔ نیز ان سب کے ضروری لباس کے علاوہ ہو۔ اور اس غلام کے بھی علاوہ ہو جس کی انہیں کام کاج کے لئے ضرورت رہتی ہے یہی کچھ حسن سے مروی ہے!

(۱۷۵۰)۔ ربیع بن صُبیحؒ کہتے ہیں کہ حسنؒ سے ایک ایسے شخص کے بارے میں دریافت کیا گیا جس کے پاس گھر ہو اور کام کاج کے لئے خادم بھی ہو (کیا وہ زکوٰۃ لے سکتا ہے؟) تو انہوں نے کہا: "اگر وہ ضرورتمند ہو تو زکوٰۃ لے سکتا ہے، اور اس پہ اس بارے میں کوئی تنگی نہ ہوگی"۔

لہ یہ روایت احمد اور دار قطنی نے باسناد صحیح یوں بیان کی ہے: "بہترین صدقہ وہ ہے جو اپنی آسودگی کے بعد دیا جائے"، اسی روایت میں ہے کہ آپ سے دریافت کیا گیا۔ یا رسول اللہؐ میں کس کی کفالت کروں؟" آپؐ نے فرمایا: "اپنی بیوی کی، کیونکہ وہ کہتی ہے: مجھے کھلاؤ یا مجھ سے الگ ہو جاؤ۔ پھر اپنی کنیز کی کہ وہ کہتی ہے مجھے کھلاؤ اور مجھ سے کام لو۔ پھر اپنی اولاد کی کہ وہ کہتے ہیں: "ہمیں کس کے حوالے کر رہے ہو؟ ابن تیمیہ نے منتقیٰ میں لکھا ہے یہ روایت شیخین نے اور امام احمد نے ایک سند سے بیان کی ہے لیکن ان حضرات نے اس روایت کے تفسیری جملوں کو ابوہریرہؓ کا قول بتایا ہے۔

(ماخذ حاشیہ کتاب الاموال)

ابو عبیدؒ:- اب اگر کسی شخص کے پاس حسب ضرورت رہائش گاہ اور لباس و خادم کے علاوہ ایسی چیز ہو جس کی قیمت ایک اوقیہ ہو جاتی ہو۔ تو اس کے لئے زکوٰۃ حلال نہ ہو گی۔ خواہ وہ سیم وزر (نقدی) کی صورت میں نہ ہو، اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: "جس کے پاس ایک اوقیہ یا اس کے مساوی ہو"۔

عمر بن عبدالعزیزؒ سے بھی یہی مضمون مروی ہے۔

(۱۷۵۱) لیث بن سعد کہتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے تحریر کیا تھا۔ "تاوان زدہ (اور قرضدار) لوگوں کے ذمہ کی رقم ادا کر دو"، اس پر انہیں لکھا گیا "اگر ہم ایسے شخص کے پاس مکان، خادم، گھوڑا، اور گھر کا اسباب (فرنیچر وغیرہ) پائیں (تب بھی اس کے ذمہ کی رقم ادا کر دیں؟) تو عمرؒ نے انہیں جواب میں لکھا: "مرد مسلم کے پاس رہنے کے لئے مکان، کام کاج کے لئے خدمت گار، اپنے دشمن سے جہاد کرنے کے لئے گھوڑا اور اپنے گھر کا اسباب (فرنیچر) تو ضروریات میں سے ہے، ہاں، (ان تمام چیزوں کی موجودگی کے باوجود بھی) اس کا بار ادا کر دو اس لئے کہ بلاشبہ وہ تاوان زدہ و مقروض ہے"۔

جہاد (اور سواری) کیلئے گھوڑا بھی مستثنیٰ ہے

ابو عبیدؒ: ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ عمرؒ اس بارے میں بقدر کفایت کی شرط لگا رہے ہیں جس کے بغیر اس شخص کا کام نہ چل سکے، اور اس حد کے اندر اسے زکوٰۃ لینے کی اجازت دے رہے ہیں، اور اس کے بعد وہ اس کے لئے زکوٰۃ حلال نہیں کرتے۔

ہمارا مذکورہ حسنؒ کا قول بھی اس سے مشابہ ہے: تاہم یہ زیادہ واضح شرح پیش کر رہا ہے۔

(۱۷۵۲)۔ اس تونگری اور بقدر ضرورت ہونے کی شرط کے علاوہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس شخص کے لئے جس پر زکوٰۃ حلال ہو۔ ایک اور شرط بھی ملتی ہے اور وہ آپؐ کے اس فرمان میں ہے۔ زکوٰۃ تونگر کے لئے حلال

نہیں۔ اور نہ طاقت ور کمانے کی طاقت رکھنے والے کے لئے" دوسری جگہ آپؐ نے فرمایا: "اور نہ طاقت ور تندرست کے لئے جس کے ہاتھ پیر چلتے ہوں۔"

(۱۷۵۳) ابو عبیدؒ: میرا خیال ہے کہ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کو زکوٰۃ کے حرام ہونے میں یکساں قرار دیدیا، نیز تونگری اور کمانے کی طاقت کو دو برابر کی حیثیتیں دیدیں، خواہ طاقتور مالدار نہ ہو۔ بہرحال اب یہ دونوں برابر ہیں۔ الایہ کہ اس طاقتور کے کمائی کے ذرائع منقطع ہوں اور وہ امکانی کوشش کے باوجود محروم رہتا ہو اور اپنے بال بچوں کے گذارہ بھر کا نہ پاتا ہو۔ اندریں حالات اسے مندرجہ ذیل فرمانِ الٰہی کے بموجب مسلمانوں کے اموال میں سے لینے کا حق پہنچے گا

المحروم کا مفہوم

وَفِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ اور ان کے اموال میں حق ہے
لِلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (الذّٰریات: ۱۹) سائل اور محروم کے لئے

(۱۷۵۴) سعید بن جبیرؒ، ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ اس آیۂ کریمہ میں "اَلْمَحْرُوْم" سے مراد ہے وہ شخص جو امکانی کوشش کے باوجود گذارہ بھر نہ پاسکے۔

(۱۷۵۵) قیس بن کُرکُم سے روایت ہے کہ میں نے ابن عباسؓ سے اس (محروم) کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا "سائل تو سوال کرنے والا ہے اور (محروم وہ امکانی کوشش کرنے کے باوجود ناکام ہونے والا ہے جس کے لئے اسلام میں کوئی حصہ مقرر نہیں ہے"

(۱۷۵۶) حسن بن محمد بن الحنفیہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک گشتی دستہ روانہ کیا جسے کچھ غنیمت ہاتھ لگی، پھر کچھ ایسے لوگ آگئے جو غنیمت "(حاصل کرتے وقت دستہ) میں موجود نہ تھے، تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی

وَفِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ اور ان کے اموال میں حق ہے
لِلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (الذّٰریات: ۱۹) سائل کا اور محروم کا۔

بعض علماء عراق کی تونگری و فقر کی تعریف اور اُس پر بحث

(۱۷۵۷) ابو عبیدؒ: سفیانؒ کے علاوہ متعدد علماء عراق

کا قول ہے کہ زکواۃ اس شخص کے لئے حلال ہے جو دو سو درہم سے کم کی ملکیت رکھتا ہو ان کا کہنا ہے کہ یہ اس وجہ سے کہ اتنی ملکیت والے پر زکواۃ واجب نہیں ہوتی، اس بارے میں انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے۔ جس میں آپؐ نے زکواۃ (وصدقہ) وصول کرنے کے لئے ان الفاظ میں حکم دیا ہے "یہ زکواۃ ان کے تونگروں سے لی جائیگی اور ان کے فقراء میں پلٹا دی جاتے گی۔"

اس حدیث سے یہ استنباط کرتے ہیں کہ تونگری اور فقر کے درمیان حد فاصل زکواۃ کا واجب ہونا اور زکواۃ کا معاف ہونا ہے اور یہ ایسا مسلک ہے جس کا وزن ہوتا بشرطیکہ اس پر یہ اعتراض وارد نہ ہو سکتا۔

(۱۷۵۸) کہ اگر ایک شخص بہت بڑی مقدار میں اموال کا مالک ہو جس میں جائیداد غلام اور سامان تجارت اتنی مقدار میں ہو کہ اس کے تھوڑے سے حصہ میں ہی تونگری کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہو، لیکن بایں ہمہ جب سال ختم ہونے لگے تو اس کے پاس سیم وزر کی صورت میں دو سو درہم موجود نہ ہوں، اندریں صورت اس شخص کو جو تونگری وفقر میں حد فاصل "زکواۃ کا واجب ہونا" قرار دیتا ہے یہ چاہیئے کہ وہ اس شخص کو ایسا فقیر شمار کرے جسے زکواۃ دی جائے اور اس لئے کہ اس مذکور شخص پر زکواۃ واجب نہیں ہوئی اسے زکواۃ دینے والے کی زکواۃ صحیح جگہ پہنچنے کی وجہ سے معطی کا فرض ادا ہو جائے گا۔ خواہ اس شخص کے اموال کی قیمت ہزاروں دو سو کے برابر ہی کیوں نہ ہو، لیکن ہمارے علم میں کوئی شخص ایسا نہیں جو اس قسم کا مسلک رکھتا ہو یا جس نے ایسا فتویٰ دیا ہو۔

ہماری نظر میں اس فقر و غنا کے بارے میں حد فاصل وہی ہے جسے سُنّت نے متعین و مقرر کر دیا ہے۔ یعنی ایک اوقیہ یا اس کے مساوی مال کی ملکیت"

حضرت عمرؓ کی روایت کہ قحط سالی میں ایک ریوڑ بکریوں کا مالک زکواۃ لے سکتا ہے اور اس پر کلام

(۱۷۵۹) اب رہی حضرت عمر بن الخطابؓ کی روایت جس میں وہ کہتے ہیں لا زکواۃ

میں سے اس شخص کو دو جس کے پاس قحط سالی بھیڑ بکریوں کا ایک ریوڑ چھوڑ دے، اور اس شخص کو زکوٰۃ نہ دو جس کے پاس قحط سالی دو ریوڑ (بھیڑ بکریوں کے) چھوڑ دے"

(۱۷۶۰) مذکورہ بالا روایت کے ایک راوی اسماعیل بن ابراہیم نے کہا ہے. ابن ابی نجیح نے ایک ریوڑ کی تعریف یہ کی ہے کہ ایک سو بھیڑ بکریاں اور دو ریوڑوں کی دو سو بھیڑ بکریاں۔

ابو عبیدؒ: اس سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ سو بکریوں کے مالک کو بھی زکوٰۃ لینا مباح ہے، حالانکہ ان کی قیمت تو بہت سے اوقیوں کے مساوی ہو گی.

لیکن یہ روایت بغیر اسناد کے مرسل ہے، تاہم اگر حضرت عمرؓ سے اس کی نسبت صحیح طور پر ثابت ہو جاتے تو میرے نزدیک اس کی توجیہ یہ ہو گی کہ یہ رخصت قحط سالی کے دوران ہو گی، اس لئے کہ اس روایت میں قحط سال کے لئے "سَنَة" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس (کے ایک معنی اگرچہ سال ہیں تاہم یہاں اس) کے معنی قحط سالی اور خشک سالی ہیں جو لوگوں کے مال اور مویشی غارت کر دیتی ہے اور ایک بھی گو دے دار (تر و تازہ) دودھ دینے والا جانور باقی نہیں چھوڑتی اسی طرح یہ پھلوں اور کھیتوں کو بھی جلا ڈالتی ہے (سَنَة" کی جمع سِنُونَ و سِنِینَ ہے، اسی معنی میں) اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا ہے

وَلَقَدْ اَخَذْنَا آلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِنَ الثَّمَرَاتِ (الاعراف: ۱۳۰) اور ہم نے آل فرعون کو قحط سالیوں اور پھلوں کی قلت میں گرفتار کر دیا!

چنانچہ ان حالات میں حضرت عمرؓ کی رائے یہ ہو گئی تھی کہ سو بھیڑ بکریوں کے مالک کو بھی زکوٰۃ دیدی جائے. چنانچہ ان کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے:

مَنْ اَبْقَتْ لَهُ السَّنَةُ غَنَماً: جس کے لئے قحط سالی ایک ریوڑ بھیڑ بکریوں کا چھوڑ دے (یعنی سو عدد) جس میں خاص طور پر "سَنَة" کی شرط ہے، اس لئے کہ قحط سالی میں یہ سو بھیڑ بکریاں جو بھوک اور قحط سے لاغر و نڈھال ہوں سرسبزی کے زمانہ کی دس بکریوں کی برابری نہیں کر سکتیں۔ بنا بریں انہوں نے لوگوں پر نرمی و مہربانی کرتے ہوئے سو بکریوں کے مالک کو بھی زکوٰۃ

قحط سالی کے باعث زکوٰۃ کی وصولی ملتوی کرنا

لینے کی اجازت دیدی۔ بلکہ انہوں نے اس سے بھی بڑھ کر یہ کیا کہ قحط سالی میں لوگوں سے زکوٰۃ کی وصولی کو موخر کر کے اگلے سال پر ملتوی کر دیا، اور جب تک بارش سے سیرابی و سرسبزی نہ ہوتی انہوں نے زکوٰۃ وصول نہ کی۔

قحط سالی میں قطع ید کی ممانعت

یہ بحث ہم کسی اور موقع پر بیان کر آئے ہیں (دیکھیئے نمبر ۹۷۵ تا ۹۸۵) یہی نہیں بلکہ ان کی خیرخواہی میں آپ کی معاملہ فہمی اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ آپ نے ایسے قحط کے زمانہ میں چوروں سے ہاتھ کاٹنے کی حد بھی ہٹا دی تھی اور فرمایا تھا: "قحط سالی کے زمانہ میں ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں دی جاتے گی۔"

ایسے ہی وجوہ کی بناء پر انہوں نے سو بکریوں کے مالک کو زکوٰۃ لینے کی اجازت دے دی ہوگی۔

باب

زکوٰۃ میں سے ایک شخص کو کم از کم کتنا دیا جائے اور زیادہ سے زیادہ کتنی مقدار اس کے لئے روا ہوگی

زکوٰۃ بقدر سرمایہ نہ دی جائے
اس ضمن میں اختلافات

(۱۷۶۱) ابراہیم کہتے ہیں" (علماء دین) اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ زکوٰۃ میں سے اتنی مقدار لوگوں کو دی جائے کہ وُہ سرمایہ بن جائے"۔

(۱۷۶۲) ابو عبیدؒ:۔سفیانؒ زکوٰۃ میں سے کسی کو پچاس درہم سے زیادہ دینا ناپسند کرتے تھے۔ اسی طرح ان کی رائے یہ تھی کہ جو پچاس درہم کا مالک ہو اسے زکوٰۃ نہیں دی جائے گی اپنے اس فیصلہ میں وہ صرف قرض دار (یا تاوان زدہ) کو مستثنےٰ قرار دیتے تھے اور ان کا قول تھا کہ ایسے شخص کا قرض (یا بار تاوان) ادا کر دیا جائے گا خواہ وہ اس مقدار سے زیادہ ہی کیوں نہ ہو۔

ابو عبیدؒ:۔اس طرح سفیانؒ نے عطیہ کی مقدار کو دیئے جانے والے کی سابقہ ملکیّت سے مشابہ قرار دیا ہے۔

یہ ایک مسلک ہے اور اس شخص کے لئے ایک قابل تقلید نمونہ ہے جو اس پر عمل کرنا اور اس پر اتباع کرنا چاہتا ہے۔

(۱۷۶۳) سفیانؒ کے علاوہ اس بارے میں بقیہ تمام اہل عراق کا بھی یہی مسلک ہے کہ دی جانے والی رقم سابقہ ملکیت سے مشابہ قرار دی جائے۔ البتہ انہوں نے اس رقم کا تعین

(بجائے پچاس درہم کے) دوسو درہم کیا ہے ۔بنا بریں ان کا کہنا ہے کہ کسی (سائل) کو بھی دو صد (درہم) سے زیادہ نہیں دیا جائے گا۔ ایسے ہی اگر اس کے پاس دو صد درہم ہوں تو اسے زکواۃ لینا حلال نہ ہوگی۔

(۱۷۶۴) ضحاک بن مزاحم سے بھی ایسا ہی قول مروی ہے۔

(۱۷۶۵) لیکن مالک بن انس کے نزدیک اس بارے میں کوئی معین حد نہیں ہے ان کا قول تھا "میرے خیال میں دینے والے کو چاہیئے کہ وہ اس بارے میں پوری چھان بین اور حسن نظر سے کام لے۔"

زکواۃ دینے کی کوئی حد متعین نہیں

ابو عبیدؒ: مذکورہ بالا احادیث کا غائر مطالعہ ہمیں اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ ان میں اس بارے میں کوئی حد بندی نہیں کی گئی البتہ سنت اتنی قید ضرور لگاتی ہے کہ جسکو دیا جائے اگر اس کے پاس عطیہ سے قبل ایک اوقیہ ہو تو وہ زکواۃ کا مستحق نہیں لیکن جبکہ اسکو دیا جا رہا ہو وہ فقیر ہو اور مستحق زکواۃ وصدقہ ہو تو ان آثار میں ہمیں کوئی ایسی دلیل نہیں ملتی جس کی بنا پر ہم عطیہ کی مقدار محدود کر سکیں اس کے برخلاف ہمیں ایسی روایات ملتی ہیں جن میں زیادہ دینے کی فضلیت ہے اور اسے پسندیدہ و مستحب قرار دیا گیا ہے۔

(۱۷۶۶) انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی کہ:-

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا ۔ (البقرۃ ۲: ۲۴۵)	کون ہے جو اللہ کو اچھا قرض دے

نیز یہ آیت کریمہ!

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (آل عمران ۳: ۹۲)	تم جبھی بھلائی اسوقت تک ہرگز نہیں پاؤ گے تاآنکہ تم ان چیزوں میں خرچ نہ کرو جو تمہیں محبوب ہیں۔

توحضرت ابوطلحہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا "فلاں فلاں مقام پر میرا جو باغ ہے وہ اللہ کے لئے ہوگیا ۔ اللہ کی قسم یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر میں اس عطیے کو چھپا سکتا تو میں اس کا اعلان نہ کرتا" اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اس باغ کو اپنی قوم کے فقیروں میں تقسیم کردو"۔

(۱۷۶۷) اسی حدیث میں انس بن مالک رضؓ کہتے ہیں کہ حضرت ابو طلحہ رضؓ نے وہ باغ اُبیؓ بن کعبؓ اور حسّان بن ثابت رضؓ کے درمیان تقسیم کر دیا۔

ابو عبید :- باغ سے مراد کھجور کے نیز دیگر پھل دار درختوں اور کھیتوں پر مشتمل قطعۂ زمین ہے۔ ایسے قطعۂ زمین کی قیمت آپ کے اندازہ کے مطابق کیا ہوگی ؟ پھر یہ بھی نہ بھولئے کہ یہ باغ اپنی شہرت و گرانقدری کے لحاظ سے ایسی صورت اختیار کر چکا تھا کہ حضرت ابو طلحہ رضؓ اسے لوگوں سے چھپا کر نہیں دے سکتے تھے۔ بایں ہمہ انہوں نے اسے دو آدمیوں میں تقسیم کر دیا جس میں کوئی تیسرا نہ تھا۔

(۱۳۶۸) ابو عبیدؒ :- یہ صدقہ اگرچہ (فرض نہ تھا بلکہ) رضاکارانہ (نفل) تھا تاہم اسکی اور فرض صدقہ (یعنی زکوٰۃ) کی حیثیت برابر ہے۔ اس لئے کہ جب زکوٰۃ جسے اللہ نے حتماً مالداروں کے اموال میں فقراء کے لئے مقرر فرما دیا ہے اسی کی زیادہ مقدار لینے والے کے لئے حرام ہو جاتی ہے تو رضاکارانہ خیرات وصدقہ کا زیادہ حصّہ لینا تو ان فقراء کے لئے بدرجہ اولیٰ حرام ٹھہرے گا۔ لیکن اگر یہ ان لوگوں کے لئے حلال ہو گیا اور رضاکارانہ صدقہ دینے والا اندریں صورت نیکوکار و محسن ٹھہرا تو پھر یقیناً ایسی صورت میں معطی فرض زکوٰۃ ادا کرنے میں اور بھی نیکوکار ٹھہرے گا۔

خرچ کرنے میں نفل خیرات وصدقہ اور فرض زکوٰۃ کی یکساں حیثیت

ابو عبیدؒ :- اس بات کا ثبوت، کہ نفل خیرات وصدقہ اور فرض زکوٰۃ (صدقہ) دونوں کی برابر حیثیت ہے حضرت سلمانؓ کی، یہ روایت پیش کر رہی ہے جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کر رہے ہیں۔

(۱۷۶۹) ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ مجھ سے سلمانؓ نے یہ واقعہ بیان کیا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ کھانے کی چیز لے گیا۔ اور میں نے عرض کی "یہ صدقہ ہے اور میں غلام ہوں" تو آپؐ نے صحابہؓ کو حکم دیا کہ وہ اسے کھائیں، لیکن آپؐ نے ان کے ساتھ خود اس میں سے نہ کھایا۔ پھر میں آپؐ کے پاس کچھ کھانے کی چیز (دوبارہ) لے گیا اور میں نے عرض کی "یہ ہدیہ ہے جو میں آپؐ کی خدمت میں آپؐ کے اعزاز و اکرام کے لئے پیش کر رہا ہوں، اس لئے کہ میں

نے دیکھا کہ آپؐ صدقہ نہیں کھاتے ہیں" چنانچہ آپؐ نے اپنے صحابہؓ کو حکم دیا کہ وہ اسے کھائیں اور خود آپؐ نے بھی ان کے ساتھ کھایا۔

ابوعبید: ملاحظہ فرمائیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صدقہ کے استعمال سے کس طرح باز رہے اور یہ واقعہ اس وقت کا ہے جبکہ حضرت سلمانؓ مشرف باسلام نہیں ہوئے تھے یہ واقعہ اسی طرح ان کی ایک طویل حدیث میں مذکور ہے اس طرح حضرت سلمانؓ نے آپؐ کی نبوت کا امتحان لینا چاہا تھا کیونکہ جو نشانیاں انہیں اہلِ کتاب سے معلوم ہوئی تھیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ وہ نبیؐ ہدیہ کھائے گا اور صدقہ نہیں کھائے گا۔ یہاں ایک ایسے شخص سے جو ابھی اسلام بھی نہ لایا ہو زکواۃ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جس کا استعمال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ فرمایا ہو؟

پھر ہمیں آپؐ کی ایک دوسری حدیث سے صدقہ کے معنی بالتفصیل معلوم ہوتے ہیں نیز اس میں اور ہبہ میں امتیازی فرق معلوم ہوتا ہے۔

صدقہ اور ہدیہ کا فرق (۱۷۷۰) عبدالرحمٰن بن علقمہ سے روایت ہے کہ ثقیف کا ایک وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا وہ اپنے ساتھ کچھ ہدیہ لائے تھے، آپؐ نے ان سے دریافت فرمایا "یہ کیا ہے؟ ہدیہ ہے یا صدقہ؟ صدقہ وہ ہوتا ہے جو اللہ کی خوشنودی و رضاجوئی کے لئے دیا جائے اور ہدیہ سے خوشنودیِ رسول مراد ہوتی ہے نیز حاجت برآری اور ضرورت پوری کرنا مطلوب ہوتا ہے۔" تو انہوں نے کہا "یہ ہدیہ ہے" چنانچہ آپؐ نے ان سے وہ قبول فرما لیا پھر ان لوگوں نے آپؐ کو اپنے مسائل و مطالبات میں مشغول رکھا تا آنکہ آپؐ نے نماز ظہر، عصر کے وقت ادا فرمائی۔

ابوعبید: یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بغیر کسی خصوصیت کے عمومی طور پر یہ بتایا کہ صدقہ سے مراد وہ چیز ہے جس سے اجر و رضائے الٰہی مطلوب ہو، اور آپؐ نے اس ضمن میں فرض و نفل کا کوئی امتیاز نہ فرمایا ساتھ ہی آپؐ نے ہدیہ کو صدقہ کے علاوہ کوئی اور چیز قرار دیا۔

(۱۷۷۱) یہی وہ چیز ہے جس کی ہم پیروی کرتے ہیں اور جس کے مطابق ہم فیصلہ کرتے ہیں یعنی یہ کہ ہم کسی تونگر کے لئے صدقہ (زکواۃ و خیرات) کا وصول کرنا پسند نہیں کرتے خواہ وہ

صدقہ رضا کارانہ (نفل) ہو یہ میرا ایک پسندیدہ طریقہ ہے جسے میں مکروہات سے اجتناب کرتے ہوئے اختیار کرتا ہوں اگرچہ یہ قطعی (فرض شدہ) حرام کے درجہ پر نہیں پہنچتا۔ بہر حال مجھے اس طرف سے خطرہ اور کھٹکا ہے ایک تو ان احادیث و روایات کی رو سے جو ہم اوپر بیان کر آئے ہیں نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کی بنا پر کہ "صدقہ کسی تونگر کے لئے حلال نہیں ہے"۔

(۱۷۷۲) آپ ہی بتائیے کہ اگر سینکڑوں اور ہزاروں کی ملکیت رکھنے والے کو کوئی شخص ایک درہم یا ایک روٹی اس صدقہ سے دے دے جس سے صرف اللہ کی رضا جوئی اور اس کا اجر مطلوب ہوتا ہے اور اس نیت کا علم خود اس شخص کو بھی ہو جسے وہ صدقہ دیا جا رہا ہو، کیا کوئی مسلمان بھی اسے گوارا کرے گا۔؟

یہی صورت اس وقت ہوگی جبکہ صدقہ کی نیت سے بہت سی نقدی یا جائداد یا جانور وغیرہ دیئے جائیں بلکہ زیادہ مقدار اور بھی زیادہ مکروہ ہوگی، اِلّا یہ کہ اس عطیہ سے مُعطی کی دلی نیت تو اپنی اولاد یا دیگر رشتہ داروں یا بیگانوں کے لئے تحفہ یا ہدیہ دینے کی ہو لیکن بظاہر وہ اسے صدقہ بتائے تاکہ جس کو دیا جا رہا ہے اسے وہ صدقہ کا یقین دلائے اور اس لئے بھی کہ وہ صدقہ اس پر واجب ہو تب اس فیصلہ میں کسی نظرثانی کی ضرورت نہیں۔ اندریں صورت وہ عطیہ اس کے لئے انشاء اللہ پاک و خوشگوار ہوگا۔

(۱۷۷۳) ابو عبیدؒ۔ تو جب صورتِ حال یہ ہے کہ فرض صدقہ (زکوٰۃ) اور نفل صدقہ (خیرات وعطیات)، دونوں کو تقسیم کرنے کا حکم یکساں ہے تو جس طرح رضا کارانہ (نفل صدقے د) عطیے میں سے زیادہ مقدار دینا جائز ہے زکات میں سے بھی دیا جا سکتا ہے بشرطیکہ جس کو دیا جا رہا ہو وہ اس وقت ضرورتمند و محتاج ہونے کی وجہ سے مستحق زکوٰۃ ہو یہ عمل ہماری اس مذکورہ حدیث کے مطابق ہو گا جس میں ابو طلحہؓ نے اپنا باغ ابی بن کعبؓ اور حسّان بن ثابتؓ کے درمیان تقسیم کر دیا تھا۔ وہ نفل صدقہ (خیرات وعطیات) کی حیثیت رکھتا تھا۔ (فرض زکوٰۃ نہ تھی) تاہم ہمیں خود زکوٰۃ کی تقسیم کے سلسلہ میں ایسی روایات ملتی ہیں۔

زیادہ مقدار زکوٰۃ دینے کا جواز جن سے زیادہ مقدار دیدینے کا جواز ثابت ہوتا ہے

(۱۷۷۴) جرادبن شبیط راوی ہیں کہ میں حضرت عمر بن الخطابؓ کے پاس تھا کہ ان کے پاس بظاہر ایک ہٹا کٹا کھاتا پیتا شخص آیا اور اس نے کہا "یا امیرالمومنین! میں مرگیا اور میرے بال بچے بھی تباہ و برباد ہو گئے" تو حضرت عمرؓ نے کہا "تم میں سے ایک شخص گھی کے کپّے کی طرح چکنا چپڑا آتا ہے اور کہتا ہے کہ میں مرگیا اور میرے بال بچے تباہ و برباد ہو گئے" پھر اسے قریب بلاتے ہوئے حضرت عمرؓ نے اپنا واقعہ یوں بیان کیا۔ میں اور میری ایک بہن اپنے والدین کے ایک اونٹ کو جسے پانی بھرنے کے کام میں لایا جاتا تھا چراتے تھے۔ ہماری ماں اپنی تہمد ہمیں پہنا دیتی تھی اور ہمیں میٹھی میٹھی اندرائن کے بیج کھانے کے لئے دیدیا کرتی تھی۔ ہم اپنے اس اونٹ کو لے کر نکلتے جب سورج نکل جاتا تو میں اپنی تہمد بہن کے پاس ڈال کر ننگا محنت کرنے لگتا۔ پھر ہم اپنی ماں کے پاس واپس جاتے اور وہ ہمارے لئے اندرائن کے بیجوں کا ہریرا تیار رکھتیں کیا سرسبز و شاداب زمانہ تھا وہ" پھر حضرت عمرؓ نے کہا "اسے صدقہ کے جانوروں میں سے ایک ربیع میں پیدا ہونے والی اونٹنی (جو ایک سال سے کم عمر کی ہوتی ہے) دے دو (راوی جرادبن شبیط کہتے ہیں) چنانچہ میں نے دیکھا کہ وہ اونٹنی اس طرح نکلی کہ اس کے پیچھے اس کی ماں اور اس کا باپ دونوں آرہے تھے راوی کہتے ہیں" اس دن اس شخص پر مجھے جتنی جلن آئی اتنی جلن کبھی کسی پر مجھے نہیں آئی تھی۔"

(۱۷۷۵) ایک اور سند سے بھی جرادبن (شبیط بن) طارق حضرت عمرؓ سے یہی مضمون روایت کرتے ہیں۔

ابو عبیدؒ:۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہاں حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو تین اونٹ دیدیئے ہیں اور یہ بڑی قیمت کا مال ہوتا ہے انہوں نے یہ اس لئے کیا تھا کہ اسے تنگ دستی اور عیالداری سے نکال کر آسودہ کر دیں۔ کیونکہ اس نے بال بچوں کی تباہی کا ذکر کیا تھا۔ اور حضرت عمرؓ کی رائے یہی تھی کہ جب دیا جائے تو آسودہ و تونگر کر دیا جائے۔

محتاج کو اتنا دیا جائے کہ وہ آسودہ و تونگر ہو جائے

(۱۷۷۶) عمرو بن دینار راوی ہیں کہ عمر بن الخطابؓ نے کہا "جب تم دو تو تونگر و آسودہ کر دو۔"

ابو عبید ؒ:۔ یہی نہیں بلکہ ان سے تو کچھ اس سے بھی بڑھ کر روایت ہے۔

سو اونٹ ہو جانے پر بھی زکوٰۃ کی توجیہ

(۱۷۷) مُرّہ راوی ہیں کہ حضرت عمرؓ نے زکوٰۃ پر مامور کارکنوں سے کہا" ان پر بار بار زکوٰۃ تقسیم کرو خواہ ان میں سے ایک کے پاس سو اونٹ ہی کیوں نہ ہو جائیں"

(۱۷۸) اسی سند کا ایک دوسرا راوی مُرّہ کے واسطے سے یہ روایت حضرت عمرؓ سے اس طرح بیان کرتا ہے۔" ہم بالضرور انہیں بار بار زکوٰۃ دیں گے خواہ ان میں سے ایک کے پاس سو اونٹ کیوں نہ ہو جائیں"

(۱۷۹) ابو عبید ؒ:۔ اس روایت کی اسناد میں کلام ہے اگر حضرت عمرؓ سے اس کی روایت "محفوظ" طور پر ثابت ہو تو میرے نزدیک اس کی توجیہ وہ نہیں ہو گی جو بعض لوگ کرتے ہیں۔ کہ زکوٰۃ میں سے اس شخص کو بھی دیا جائے گا جو سو اونٹ کا مالک ہو کیونکہ یہ تو قرآن و سنت کے خلاف ہے اور اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت عمرؓ ایسی بات کہیں۔ لیکن ہمارے خیال میں اس بات سے حضرت عمرؓ وہی کہہ رہے ہیں جو ہم بیان کر چکے ہیں یعنی یہ کہ حاجتمند اور فقیر کو زکوٰۃ میں سے محصلِ زکوٰۃ اتنی مقدار دیدے کہ وہ سو اونٹ تک پہنچ جائے تو جائز ہو گا۔

(۱۸۰) ابو عبید ؒ:۔ رہی وہ پہلی توجیہ جو بعض حضرات نے کی ہے وہ ناجائز ہے بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ پانچ اونٹوں کے مالک پر تو زکوٰۃ فرض ہو اور اس سے ان پر بطور زکوٰۃ ایک بکری لی جائے اور پھر اس پانچ اونٹوں کے مالک سے لے کر اسے سو اونٹوں کے مالک کو دیدیا جائے ؟! یہ ناممکن اور اسلامی فیصلہ کی حدود سے خارج ہے

(۱۸۱) الغرض ہمارے خیال میں ہماری تاویل کے مطابق حضرت عمرؓ نے عطیہ میں توسع کرتے ہوئے اسے سو کی تعداد تک بڑھا دیا یاد رہے کہ یہ عطیہ فرض زکوٰۃ میں سے ہو گا اس لئے کہ یہ عطیہ مویشیوں کی زکوٰۃ میں سے دیا گیا ہے۔

زکوٰۃ سے اتنی مقدار دی جائے کہ محتاج اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے

بنا بریں بعض تابعین اس طریقہ پر عمل پیرا تھے اور وہ تھوڑا دینے پر زیادہ دینے کو ترجیح دیتے تھے۔

(۱۷۸۲) عطاء کہتے ہیں جب کوئی شخص اپنے مال کی زکواۃ میں سے کسی مسلمان گھرانہ کو دے اور اتنا دے کہ ان کو سنبھال دے اور انہیں اپنے پیروں پر کھڑا کر دے تو یہ مجھے زیادہ پسند ہے۔

زکواۃ کی رقم سے غلام آزاد کرنا اور حج کرانا

ابو عبیدؒ :- اسی موضوع سے متعلق حضرت ابن عباسؓ کی وہ روایت بھی ہے جس میں غلام کو آزاد کرنے کا ذکر ہے۔

(۱۷۸۳) مجاہد کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ نے کہا "اپنے مال کی زکواۃ سے غلام کو آزاد کر دو"۔

(۱۷۸۴) مجاہد ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے کہ ایک شخص اپنے مال کی زکواۃ سے کسی کو حج کرا دے اور اس (زکواۃ کی رقم) سے غلام آزاد کرا دے۔

ابو عبیدؒ :- ظاہر ہے کہ ایک غلام کی جو کم از کم قیمت ہو سکتی ہے وہ بھی بہر حال دو سو درہم سے بہت زیادہ ہوگی۔

الغرض حضرت ابن عباسؓ ایک شخص کو اجازت دے رہے ہیں کہ وہ اپنی زکواۃ میں سے ایک غلام کی قیمت دے کر اسے آزاد کرا دے اگرچہ بعض فقہا اس مسلک کو نہیں اپناتے تاہم وہ قیمت کی بیشی کی وجہ سے اس عمل کو پسند نہیں کرتے بلکہ ان کی ناپسندیدگی کا سبب یہ ہے کہ اس طرح وہ (زکواۃ کی رقم دے کر آزاد کرانے کا والا شخص) آزاد کرانے کا شرف اور ولاء اپنے آپ سے وابستہ کرے گا۔[1]

بہر حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا قول زیادہ مستحق ہے کہ اس کی اتباع کی جائے۔

(۱۷۸۵) الغرض یہ تمام آثار ثبوت ہیں اس بات کا کہ محتاجوں اور فقیروں کو زکواۃ دینے کے لئے مسلمانوں پر کوئی حد مقرر نہیں ہے جس سے تجاوز نہ کیا جائے خواہ جسکو دیا جا رہا

---

[1] یعنی حق ولاء کی وجہ سے آزاد کرنے والا اپنے آزاد کردہ غلام کی میراث کا مستحق ہو جائے گا۔ اور اس طرح "زکواۃ ادا کرنے میں اس کا ذاتی مفاد بھی شامل ہو جائے گا۔

ہو وہ مقروض و تاوان زدہ نہ ہو بلکہ اس عمل کی انجام دہی میں محبت و ہمدردی اور فضل و احسان کارفرما رہے گا اس لئے کہ اس کا تعلق معطی کے صواب دید پر ہے جس میں وہ طرف داری نہ کرے نہ اپنی خواہش نفس کو ترجیح دے۔ اسے یوں سمجھئے کہ جیسے ایک شخص جو بہت مالدار ہو ایک مسلم گھرانہ کو ایسی فقیری و بے چارگی کی حالت میں دیکھے کہ ان کے پاس سر چھپانے کو گھر تک نہ ہو چنانچہ وہ اپنے مال کی زکوٰۃ میں سے انہیں ایک گھر خرید کر دیدے جس سے وہ سردیوں کی شدت اور گرمی کی تمازت سے محفوظ ہو جائیں یا مثلاً وہ دیکھے کہ ان کے بدن ننگے ہیں اور ان کے پاس کپڑے پہننے کو نہیں ہیں اور وہ ان کے لئے (اپنی زکوٰۃ میں سے) اتنے کپڑے مہیا کر دے جس سے نماز میں ان کی ستر پوشی اور گرمی سردی سے بچاؤ ہو جائے یا وہ ایسے غلام کو دیکھے جو بدسرشت مالک کے قبضہ میں ہو اور جو اپنے غلام پر ظلم و زیادتی کرتا ہو اور اسے (اپنی زکوٰۃ کی رقم سے) خرید کر آزاد کرا دے، یا وہ کسی نادار مسافر کو دیکھے جس کی منزل دور ہو اور اسے اس کے وطن تک پہنچانے کے لئے کرایہ پر یا خرید کر سواری کا بندوبست کر دے تو اس قسم کے سلوک جن کے لئے ظاہر ہے کہ بڑی رقمیں درکار ہیں اگر اس قسم کی امداد کرنے کے لئے معطی کا دل نفل صدقہ و خیرات و عطیات کرنے کو نہ چاہے اور وہ ان مدوں میں اپنے مال کی زکوٰۃ لگا دیتا ہے تو کیا اس سے اس کی فرض زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی؛ کیوں نہیں ضرور ادا ہو جائے گی۔ اور اللہ نے چاہا تو وہ محسن بھی مانا جائے گا۔

زکوٰۃ کی رقم میں سے بے گھر کو گھر اور ننگے کو لباس اور مسافر کو رسد اور سواری دینا

اور مجھے تو اندیشہ ہے کہ وہ شخص جو ایسے محسن معطی کو اس قسم کے کام انجام دینے سے روکتا ہے اور یہ جانتے ہوئے کہ معطی رضاکارانہ عطیات سے اتنی سخاوت نہ کر سکے گا۔ اپنے فتوی کے ذریعہ معطی کو ان مدوں میں فرض زکوٰۃ لگانے سے منع کرتا ہے تو یقیناً اس طرز عمل سے حقوق تلف ہوں گے اور مستحقین زکوٰۃ موت کے منہ میں چلے جائیں گے

باب

حکام کو زکوٰۃ دینا اور اس بارے میں علماء کے اختلاف کا بیان

عہدِ نبوت اور خلافت راشدہ میں زکوٰۃ سربراہ حکومتِ اسلامیہ یا اس کے نمائندوں کو دی جاتی تھی

(۱۷۸۶) ابن سیرین کہتے ہیں: "زکوٰۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کی جاتی تھی یا پھر اسے دی جاتی تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مامور ہوتا۔ آپؐ کے بعد حضرت ابوبکرؓ کو دی جاتی یا جسے وہ مامور کر دیتے ان کے بعد حضرت عمرؓ کو دی جاتی یا جسے وہ مامور کر دیتے۔ ان کے بعد حضرت عثمانؓ کو دی جاتی یا جسے وہ مامور کر دیتے۔

شہادتِ عثمانؓ کے بعد اختلاف

پھر اس بارے میں حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد لوگوں میں اختلاف رونما ہو گیا۔ لوگوں میں سے کچھ تو اپنی زکوٰتیں حکام ہی کو دیتے رہے اور کچھ اپنے طور پر اس کی تقسیم کر دیتے وہ لوگ جو حکام کو دیتے تھے انہی میں حضرت ابن عمرؓ بھی تھے[۱]۔ بعد ازاں ابن سیرین نے تنبیہ کرتے ہوئے کہا: جو شخص اپنے طور پر زکوٰۃ تقسیم کرے[۲] وہ اللہ

۱۔ اس سے واضح ہے کہ خیر القرون میں زکوٰۃ کا نظام حکومتِ اسلامی کی نگرانی میں تھا۔ اور جب بھی اسلامی نظام قائم کیا جائے گا زکوٰۃ کا بندوبست حکومتِ اسلامی کے ہاتھ میں رہے گا۔ مسلمان جب بھی اپنی ایک حکومت بنا لیں تو اس کے بعد انہیں اپنے طور پر زکوٰۃ دینے کا حق نہیں ہوگا۔ ۲۔ اپنے طور پر زکوٰۃ ادا کرنے کی اجازت اسی وقت ہوتی ہے جب مسلمانوں کی منظم حکومت نہ ہو یا حکومت میں تنازعہ ہو اور طوائف الملوکی کا دور دورہ ہو۔

سے ڈرتا رہے۔ اور کسی جماعت پر کسی بات میں اظہارِ عتاب نہ کرے حالانکہ بعد میں وہ خود بھی ویسی ہی بات کرے یا اس سے بھی بدتر۔

(۱۷۸۷) ایک اور سند سے ابن سیرین ہی سے اسی مضمون کی روایت ہے البتہ اس میں آخر کے الفاظ اس طرح ہیں: "جو اپنے طور پر زکواۃ کی تقسیم پسند کرے وہ ڈرتا رہے۔ اور اس کے ذریعہ اپنے مال کو نہ بچائے۔"

وہ صحابہ کرامؓ جو حکام کو زکواۃ دینے کے حق میں ہیں

(۱۷۸۸) امّ علقمہ کہتی ہیں کہ حضرت عائشہؓ اپنی زکواۃ "سلطان" (صاحبِ اقتدار حاکم) کو دیتی تھیں۔

(۱۷۸۹) سہیل بن ابی صالح اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے سعد بن ابی وقّاص، ابو ہریرہ، ابو سعید خُدری اور ابن عمر رضی اللہ عنہم سے دریافت کیا: یہ سلطان تو وہ کچھ کر رہے ہیں جو تم دیکھ رہے ہو۔ کیا اس پر بھی میں انہیں اپنی زکواۃ دے دوں؟ تو ان سب نے ایک ہی جواب دیا: "زکواۃ انہی کو دے دو۔"

(۱۷۹۰) ابن عون کہتے ہیں کہ میں نے مجاہد سے زکواۃ کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے کہا: "مجھ سے عبداللہ بن عبید بن عُمیر نے اس موقع پر جبکہ وہ ہمارے ساتھ طواف کر رہے تھے کہا کہ ایک شخص ابن عمرؓ کے پاس اپنے مال کی زکواۃ لے کر آیا اور اس نے کہا: "اے ابو عبدالرحمٰن! یہ ہے میرے مال کی زکواۃ، اب آپ حکم دیں کہ اسے میں کہاں دے ڈالوں؟" تو انہوں نے کہا: "یہ اسے دے دو جس سے تم نے بیعت کی ہے۔" راوی کہتا ہے کہ ابن عون نے کہا کہ مجاہد نے (بیعت بتلانے کے لئے) اپنے ایک ہاتھ کو دوسرے پر تالی بجاتے ہوئے مارا۔ بعد ازاں عبید بن عُمیر نے اپنا سر اُٹھاتے ہوئے کہا: "میں اپنے طور پر زکواۃ تقسیم نہیں کروں گا۔"

(۱۷۹۱) مجاہد کہتے ہیں کہ ابن عمرؓ نے کہا: "زکواۃ "سلطان" یا "امراء" کو دو" تو عُبید بن عُمیر نے کہا: "نہیں، بلکہ جن میں اللہ تعالیٰ نے اسے دینے کا حکم دیا ہے ان میں دے دو۔"

کافر (عاملوں) کو زکواۃ نہ دو

(۱۷۹۲) ابن عون راوی ہیں کہ انس بن سیرین نے کہا: "میں ابن عمرؓ کے پاس تھا کہ ایک شخص نے دریافت کیا: "کیا ہم اپنے عاملوں (یا سرکاری کارندوں) کو اپنے اموال کی زکواۃ دے دیں؟" تو انہوں نے کہا: "ہاں" تو اس سائل نے کہا: "ہمارے ہاں متعین ہونے والے سرکاری کارندے کافر ہیں۔ (راوی کہتا ہے کہ زیاد مشہور اموی گورنر کافروں کو بھی عامل بنا دیتا تھا) تب ابن عمرؓ نے کہا "کافروں کو اپنی زکواتیں نہ دیا کرو۔"

(۱۷۹۳) ربیع بن معبد کہتے ہیں کہ انہوں نے ابن عمرؓ سے فتنہ کے زمانہ میں اپنے زیر نگرانی یتیموں کے مال کی زکواۃ کے متعلق دریافت کیا کہ آیا میں اسے اپنے ضرورت مند چچازاد بھائیوں کو دے دوں؟ تو انہوں نے کہا "نہیں، اسے والیوں کے حوالہ کر دو۔"

(۱۷۹۴) ابن عمرؓ نے کہا: جب تک یہ (حکام) نماز قائم کرائیں، زکواۃ انہیں دیتے رہو۔"

(۱۷۹۵) ابن عمرؓ سے روایت ہے "جسے اللہ نے تمہارے امور کا متولی (ناظم و نگران) بنایا ہے زکواۃ انہی کو دو۔ جو نیکی کرے گا وہ اپنے بھلے کے لئے اور جو گناہ کرے گا وہ اپنے بُرے کے لئے۔

(۱۷۹۶) ابن عمرؓ کہتے ہیں: "زکواۃ امراء (و حکام) کو دو" اس پر ان سے ایک شخص نے کہا: "وہ لوگ اس (زکواۃ) کو صحیح جگہوں پر خرچ نہیں کرتے" تو انہوں نے کہا: "خواہ کچھ بھی ہو، خواہ وہ ایسا کریں۔"

(۱۷۹۷) قتادہ کہتے ہیں کہ میں نے ابوالحکم کو یہ کہتے سُنا: "ابن عمرؓ کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے کہا: مجھے بتائیے کہ میں کسے زکواۃ دوں؟" تو انہوں نے کہا: "امراء (حکام) کو دو۔ خواہ اس کے ذریعہ وہ اپنے دستر خوانوں پر کتوں کے گوشت بانٹیں۔"

(۱۷۹۸) قزعہ کہتے ہیں کہ میں نے ابن عمرؓ سے کہا: "میرے پاس مال ہے میں اس کی زکواۃ کسے دوں؟" تو انہوں نے کہا: "ان لوگوں یعنی امراء و حکام کو دے دو"۔ تو میں نے کہا: "یہ تو اسے کپڑے اور خوشبو کے کام میں لائیں گے، تو انہوں نے کہا: "خواہ وہ اسے کپڑے اور خوشبو کے کام میں لے آئیں۔ لیکن یہ جان لو کہ تمہارے مال میں زکواۃ کے سوا اور بھی حقوق ہیں۔"

(۱۷۹۹) قتادہ کہتے ہیں: "میں نے سعید بن المسیّب سے دریافت کیا: "میں اپنے مال کی زکواۃ کسے دوں؟" تو انہوں نے مجھے کوئی جواب نہ دیا۔" وہ کہتے ہیں پھر میں نے یہی سوال حسنؒ سے کیا تو انہوں نے کہا: "اسے "سلطان" کو دے دو۔"

حکام کو زکواۃ دینے یا نہ دینے کی توجیہ

(۱۸۰۰) ابو عبیدؒ:۔ ہمارا خیال ہے کہ جو لوگ حکام و امراء کو زکواۃ دینے کا حکم دیتے ہیں وہ ان لوگوں کے لئے ایسا کرنا واجب قرار دیتے ہیں جو (حکومت سے تنخواہ (وظائف) عطیات حاصل کرتے ہیں۔ اس کا اشارہ حضرت ابن عمرؓ کے اس قول میں ملتا ہے: "اسے زکواۃ دو جس سے تم نے بیعت کی ہے۔" جو ہم اُوپر بیان کر آئے ہیں۔

(۱۸۰۱) اور یہی پہلو حضرت عمر بن الخطابؓ کی اس روایت سے ظاہر ہو رہا ہے:۔ "ہمارا حق تو ان پر ہے جو ہم سے "فیٔ" (میں سے حصہ) لیتا ہے۔"

اسی کی شرح حضرت علی اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما کی ان روایات سے ہو رہی ہے:

(۱۸۰۲) اسامہ بن زید راوی ہیں کہ ان کی والدہ نے کہا: "تیرے باپ نے ابو ہریرہؓ سے زکواۃ کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے کہا: "اگر میں ان (حکام) سے جزیہ (یعنی عطیہ و تنخواہ) نہ لے رہا ہوتا تو میں انہیں کچھ بھی نہ دیتا۔ لہٰذا تم انہیں (حکام کو زکواۃ) مت دو۔"

(۱۸۰۳) ابو سعید اعمی راوی ہیں کہ ابو ہریرہؓ کو ایک شخص ملا جو اپنے مال کی زکواۃ امام (حاکم) کو دینے کے لئے جا رہا تھا، تو انہوں نے اس سے دریافت کیا: "اپنے ساتھ کیا لئے جا رہے ہو؟" اس شخص نے کہا: "اپنے مال کی زکواۃ ہے جو امام کے پاس لے جا رہا ہوں۔" اُنہوں نے دریافت کیا: "کیا تم دفتر میں ہو؟ (یعنی تمہارا نام سرکاری رجسٹر میں درج ہے اور تمہیں وظیفہ مل رہا ہے؟) تو اس شخص نے کہا: "نہیں" اس پر انہوں نے کہا: "تو پھر تم انہیں (حکام کو) کچھ مت دو۔"

(۱۸۰۴) ابن جُریج کہتے ہیں کہ مجھے عطاء نے بتایا کہ ہمیں حضرت علیؓ سے یہ روایت

پہنچی ہے کہ ایک شخص ان کے پاس اپنے مال کی زکواۃ لایا تو انہوں نے پوچھا: "کیا تم ہمارے عطیوں (وظائف) میں سے لے رہے ہو؟"۔ اس نے کہا: "نہیں" تو انہوں نے کہا: "تب تم چلے جاؤ۔ ہم تم سے کچھ نہیں لیں گے۔ ہم تمہیں دوہری تکلیف نہیں دیں گے کہ ایک تو ہم تمہیں کوئی عطیہ نہ دیں اور دوسری طرف تم سے لیں"۔

اپنی زکواۃ خود مستحقین میں تقسیم کرنا

(۱۸۰۵) ابوسعید مقبری کہتے ہیں کہ میں عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے پاس دو سو درہم لے کر گیا اور ان سے کہا: "اے امیر المومنین! یہ میرے مال کی زکواۃ ہے" تو انہوں نے دریافت کیا: "اے کیسان! کیا تم نے غلام آزاد کیا؟" تو میں نے کہا: "ہاں"۔ تب انہوں نے کہا: "یہ رقم تم ہی لے جاؤ اور اسے تقسیم کر دو"۔

(۱۸۰۶) ابن جریج کہتے ہیں کہ میں نے عطاء سے دریافت کیا: "کیا آپ مجھے اجازت دیں گے کہ میں اپنے مال کی زکواۃ مستحقین میں تقسیم کر دوں یا مجھے یہ زکواۃ امراء (وحکام) ہی کو ادا کرنا ہوگی؟" تو انہوں نے کہا کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے سنا: "اگر تم اسے صحیح جگہوں پر (مستحقین کو) دے سکو اور اس میں سے کسی ایسے شخص کو کچھ نہ دو جس کی تم کفالت کر رہے ہو تو کوئی مضائقہ نہیں ہے"۔

اپنے آپ زکواۃ تقسیم کرنے میں تقویٰ سے کام لینا

ابن جریج کہتے ہیں کہ یہ بات میں نے کئی بار عطاء سے سنی ہے۔

(۱۸۰۷) عبید بن عمیر کہتے ہیں: "زکواۃ کو تم (خود ہی) تقسیم کر دو۔"

(۱۸۰۸) ایک اور سند سے بھی عبید بن عمیر ہی سے یہ قول مروی ہے۔

(۱۸۰۹) جعفر بن برقان کہتے ہیں کہ میں نے میمون بن مہران سے کہا کہ مجھے یہ روایت پہنچی ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے: "زکواۃ حکام کو ادا کرو خواہ وہ اس سے شراب نوشی کریں"۔ تو میمون نے کہا: "کیا تم فلاں نصیبی کو جانتے ہو جو ابن عمر رضی اللہ عنہ کا دوست تھا؟" اس نے مجھے بتایا کہ اس نے ابن عمر سے دریافت کیا: "زکواۃ کے بارے میں آپ کی کیا رائے

ہے ؟۔ یہ لوگ (حکام) تو اسے صحیح جگہوں پر صرف نہیں کر رہے ہیں ؟" تو انہوں نے کہا: " زکواۃ انہی کو دو" میں نے کہا "یہ تو فرمائیے کہ اگر یہ لوگ نماز اس کے صحیح اوقات سے دیر لگا کر پڑھیں تو کیا پھر بھی آپ انہی کے ساتھ نماز پڑھیں گے ؟" اس پر انہوں نے کہا: نہیں" تب میں نے کہا: "کیا نماز کی وہی حیثیت نہیں ہے جو زکواۃ کی ہے ؟" انہوں نے کہا: " جیسے انہوں نے ہمارے معاملات کو مشکوک بنا دیا اللہ انہیں بھی حیران و پریشان رکھے۔"

(۱۸۱۰) حبّان بن ابی جبلہ، ابن عمرؓ کے متعلق کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے اس قول سے رجوع کر لیا تھا کہ زکواۃ "سلطان" کو دی جائے، اور یہ کہتے تھے: "زکواۃ کو اس کی جگہ پر صرف کرو۔"

(۱۸۱۱) حسان بن ابی یحییٰ کندی کہتے ہیں کہ میں نے سعید بن جبیرؒ سے زکواۃ کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے کہا: "زکواۃ ان لوگوں کو دو جو تمہارے معاملات کے منتظم و والی ہیں۔" کندی کہتے ہیں جب سعید (اس محفل سے) اُٹھے تو میں اُن کے پیچھے ہو گیا اور میں نے کہا: "آپ نے تو مجھے حکم دے دیا کہ ان حکام کو زکواۃ دے دیا کروں، حالانکہ یہ لوگ اس زکواۃ (کی رقم) سے ایسے ویسے کام کرتے ہیں"۔ تو انہوں نے کہا: " تم زکواۃ وہاں صرف کرو جہاں صرف کرنے کا تمہیں اللہ نے حکم دیا ہے۔ تم نے مجھ سے برسرِ عام پوچھا تھا تو میں تمہیں یہ نہیں بتا سکتا تھا۔"

(۱۸۱۲) ابراہیم اور حسن سے روایت ہے کہ وہ دونوں کہتے تھے: "زکواۃ کو اُن کی جگہوں پر صرف کرو اور اسے خفیہ رکھو۔"

(۱۸۱۳) میمون بن مہران کہتے ہیں: "زکواۃ کو تھیلیوں میں رکھ لو۔ پھر ان تھیلیوں کو ان میں تقسیم کر دو جنہیں تم مستحق سمجھتے ہو، اور مہینہ نہ گذرنے پائے کہ تم اسے بانٹ چکو۔"

(۱۸۱۴) حسن کہتے ہیں: اگر زکواۃ "سلطان" کو ادا کر دو تو بھی اس کی ذمہ داری پوری ہو جائے گی لیکن اگر وہ اسے نہ دے تو خدا سے ڈرے اور اسے صحیح جگہوں پر خرچ کرنے کی سعی کرے۔ اور اس بارے میں کسی کی رو رعایت نہ کرے۔"

(۱۸۱۵) ابن سیرین کہتے ہیں: "جو اپنے طور پر زکواۃ کی تقسیم پسند کرے تو وہ

اللہ سے ڈرے، اور اس کے ذریعہ اپنے مال کو نہ بچائے۔[1]

(۱۸۱۶) حمید کہتے ہیں کہ میں نے حسن سے کہا: "اگر کوئی شخص اپنے مال کی زکواۃ رکھ چھوڑے اور جب حقدار دیکھے اسے دیتا رہے"۔ تو انہوں نے کہا "اپنی زکواۃ کو اپنے مال کا سہارا نہ بناؤ کہ جب کوئی حق نظر آئے تم اس (زکواۃ کے مال) کے ذریعہ اپنے مال (کے دیگر حقوق) کو بچاؤ۔

ابو عبیدؒ:۔ ہماری مذکورہ بالا تمام روایات جن کے بموجب زکواۃ حکام کو دینا اور اسے اپنے طور پر بانٹ دینا، دونوں پر عمل ہوتا رہا ہے۔ لیکن یہ صورت نقدی

اپنے طور پر صرف نقدی کی زکواۃ بانٹی جا سکے گی

(سونے اور چاندی) کی زکواۃ سے مخصوص ہے۔ اس کا مالک مذکورہ بالا دونوں صورتوں میں سے جس صورت میں بھی زکواۃ دے وہ اپنے ذمہ عائد ہونے والے فرض کو ادا کر دے گا۔

(۱۸۱۷) اور ہمارے نزدیک اہل حجاز و عراق وغیرہ کے محدثین و فقہاء کا نقدی سیم و زر کے متعلق یہی قول ہے۔ اس لیے کہ اس بارے میں مسلمانوں کو اسی طرح امین متصور کیا جائے گا۔ جیسے کہ نماز ادا کرنے میں انہیں امین سمجھا جاتا ہے۔

مویشیوں، غلوں اور پھلوں کی زکواۃ صرف حکام وصول کریں گے

باقی رہا مویشیوں، غلوں اور پھلوں کی زکواۃ کا معاملہ سو ان اشیاء کی زکواۃ حکام ہی وصول کریں گے اور ان اشیاء کے مالکوں کو یہ حق نہیں کہ وہ ان کی زکواۃ ان (حکام) سے چھپائیں۔ اور اگر مالک اپنے طور پر ان اشیاء کی زکواۃ نکال کر مستحقین میں بانٹ دے تو اس عمل سے اس کی فرض زکواۃ ادا نہ ہو گی اور اسے دوبارہ ان کی زکواۃ حکام کو دینا ہوگی۔ آثار و روایات میں ان دونوں قسموں کی زکواۃ میں فرق ملحوظ ہے:

(۱۸۱۸) چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے مہاجرین و انصار

---

[1] ۔یعنی جہاں اور مدوں سے مصارف کرنا ہوں وہاں زکواۃ نہ خرچ کرے۔

کی موجودگی میں مویشیوں کی زکواۃ روکنے پر مرتدین سے جنگ کی تھی لیکن سونے چاندی (کی زکواۃ نہ دینے) پر ایسا نہیں کیا۔ اسی طرح اگر کوئی مرد مسلم اپنی زکواۃ لے کر "عاشر" کے پاس پہنچے اور وہ اس سے یہ زکواۃ وصول کرے تو ہمارے نزدیک اس کی یہ

اسلامی حکومت کے نمائندوں کے زکواۃ وصول کرنے سے زکواۃ ادا ہو جاتی ہے،

زکواۃ ادائی فریضہ کے لئے کافی ہوگی۔ اس لئے کہ وہ (عاشر) منجملہ (نمائندگانِ) "سلطان" ہے۔ علماء نے ایسا ہی فتویٰ دیا ہے۔

(۱۸۱۹) انس بن مالک اور حسن دونوں کہتے ہیں: "جو رقم تم پلوں اور راستوں (کے ناکوں) پر (عاشر کو) دو وہ زکواۃ کا کام دے گی۔

(۱۸۲۰) مغیرہ کہتے ہیں کہ ابراہیم نے کہا "عشر وصول کرنے والے تمہارا جتنا مال لیں اسے زکواۃ میں شمار کرلو۔"

(۱۸۲۱) حسن اور ابراہیم دونوں کہتے ہیں: "تمہارا جو مال عاشر (چنگی وصول کرنے والا) لے اسے (زکواۃ میں) شمار کر لو۔"

(۱۸۲۲) شعبی کہتے ہیں: "عشور وصول کرنے والا تمہارا جو مال لے اسے اپنی زکواۃ میں شمار کرلو۔"

(۱۸۲۳) حبیب بن جُرَی کہتے ہیں کہ میں نے ابو جعفر محمد بن علی سے اس بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے کہا: "اسے اپنی زکواۃ میں شمار کرلو۔"

(۱۸۲۴) ابن عون کہتے ہیں کہ میں نے حسنؒ سے اس بارے میں دریافت کیا کہ کیا میں ایسے دئے ہوئے مال کو زکواۃ میں شمار کرلوں؟ تو انہوں نے کہا: "ہاں"۔

ابو عبیدؒ: یہی قول ہمارے نزدیک قابلِ عمل ہے۔ اگرچہ بعض حضرات سے اس سے مختلف قول بھی منقول ہے:

(۱۸۲۵) جعفر بن برقان کہتے ہیں کہ اس بارے میں میمون بن مہران کہا کرتے تھے: "وہ اپنے مال کی (پوری) زکواۃ نکالے گا اور جو کچھ اس سے لیا جا چکا ہے اسے شمار نہ

کرے گا۔"

(۱۸۲۶) محمد بن علی سُلمی کہتے ہیں کہ میں نے ربعی بن خراش کو ایک عاشر کے پاس سے گذرتے ہوئے دیکھا: انہوں نے ایک تھیلی جو ان کے لڑکے کے پاس تھی اور اسے اپنے اور اپنی زین کی اٹھی ہوئی لکڑی کے درمیان رکھ لیا تا آنکہ وہ اسے لے کر عاشر کے پاس سے آگے نکل گئے۔

(۱۸۲۷) **ابو عبیدؒ:** اس بارے میں ہمارا فیصلہ اس قول کے مطابق ہے جو حضرات انس، حسن، ابراہیم، شعبی اور محمد بن علی کا ہے۔ اور اسی پر لوگوں کا عمل ہے حتیٰ کہ بعض لوگوں نے خوارج کا بھی یہی قول بتایا ہے۔

(۱۸۲۸) ابن شہاب سے اس شخص کے متعلق دریافت کیا گیا جس کے مال کی زکواۃ حروریۃؔ نے لی ہو کہ آیا اس پر کوئی تنگی ہوگی؟ تو انہوں نے کہا: "ابن عمرؓ کا خیال تھا کہ اس طرح اس کا فریضہ ادا ہو جائے گا۔ واللہ اعلم"

(۱۸۲۹) نافع سے روایت ہے کہ انصار نے ابن عمرؓ سے زکواۃ کے متعلق دریافت کیا

مُلک میں غالب آنے والی جماعت کو زکوۃ دے دو

تو اُنہوں نے کہا: "زکواۃ سرکاری عاملوں کو دو" انصار نے کہا: "ہمارے ہاں کبھی شامی غالب آتے ہیں اور کبھی یہ لوگ (عراقی یعنی علیؓ والے)"۔ تو انہوں نے کہا: "جو غالب آ جائے اسے زکواۃ دے دو۔"

ابو عبیدؒ کے نزدیک حاکم کا قریشی ہونا شرط ہے

(۱۸۳۰) **ابو عبیدؒ:** جہاں تک خوارج (کو زکواۃ دینے) کا معاملہ ہے تو میری پسندیدہ رائے یہ ہے کہ جس سے وہ زکواۃ لیں وہ اپنی زکواۃ دوبارہ ادا کرے۔ اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: "اس حکومت کے معاملہ میں لوگ قریش کے تابع ہیں۔ ان لوگوں کے بھلے لوگ ان (قریش) کے بھلوں کے تابع اور ان (لوگوں)

ؔ۔ یہ حضرت علیؓ کے خلاف بغاوت کرنے والے خوارج کے ایک فرقہ کا نام ہے کیونکہ یہ لوگ حروراء مقام پر جمع ہو گئے تھے۔ پھر بعد میں بھی ان کی بغاوتوں کا سلسلہ جاری رہا۔

کے بڑے لوگ ان (قریش) کے بڑوں کے تابع ہیں۔

(۱۸۳۱) نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے مطابق:

"یہ حکومت کا معاملہ برابر قریش میں رہے گا۔ جب تک بھی لوگوں میں سے دو شخص باقی رہیں۔"

اس طرح رسول اللہ علیہ وسلم نے قریش کے علاوہ دوسروں کو والی مقرر نہ کیا۔

(۱۸۳۲) ابن عمرؓ کی وہ روایت۔ جس میں حروریہ کے زکواۃ لینے پر وہ صاحب زکواۃ کا فریضہ اداشدہ مانتے ہیں، ان سے ثابت نہیں ہے۔ اس لئے کہ ابن شہاب ان سے یہ روایت مرسل بیان کرتے تھے۔ پھر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اس کی صحت کے بارے میں پختہ یقین نہیں رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ اس روایت کے آخر میں انہیں "واللہ اعلم" کہتا دیکھ رہے ہیں (دیکھئے نمبر ۱۸۲۸)

جہاں تک ان کے اس جواب کا تعلق ہے جو انہوں نے شامیوں اور دوسرے لوگوں کے بارے میں سوال کرنے پر کہا: "جو غالب آجائے اسے زکواۃ دے دو" تو یہ جائز ہے اس لئے کہ اس زمانہ میں جو شامی یا عراقی و حجازی لڑ رہے تھے وہ بہرحال قریشی امامتؒ ہی کے داعی تھے، لیکن خوارج ان سے مختلف تھے۔

(۱۸۳۳) اہل عراق یا ان میں سے بعض کا کہنا ہے: "اگر خوارج اس (زکواۃ دینے والے) کے گھر پر پہنچ کر اس سے زکواۃ وصول کرلیں تو اس صورت میں اس کی زکواۃ ادا ہو جائے گی۔ لیکن اگر وہ اپنی زکواۃ لے کر ان کے پاس جائے تو اس کی زکواۃ ادا نہ ہوگی۔

لہ۔ امامت کے قریش میں ہونے کی ابو عبید کی تاویل سے ہم متفق نہیں ہیں۔ اس بارے میں امام باقلانی اور ابن خلدون کو ہماری تائید حاصل ہے جنہوں نے امامت کے لئے قریشیت کی شرط ضروری نہیں ٹھہرائی۔ دیکھئے تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، علامہ اقبال ترجمہ نذیر نیازی: ۲۴۴

باب

زکوٰۃ کو آٹھ مدوں میں بانٹنے نیز بعض مستحقین کو چھوڑ کر بعض کو دینے کا بیان

آٹھ مدوں میں سے کسی ایک مد میں تمام زکوٰۃ خرچ کی جاسکتی ہے

(۱۸۳۴) حذیفہ کہتے ہیں: "اگر تم زکوٰۃ کو اس کی آٹھ مدوں میں سے کسی ایک (مد) میں خرچ کردو تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی"۔

(۱۸۳۵) حجاج کہتے ہیں: "میں نے عطاء سے اس بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے کہا: "(کسی ایک مد میں دے دینے میں) کوئی مضائقہ نہیں ہے"۔

(۱۸۳۶) سعید بن جبیر اور عطاء دونوں کہتے ہیں" اگر تم زکوٰۃ کسی ایک مد میں دے دو تو وہ تمہیں کفایت کرے گی"۔

(۱۸۳۷) ابن جریج کہتے ہیں کہ مجھے ابن عباس رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ بتایا گیا ہے کہ انہوں نے کہا: "اگر تم زکوٰۃ کو اس کی مقررہ مدوں میں سے کسی ایک مد میں خرچ کردو تو وہ تمہارے لئے کفایت کرے گی"۔

اور جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:

اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِيْنِ الخ (التوبہ:۶۰)

"بے شک زکوٰۃ تو فقراء ومساکین کے لئے ہے۔ الخ....."

تو اس طرح اللہ تعالیٰ نے نام بنام تمام مستحقین کا ذکر فرما دیا ہے تاکہ لوگوں کو مستحقین زکوٰۃ کا علم ہو جائے اور وہ ان مذکورہ مدوں کے علاوہ کسی اور مد میں زکوٰۃ نہ دیں۔

(۱۸۳۸) حسن کہتے ہیں "زکواۃ علَم (جھنڈے) کی حیثیت رکھتی ہے۔ جہاں بھی اسے لگا دیا جائے وہ تمہارے لئے کفایت کرے گی"۔

زکواۃ کی رقوم وافر ہوں تو تمام مدوں میں بانٹی جائیں۔ کم ہوں تو ایک مد میں بھی دی جاسکتی ہے،

(۱۸۳۹) عکرمہ کہتے ہیں: زکواۃ کو (اس کی) مدوں میں بانٹو۔"

(۱۸۴۰) ابراہیم کہتے "اگر مال وافر ہو تو اسے تمام مدوں میں بانٹو، لیکن اگر تھوڑا ہو تو اسے ایک ہی مد میں دے دو"

(۱۸۴۱) ابراہیم کے اس قول کی تائید عطاء سے بھی مروی ہے۔

(۱۸۴۲) ابراہیم کہتے ہیں: "لوگ صرف فقر و فاقہ سے مجبور ہو کر ہی سوال کرتے تھے۔"

زکواۃ کا سب سے زیادہ مستحق

(۱۸۴۳) ابن شہاب کہتے ہیں: "زکواۃ کے سب سے زیادہ مستحق وہ ہیں جو تعداد میں زیادہ اور فقر و احتیاج کے لحاظ سے بہت تنگ حال ہوں۔"

(۱۸۴۴) یحییٰ بن بکیر مالک سے روایت کرتے ہیں: "تقسیم زکواۃ کے جس مسئلہ میں

تقسیمِ زکواۃ میں حاکم کی صوابدید کی اہمیت

ہمارے نزدیک کوئی اختلاف نہیں یہ ہے: "کہ یہ تقسیم والی (حاکم) کی صوابدید کے بغیر نہ ہو۔ وہ مصارف زکواۃ کے اصناف میں سے جس کو زیادہ محتاج اور زیادہ تعداد پائے اسے اپنے اندازے کے مطابق ترجیح دے گا۔" مالک نے یہ بھی کہا: "زکواۃ پر متعین عامل کے لئے کوئی تنخواہ مقرر نہیں ہے۔"

(۱۸۴۵) ابو عبیدؒ: اسی طرح سفیان اور اہل عراق بھی یہی کہتے ہیں: "اگر وہ زکواۃ کو اس کے آٹھ مصارف میں سے کسی ایک مد میں خرچ کر دے تو فریضہ زکواۃ کی ادائی ہو جائے گی۔

زکوٰۃ تمام مدوں میں بہ تناسب بانٹی جائے

(۱۸۴۶) دوسروں کا کہنا ہے : وہ زکوٰۃ کو ان تمام (آٹھوں) اصناف میں تقسیم کرے گا"۔ ایسا کہنے والوں میں عکرمہ بھی ہیں ۔ ان سے یہ روایت ہم بیان کر چکے ہیں۔

(۱۸۴۷) ابراہیم اور عطا بھی یہی رائے رکھتے تھے بشرطیکہ (زکوٰۃ میں دیا ہوا) مال زیادہ ہو۔ خود عمر بن عبدالعزیز نے ابن شہاب کو حکم دیا تھا کہ وہ ان کے لئے زکوٰۃ کے مصارف کی تفصیل لکھ دیں ۔ چنانچہ انہوں نے ہر صنف کی جُدا جُدا مختصر شرح پر مشتمل تحریر ان کے لئے لکھ دی تھی :

(۱۸۴۸) عُقیل کہتے ہیں کہ مجھ سے ابن شہاب نے کہا کہ عمر بن عبدالعزیز نے انہیں حکم دیا تو انہوں نے زکوٰۃ کے مصارف کا قانون یوں لکھا :

زکوٰۃ کے مصارف (مدّات) کی مختصر شرح

" زکوٰۃ کے منازل و مصارف یہ ہیں، ان شاء اللہ تعالیٰ جو آٹھ حصوں پر مشتمل ہیں، ایک[۱] حصہ فقراء کے لئے اور ایک[۲] حصہ مساکین کے لئے۔ اور ایک حصہ[۳] زکوٰۃ کے کارندوں (عاملوں) کے لئے ۔ اور ایک حصہ[۴] مولفۃ القلوب کا۔ اور ایک[۵] حصہ غلاموں کو آزاد کرانے میں ۔ اور ایک حصہ[۶] مقروض و تاوان زدہ کا۔ اور ایک حصہ[۷] فی سبیل اللہ۔ اور ایک حصہ[۸] مسافر کے لئے۔

پہلی مد فقراء اور اس مد کی رقوم کے مصارف

فقراء کے حصہ میں سے نصف تو ان (فقراء) کے لئے ہوگا جو راہِ خدا میں پہلا غزوہ کر رہے ہوں جبکہ انہیں کمک میں بھیجے جانے والے امدادی لشکر میں متعین کیا جا رہا ہو اور وہ پہلا عطیہ (تنخواہ) لے لیں ۔ بعد ازاں انہیں زکوٰۃ کی رقوم نہیں دی جائیں گی بلکہ انہیں فئے میں سے حصہ دیا جائے گا، بقیہ نصف ان فقراء کو دیا جائے گا جو غزوہ میں شریک نہیں ہوں، اپاہج و لاچار ہوں ۔ اور وہ انتظار کرنے والے ہوں جو روزینے (یا تنخواہیں) لے رہے ہوں ۔ ان شاء اللہ۔

دوسری مد "مساکین" اور اس کے مصارف

اور مساکین کے حصہ میں سے نصف تو ان مسکینوں کو دیا جائے گا جو آفت زدہ ہوں اور زمین میں چل پھر کر کسی روزگار کا وسیلہ پیدا کر سکتے ہوں اور بقیہ نصف ان مساکین کو دیا جائے گا جو بھیک مانگ رہے ہوں۔ اور ان مسلمانوں کو جو قید میں ہوں اور ان کا کوئی نہ ہو۔ ان شاء اللہ۔

تیسری مد "محصلین زکواۃ" اور اس کے مصارف

اور زکواۃ کے کارندوں (محصلوں یا عاملوں) کے حصہ کا تعین اس طرح کیا جائے گا کہ جو ان میں سے پاکبازی و امانت سے زکواۃ کا حساب رکھے گا اسے اپنی کارکردگی و نگرانی اور وصولی زکواۃ کے مطابق اس میں سے رقم دی جائے گی نیز اس کے ساتھ دیگر کارکنوں کو بھی ان کی کارکردگی کے اعتبار سے اس میں سے رقوم دی جائیں گی۔ ہو سکتا ہے کہ اس حصہ میں سے جو رقم عاملینِ زکواۃ کو ملے وہ تقریباً اسی حصہ کی چوتھائی (¼) رقم ہو جائے اور انہیں دے چکنے کے بعد اس حصہ کا تین چوتھائی (¾) بچ رہے لہٰذا یہ بقیہ رقم کمک کے لئے محفوظ فوج اور مشروط طور پر بھرتی ہونے والے فوجیوں کو دی جائے گی۔ ان شاء اللہ۔

چوتھی مد "مؤلفۃ القلوب" اور اس کے مصارف

اور مؤلفۃ القلوب کا حصہ ان لوگوں کے لئے ہے جن کو لوگوں کی کمک کے لئے محفوظ فوج میں رکھ کر پہلا عطیہ دیا جائے۔ نیز وہ جانباز جو مشروط طور پر فوج میں شریک ہو کر جہاد کریں اور ان کا کوئی عطیہ مقرر نہ ہو۔ اور وہ محتاج و ضرورت مند ہوں۔ نیز ان مساکین میں جو مساجد میں آتے ہوں۔ لیکن نہ تو ان کا کوئی عطیہ مقرر ہو اور نہ کوئی حصہ ہو۔ اور وہ لوگوں کے سامنے دستِ سوال بھی نہ پھیلاتے ہوں۔ ان شاء اللہ۔

پانچویں مد غلاموں کو آزاد کرانا اور اس کے مصارف

اور غلاموں کو آزاد کرانے کا حصہ دو حصوں میں تقسیم ہوگا۔ چنانچہ اس

میں سے آدھا تو اس مدعی اسلام غلام کے لئے ہوگا جس نے اپنے آقا سے کسی معاوضہ کی ادائگی کی شرط پر آزادی کا معاہدہ کر لیا ہو۔ ان کے مختلف مراتب و اصناف ہوں گے ان میں سے جو اسلامی فقہ میں دسترس رکھتے ہوں انہیں فضیلت حاصل ہوگی۔ ان کے سوا دیگر لوگوں کا دوسرا رتبہ ہوگا۔ اور اس کے دینے میں اس مقدار کو ملحوظ رکھا جائے گا جو ان میں سے ایک ادا کر چکا ہو نیز وہ مقدار جو اس کے ذمہ باقی اور واجب الادا ہو۔ ان شاء اللہ۔ اور بقیہ نصف رقم ان غلام مردوں اور عورتوں کے خریدنے میں صرف کی جائے گی جو نماز روزہ کے پابند ہوں اور دیر سے اسلام لا چکے ہوں، پھر انہیں آزاد کر دیا جائے گا۔ ان شاء اللہ

چھٹی مد "مقروض و تاوان رسیدہ لوگ اور اس کے مصارف"

اور مقروض و تاوان رسیدہ لوگوں کا حصہ تین حصوں میں منقسم ہوگا، ان میں سے ایک حصہ ان لوگوں کے لئے ہوگا جن کا مال اور سواری اور غلام راہِ خدا میں کام آ گیا ہو اور وہ اس حد تک مقروض ہوں کہ اس کی ادائی کی سبیل نہ ہو۔ اور نہ قرض کے سوا دیگر اخراجات کے لئے ان کے پاس کوئی ذریعہ ہو۔ اس مد کے بقیہ دو حصے ان لوگوں کے لئے ہیں جو ایک جگہ اقامت پذیر رہیں اور جہاد کے لئے نہ نکلیں اور وہ مقروض و تاوان رسیدہ ہونے کے ساتھ محتاج بھی ہوں۔ ان کے ذمہ جو قرض ہو اس کا کچھ حصہ بھی اللہ کی نافرمانی میں نہ (صرف ہوا) ہو۔ ان کی دینداری —— یا ان کی قرضداری —— پر بھی کوئی الزام نہ لگایا جاتا ہو (یعنی یہ کہ وہ بلا ضرورت قرض لیتے ہوں اور غیر ضروری یا ناجائز مصارف میں اسے استعمال کر لیتے ہیں) ان شاء اللہ۔

ساتویں مد "فی سبیل اللہ" اور اس کے مصارف

اور ایک حصہ فی سبیل اللہ ہے۔ اس میں کچھ ایسے مستحقین ہیں جن کے لئے اس حصہ کا چوتھائی مقرر کر دیا گیا ہے۔ اسی میں سے محتاج جانباز فوجی کو چوتھائی حصہ دیا جائے گا۔ اسی میں سے اس غازی فی سبیل اللہ کو دیا جائے گا۔

جسے محاذ پر ضرورت لاحق ہو جائے - ان شاء اللہ -

آٹھویں مد ابن السبیل اور اس کے مصارف

اور مسافروں کا حصہ اس انداز سے تمام راہوں پر تقسیم کر دیا جائے گا جس انداز سے لوگ ان پر سفر کرتے ہوں - اس حصہ میں سے ہر ایسے مسافر کو دیا جائے گا جس کے پاس کوئی ٹھکانا نہ ہو - نہ پناہ لینے کے لئے گھر بار اور رشتہ دار ہو - اس کے کھانے کا اس وقت تک انتظام کیا جائے گا تا آنکہ اسے ٹھکانا مل جائے یا وہ اپنی حاجت پوری کر لے - یہ (مسافروں کا حصہ) ایسے مقرر اور جانے پہچانے مقامات میں ایسے امانت داروں کے پاس رکھوایا جائے کہ ایک مسافر بھی ان کے پاس سے ایسا نہ گذرے جس کی ضرورت ہو اور وہ اسے پناہ نہ دیں - اسے کھلائیں پلائیں نہیں اور اس کے جانور کو چارہ نہ دیں - اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رکھیں جب تک کہ ان کے پاس اس مد میں سے کچھ بھی باقی نہ رہے - ان شاء اللہ

ابو عبیدؒ :- اس کے بعد انہوں نے غلوں، پھلوں، اونٹوں گائے بیلوں اور بھیڑ بکریوں کی زکواۃ کی تفصیلات بیان کی ہیں -

زکواۃ کو صحیح مصرف میں امام ہی خرچ کر سکتا ہے

(۱۸۴۹) ابو عبیدؒ :- یہ ہیں زکواۃ کے مصارف جبکہ اسے اس کی تمام مدوں میں تقسیم کیا جائے - اور جو ایسا کر سکے اس کے لئے یہی صحیح طریقہ ہے - لیکن جہاں تک میرا خیال ہے یہ صورت امام کے سوا کسی پر واجب نہیں کیونکہ اس کے پاس بڑے پیمانہ پر مسلمانوں کی زکواۃ جمع ہوتی رہتی ہے اور اس پر ان تمام اصناف کے حقوق کی ادائی لازمی ہو جاتی ہے - نیز اس کے پاس ایسے اعوان و انصار (مددگار کارکن) بھی ہوتے ہیں جو یہ خدمت اس کے لئے ممکن بنا سکتے ہیں - لیکن جس کو یہ سہولتیں حاصل نہ ہوں اور وہ صرف اپنی زکواۃ ہی کا ذمہ دار ہو تو وہ اگر اسے دیگر مدوں کو چھوڑ کر کسی ایک مد میں بھی خرچ کر دے تو بقول ان علماء کے جن کے نام ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اس کی زکواۃ ادا ہو جائے گی -

(۱۸۵۰) اس ضمن میں بنیاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث ہے جس میں آپؐ نے زکواۃ کا ذکر فرماتے ہوئے کہا: "یہ اُن (مسلمانوں) کے امیروں سے لی جائے گی"۔ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زکواۃ کا ایک ہی مصرف اور ایک ہی مد بیان فرمایا۔ پھر اس کے بعد جب آپؐ کے پاس مال آیا تو آپؐ نے اسے محتاجوں کے علاوہ دوسری صنف "مؤلفۃ القلوب" میں دے دیا جو اقرع بن حابس، عُیَینہ بن حصن، علقمہ ابن علاثہ اور زید الخیل پر مشتمل تھی۔ ان لوگوں میں حضورؐ نے وہ سونے کا ڈلا تقسیم کر دیا جو حضرت علیؓ نے یمن والوں کے اموال میں سے بھیجا تھا اور اہلِ یمن سے جو مال لیا جاتا تھا وہ صدقہ ہوتا تھا۔ بعدازاں آپؐ کے پاس کچھ اور مال آیا تو اسے آپؐ نے تیسری مد میں دے دیا جو مقروض و تاوان رسیدہ لوگوں کی ہے۔

(۱۸۵۱) اس ضمن میں آپؐ نے قَبِیصہ بن مخارق سے اس تاوان کے متعلق، جو اس نے اپنے ذمہ لیا تھا، یہ فرمایا: "تم اتنی دیر ٹھہرو کہ ہمارے پاس صدقہ (کا مال) آجائے پھر یا تو ہم تمہارے بار کو کم کرانے میں تمہاری مدد کریں گے یا پھر اس پورے بار کو ہم اپنے ذمہ لے لیں گے۔"

اور یہ تمام احادیث اپنے مقامات پر پہلے بیان کی جا چکی ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زکواۃ دینے میں بعض مدوں کو بعض پر ترجیح دی تھی۔

(۱۸۵۲) الغرض امام کو اختیار ہے کہ وہ ان تمام اصناف میں زکواۃ کی تقسیم کرے یا ان میں سے بعض اصناف کو بعض پر خصوصیت بخشتے ہوئے ترجیح دے دے۔ بشرطیکہ یہ عمل پوری معلومات حاصل کرنے اور پوری کوشش کر لینے کے بعد کیا گیا ہو اور اُس نے اِس میں اپنی مرضی کو داخل نہ کیا ہو اور نہ حق سے انحراف کیا ہو۔ یہی صورت امام کے علاوہ دوسروں کے لئے بھی ہے۔ بلکہ دوسروں کے لئے تو اس بارے میں اور زیادہ وسعت و گنجائش ہے۔ ان شاء اللہ۔

باب

رشتہ داروں کو زکواۃ دینے کا بیان۔ نیز یہ کہ ان میں سے کون اس کا مستحق ہے اور کون نہیں

محتاج و ضرورتمند رشتہ داروں کو زکواۃ دی جا سکتی ہے

(۱۸۵۳) عطاء کہتے ہیں کہ میں نے ابن عباس رضؓ کو یہ کہتے سنا: "اگر کسی شخص کے رشتہ دار محتاج ہوں تو وہ انہیں زکواۃ دے گا۔"

(۱۸۵۴) عبدالخالق بن سلمہ کہتے ہیں کہ میں نے سعید بن المسیّب سے زکواۃ کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے کہا: "جنہیں میں زکواۃ دوں ان میں مجھے سب سے زیادہ پسندوہ یتیم ہے جو میری زیر نگرانی ہو اور میرا قریبی عزیز جو محتاج ہو۔"

اپنے زیرِ نگرانی یتیم رشتہ دار بچوں کو زکواۃ دی جا سکتی ہے

(۱۸۵۵) ابراہیم کہتے ہیں کہ عبداللہ ابن مسعود رضؓ کی اہلیہ نے ان سے اپنے زیورات کی زکواۃ کے بارے میں سوال کرتے ہوئے کہا: "کیا میں یہ زکواۃ اپنے ان یتیم بھتیجوں کو دے سکتی ہوں جو میری نگرانی میں ہیں؟" تو اُنہوں نے کہا: "ہاں۔"

(۱۸۵۶) ابراہیم سے علقمہ کی وساطت سے ایسی ہی روایت عبداللہ اور ان کی اہلیہ سے ہے۔

(۱۸۵۷) عبدربہ نمیری کہتے ہیں کہ میں نے حسن سے دریافت کیا: "کیا میں اپنے

اپنے محتاج بھائی کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے

بھائی کو اپنے مال کی زکوٰۃ دے سکتا ہوں؟" تو انہوں نے کہا: "ہاں اور بڑی خوشی سے"۔

زکوٰۃ اس رشتہ دار کو دی جاسکتی ہے جو مزکّی کے عیال میں شامل نہ ہو

(۱۸۵۹) ابراہیم بن ابی حفصہ راوی ہیں کہ میں نے سعید بن جُبیر سے دریافت کیا: "کیا میں اپنی خالہ کو زکوٰۃ دے سکتا ہوں؟" تو انہوں نے کہا: "ہاں، تاوقتیکہ تم اس پر دروازہ بند نہ کردو۔"

ابوعبیدؒ:۔ اس سے ان کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمہارے عیال میں شامل نہ ہو۔[۱]

(۱۸۶۰) حسن کہتے ہیں: "آدمی اپنی زکوٰۃ ان رشتہ داروں کو دے سکتا ہے جو اس کے عیال میں شامل نہ ہوں۔"

(۱۸۶۱) عطاء کہتے ہیں اگر آدمی کے رشتہ دار اس کے ان عیال میں شامل نہ ہوں جن کی وہ پرورش کرتا ہے تو وہ رشتہ دار دوسروں کے مقابلہ میں اس کی زکوٰۃ کے زیادہ مستحق ہوں گے بشرطیکہ وہ محتاج ہوں۔"

(۱۸۶۲) ابن عباسؓ سے روایت ہے: "اگر تم زکوٰۃ میں سے کسی ایسے شخص کو نہ دو جو تمہارے عیال میں شامل ہو (یعنی جس کی کفالت و پرورش اور دیکھ بھال تمہارے ذمہ ہو) تو پھر کوئی مضائقہ نہیں ہے۔"

عیال میں شامل ہونے والے کو زکوٰۃ نہ دینے کی علّت

(۱۸۶۳) ابوعبیدؒ:۔ مجھ سے عبدالرحمٰنؒ نے کہا: لوگوں نے یہ (یعنی عیال کو زکوٰۃ دینا) اس لئے ناپسند کیا ہے کہ اگر کوئی شخص ان (رشتہ داروں) کا خرچ اپنے ذمہ لے لے اور انہیں اپنے اندر شامل کرلے اور پھر بعد میں ان پر کئے ہوئے خرچ کو زکوٰۃ میں شمار کرے تو ایسی شکل ہو جائے گی کہ جیسے اس نے زکوٰۃ کے ذریعہ اپنا مال بچانے کی کوشش کی۔"

---

[۱] اس کی تفسیر اگلے نمبروں میں تا ۱۸۶۴ دیکھئے۔

اگر سلطان نے کسی عزیز کا خرچ برداشت کرنے پر مجبور کر دیا ہو تو اُسے زکواۃ دینا مکروہ ہے

(۱۸۶۴) ابو عبیدؒ:۔ اور مجھ سے عبداللہ بن داؤد نے کہا: "یہ صورت اس وقت مکروہ ہو جائے گی جبکہ سلطان نے اس شخص کو ان کا خرچ برداشت کرنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن اگر اسے مجبور نہ کیا گیا ہو تو پھر کوئی مضائقہ نہیں۔"

ابو عبیدؒ:۔ عیال کے مفہوم پر (ان دونوں حضرات) عبدالرحمٰن اور ابن داود نے اس طرح اظہارِ خیال کیا ہے، اور جس کی مرضی ہو اس کے سامنے یہ دو مسلک بھی موجود ہیں۔

عیال سے کون مراد ہے

(۱۸۶۵) ابو عبیدؒ:۔ لیکن میرا پسندیدہ مسلک ان دونوں سے جُداگانہ ہے، اور وہ یہ کہ میرے نزدیک اس موضوع پر بنیادی چیز یہ ہے کہ "عیال" سے مراد تمام وہ افراد ہیں جن کی نگہداشت، کفالت و پرورش عیالدار پر واجب ہو اور ان کے حقوق کی ادائی میں اس کے لئے تساہل برتنے کی گنجائش نہ ہو۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے زکوٰۃ کے بیان میں فرمایا: "جن کی تم پرورش ونگرانی (عیالداری) کرتے ہو ان سے (خرچ میں) ابتداء کرو۔" پھر ہمارے پاس آپؐ سے اس روایت کی تفسیر بھی آئی ہے جو ہم کسی دوسری جگہ بیان کر آئے ہیں، جس میں مذکور ہے: "ایک شخص آیا اور اس نے عرض کی: "یا رسول اللہؐ! میرے پاس ایک دینار ہے" تو آپؐ نے فرمایا: "اسے اپنی ذات پر خرچ کرو"۔ اس شخص نے کہا: "میرے پاس ایک اور ہے"۔ آپؐ نے فرمایا: "اسے اپنے اہل پر خرچ کرو"۔ اس نے کہا: "میرے پاس ایک اور ہے"۔ آپؐ نے فرمایا: "اسے اپنی اولاد پر خرچ کرو"۔ اس شخص نے کہا: "میرے پاس ایک اور ہے"۔ آپؐ نے فرمایا: "اسے اپنے خادم پر خرچ کرو"۔ اس شخص نے کہا: "میرے پاس ایک اور ہے؟" آپؐ نے فرمایا: "اس کے (خرچ کے بارے میں تم زیادہ سمجھ دار یا زیادہ جاننے والے ہو۔"

(۱۸۶۶) اور اسی سے مشابہ وہ واقعہ ہے جس میں آپؐ نے، ہند بنت عُتبہ

کے اس سوال پر کہ ابوسفیان بخیل آدمی ہے کیا میں اس کے مال میں سے لے سکتی ہوں؟ فرمایا تھا: اتنا لے لو جو تمہیں اور تمہارے بچوں کو عرفِ عام کے مطابق کفایت کرے"۔

ابو عبیدؒ میں نے یہ روایت ابو معاویہ سے سُنی وہ اس کی روایت ہشام بن عروۃ سے اُن کے والد اور حضرت عائشہؓ کے واسطہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کرتے ہیں۔

(۱۸۶۷) **ابو عبیدؒ:**۔ بناء بریں (عیال) اہل (بیوی) اور اولاد پر مشتمل ہے نیز) اسی طرح والدین بشرطیکہ وہ ضرورتمند و محتاج ہوں تو ان کے آسودہ حال لڑکے پر ان کی عیالداری (پرورش وکفالت) فرض ہے اسی طرح جیسے کہ وہ اپنی اولاد اور اپنی بیوی کی عیالداری وکفالت کرتا ہے۔ اس ضمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت شدہ سنت موجود ہے۔

(۱۸۶۸) اور وہ یہ ہے "بے شک آدمی کی اولاد اس کی کمائی میں سے ہے"۔

اس مضمون کی احادیث بکثرت مستفیض ہیں:

یہی سُنن ہمارے نزدیک آدمی کے اس عیال کے درمیان جس کی عیالداری وکفالت اس پر لازم ہے اور ان دیگر لوگوں کے درمیان حد فاصل قائم کرتی ہیں۔ ان کی رو سے عیال مشتمل ہے والدین، اولاد، بیوی اور غلام پر۔ چنانچہ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اس کی زکوٰۃ میں سے کوئی حصہ نہیں ملے گا۔ اگر کوئی شخص ان میں سے کسی کو اپنی زکوٰۃ میں سے کچھ دے گا تو اس کی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔ اس لئے کہ یہ لوگ ان حقوق کی بناء پر جو اللہ تعالیٰ نے اس کے مال پر زکوٰۃ کے علاوہ واجب قرار دئیے ہیں، اس کے مال میں شریک و حصہ دار ہیں۔ پھر ان سب حقوق و فرائض کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ ایک جداگانہ فرض مقرر فرمایا۔ اب اگر وہ شخص زکوٰۃ ان حقوق والوں میں دے رہا ہے تو وہ اس طرح ایک حق کو ادا کر کے دو فرض ادا کرنا چاہتا ہے۔ اور یہ ناجائز و ناروا ہے۔ بناء بریں خصوصی طور پر یہ لوگ تمام مسلمانوں کے نزدیک مستحقین زکوٰۃ کی مد سے خارج ہیں البتہ ان کے سوا جتنے محرم یا غیر محرم رشتہ دار ہیں تو ان کی عیالداری وکفالت از روئے کتاب و سنت

دراصل اس پر واجب نہیں ہے۔

(۱۸۶۹) یہی فیصلہ مالک بن انس اور اہلِ حجاز کا ہے۔

عیال کے سلسلہ میں محرم رشتہ دار اور غیر محرم رشتہ دار میں اختلاف

(۱۸۷۱) لیکن اہلِ عراق اس سے اختلاف کرتے ہیں، وہ یا ان میں سے بعض کا قول ہے: "محرم رشتہ دار کو اپنے رشتہ دار پر خرچ کرنے کے لئے مجبور کیا جائے گا"

ابو عبیدؒ:- میرے نزدیک قول اول کو ترجیح حاصل ہے۔ لہٰذا ان (رشتہ داروں) کو زکواۃ دینے والے کی زکواۃ ادا مانی جائے گی بشرطیکہ وہ اس کے مستحق ہوں بلکہ ایسا شخص (یعنی مستحق رشتہ داروں کو زکواۃ دینے والا) مخیر و محسن اور اپنے فریضہ کی ادائی میں نیکوکار مانا جائے گا۔

(۱۸۷۲) اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "اگر مسکین کو صدقہ دیا جائے تو وہ صرف صدقہ ہے لیکن یہی جب رشتہ دار کو دیا جائے تو صدقہ کے ساتھ صلہ رحمی بھی ہے۔"

ابو عبیدؒ: یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے "صدقہ" فرمایا جو فرض زکواۃ اور نفل خیرات دونوں کے لئے عام ہے اور آپؐ نے اس بارے میں فرض یا نفل کی شرط نہیں لگائی۔

(۱۸۷۳) یہی بات میرے نزدیک بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اس بارے میں میں یہ نہیں دیکھوں گا کہ مال والے کو ان پر خرچ کرنے کا پابند کیا گیا ہے یا نہیں، نہ یہ کہ وہ لوگ اپنے بدلوں کے ساتھ (جسمانی طور پر) اس کے عیال میں شامل ہیں یا نہیں، یہاں ہم صرف اصل فرضیت کو مدِنظر رکھیں گے۔

آپ دیکھ چکے ہیںؐ کہ عبداللہ ابن مسعودؓ نے اپنی بیوی کو اجازت دے دی تھی کہ وہ اپنی زکواۃ اپنے بھتیجوں کو دے دیں حالانکہ انھوں نے سوال کرتے وقت انہیں

ؐ۔ دیکھئے نمبر ۱۸۵۵

انہیں یہ بھی بتادیا تھا کہ وہ بھتیجے ان کی زیرِ نگرانی ہیں، کیا دکسی کے عیال ہیں، شامل ہونے کے لئے اس سے زیادہ اور بھی کسی چیز کی ضرورت ہے کہ وہ اس کی زیرِ نگرانی تربیت پا رہے ہوں؟

یہی صورت سعید بن المسیّب کے اس قول میں ہے: "میرے زیرِ نگرانی رہنے والا یتیم" اور میرا وہ عزیز جو محتاج ہو" (دیکھئے نمبر ۱۸۵۴)

(۱۸۷۴) **ابو عبیدؒ**:- اس میں جو صورت جائز ہے وہ یہ ہے کہ مثلاً ایک شخص کا قریبی رشتہ دار یا گہرا دوست ضرورت مند و محتاج ہو جائے۔ اور باایں ہمہ وہ ان لوگوں میں سے نہ ہو جن کی کفالت اس کے ذمہ فرض ہے۔ اور اس شخص کے دل میں آئے کہ وہ اسے اپنے گھر میں شامل کر کے رضاکارانہ اسے اپنے عیال میں داخل کر لے۔ پھر بعد میں اس کا ارادہ بدل جائے اور وہ اسے اپنے خرچ سے الگ کرنا چاہے تاکہ وہ اپنی پہلی حالت پر چلا جائے، پھر بعد ازاں اگر وہ شخص اسے اپنی زکواۃ میں سے کچھ دینا چاہے جیسے کہ وہ کسی غیر کے ساتھ سلوک کرتا ہے تو جہاں تک میری معلومات ہے تمام اہلِ علم کے نزدیک اس طرح اس کی زکواۃ ادا ہو جائے گی بلکہ قریب ترین عزیز بموجب حدیث نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) بہ نسبت دور کے آدمی کے اس کی زکواۃ کا زیادہ سزاوار ہے۔ آپؐ نے فرمایا ہے: "مسکین کو صدقہ (و زکواۃ) تو صرف صدقہ ہی ہے لیکن یہی رشتہ دار کے لئے دو حیثیتیں رکھتا ہے ایک صدقہ (و زکواۃ) دوم صلہ رحمی۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے ان صحابہؓ و تابعینؒ کا ذکر بھی اس باب میں کر دیا ہے جنہوں نے اس کی اجازت دی ہے۔

باب

عورت کا اپنے مال کی زکوٰۃ میں سے اپنے شوہر کو دینے کا بیان

(۱۸۷۵) ابوہریرہؓ راوی ہیں: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز سے فراغت کے بعد (لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے تو) ان عورتوں کی طرف تشریف لے گئے جو مسجد میں تھیں اور اُن کے سامنے کھڑے ہو کر فرمایا: "اے زمرۂ خواتین! میں نے کبھی کسی کو عقل و دین کی کمی کے باوجود تم سے زیادہ عقلمندوں کے دلوں کو اُڑا لے جانے والا نہیں پایا۔ اور مجھے یہ دکھلایا گیا ہے کہ روزِ قیامت جہنمیوں میں تمہاری اکثریت ہے۔ لہٰذا جن ذرائع سے بھی تم سے ممکن ہو اللہ کا تقرب حاصل کرنے کی کوشش کرو"۔ راوی کہتے ہیں کہ ان خواتین میں عبداللہ بن مسعودؓ کی بیوی بھی موجود تھیں۔ وہ عبداللہ بن مسعودؓ کے پاس واپس گئیں اور جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا تھا ان سے بیان کیا پھر وہ اپنے زیورات لے کر جانے لگیں تو انہوں نے کہا: "یہ زیورات لے کر کہاں جا رہی ہو؟" انہوں نے کہا: "میں ان کے ذریعہ اللہ اور اس کے رسول کا تقرب حاصل کروں گی۔ تاکہ اللہ مجھے جہنمیوں میں نہ کر دے"۔ انہوں نے کہا: "ادھر آؤ اور یہ زیورات مجھے اور میری اولاد کو خیرات کر دو کہ بے شک ہم اس کے مستحق ہیں"۔ انہوں نے کہا: "نہیں، اللہ کی قسم، جب تک میں انہیں لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نہیں پہنچوں گی کچھ نہیں کروں گی"۔ راوی کہتا ہے کہ وہ گئیں اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حاضر ہونے کی اجازت

طلب کی۔ لوگوں نے آپؐ سے عرض کی "یا رسول اللہ! یہ زینب آپؐ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتی ہیں"۔ آپؐ نے فرمایا "یہ زینبوں میں سے کون سی (زینب) ہیں؟" لوگوں نے عرض کیا "عبداللہ بن مسعودؓ کی بیوی" تو آپؐ نے فرمایا "انہیں اجازت دے دو"۔ چنانچہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور انہوں نے کہا: یارسول اللہ! میں نے آپ کی بات سنی تو واپس جاکر میں نے وہ بات ابن مسعودؓ کو بتادی۔ پھر میں اللہ اور آپؐ کا تقرب حاصل کرنے کے لئے اپنے زیورات لے کر اس اُمید پر نکلی کہ اللہ مجھے جہنمیوں میں سے نہ کرے، تو ابن مسعودؓ نے مجھ سے کہا "یہ زیورات مجھے اور میری اولاد کو خیرات کر دو کہ بے شک ہم اس کے مستحق ہیں"۔ میں نے کہا کہ میں رسول اللہؐ کی اجازت کے بغیر ایسا نہ کروں گی۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: "یہ زیورات اسے اور اس کے بچوں کو خیرات کر دو کہ بے شک وہ اس کے مستحق ہیں"۔ پھر انہوں نے کہا "یارسول اللہؐ! یہ تو فرمائیے کہ جب آپؐ ہمارے سامنے وعظ فرمانے کے لئے کھڑے ہوئے تو آپؐ نے یہ فرمایا تھا: "میں نے کبھی کسی کو باوجود کم عقلی اور دینی کمی کے تم سے زیادہ عقلمندوں کے دلوں کو اُڑا لے جانے والا نہیں پایا"۔ یارسول اللہؐ! یہ تو فرمائیے کہ ہمارے دین اور ہماری عقلوں میں کیا نقصان اور کمی ہے؟" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: میں نے تمہارے دین میں کمی اور کوتاہی کا جو تذکرہ کیا تھا تو اس کا سبب حیض کا عارضہ ہے۔ تم میں سے ایک اس مدت میں بے نماز پڑھے اور بے روزہ رکھے ——— جب تک اللہ چاہتا ہے ——— رہتی ہے۔ یہ تو ہوا تمہارے دین کا نقصان۔ باقی رہا میرے بیان کا وہ حصّہ جو تمہاری عقلوں کی کوتاہی سے متعلق تھا سو اس کا ثبوت تم عورتوں کی "گواہی" ہے کہ ایک عورت کی گواہی نصف گواہی رکھی گئی ہے۔"

(۱۸۷۶) ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم عیدالفطر یا عیدالاضحیٰ کے موقع پر عیدگاہ کے لئے نکلے۔ پھر نماز پڑھی بعدازاں لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے انہیں وعظ و نصیحت فرمائی اور انہیں صدقہ و خیرات کا حکم دیا پھر عورتوں کے پاس سے گزرے اور فرمایا: "صدقہ دو" پھر وہی مضمون بیان کیا جو حضرت

ابوہریرہؓ کی حدیث میں گذرا، لیکن اس میں یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ابن مسعودؓ نے سچ کہا، تیرا شوہر اور اس کی اولاد دیگر لوگوں کے مقابلہ میں تیرے صدقہ و خیرات کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔"

(۱۸۷۷) ایک اور سند سے ریطہ بنت عبداللہ (ابن معاویہ) زوجہ عبداللہ بن مسعود کی وساطت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی مضمون کی روایت ہے، لیکن اس کے الفاظ یہ ہیں: "وہ بولیں: میرے شوہر اور میری اولاد کے پاس کوئی مال نہیں ہے" تو آپؐ نے فرمایا: "ان پر تو جو کچھ خرچ کرے گی اس پر تجھے بدلہ ملے گا۔" اس روایت میں آپؐ کا یہ قول بھی نہیں ہے: "میں نے کبھی کسی کو باوجود عقل اور دین کی کمی کے.... الخ"

(۱۸۷۸) ایک اور سند سے عبداللہ بن دینار نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی مضمون کی روایت کی ہے۔

عورت اپنے شوہر کی اولاد کو بھی زکوٰۃ دے سکتی ہے

ابوعبیدؒ:- ہمارے نزدیک محفوظ اور قابلِ ترجیح ان لوگوں کا قول ہے جنہوں نے اولاد کو عورت کے بجائے عبداللہ بن مسعود کی اولاد بتایا ہے، جیسے کہ ابوہریرہؓ اور ابوسعید خدریؓ کی روایات میں ہے۔ اس لئے کہ یہ سنت نہیں ہے کہ

ماں باپ اپنی اولاد کو زکوٰۃ نہیں دے سکتے

والدین اپنی اولاد کو زکوٰۃ دیں، اور جہاں تک میرا علم ہے کسی نے بھی نہیں کہا کہ ایسی زکوٰۃ ادا مانی جائے گی۔[1]

---

[1] ۔ عبداللہ بن مسعودؓ کی زوجہ کا نام بعض نے ریطہ یا رائطہ اور بعض نے زینب بتایا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ ان کا نام زینب تھا اور لقب رائطہ۔ یہ ہنرمند اور کاروبار کرنے والی خاتون تھیں۔ اُن کے شوہر عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کے بیٹے نادار تھے وہ اپنے شوہر اور ان کی اولاد پر خرچ کرتی تھیں تو ان کے پاس صدقہ و خیرات کے لئے رقم نہ بچتی تھی۔ اپنی اس کیفیت کا اظہار جب انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپؐ نے فرمایا: "تم ان پر خرچ کرو، تمہیں ان پر خرچ کرنے کا ثواب ملے گا۔"

الاصابہ لابن حجر ۸: ۸۹ و اسد الغابہ لابن الاثیر ج ۵: ۴۷۰

اہلِ عراق کا قیاس کہ جس طرح مرد اپنی بیوی کو زکواۃ نہیں دے سکتا عورت بھی اپنے شوہر کو زکواۃ نہیں دے سکتی اور اس پر ابو عبید کا کلام

(۱۸۷۹) رہا عورت کا اپنے شوہر کو زکواۃ دینے کا مسئلہ تو بعض اہلِ عراق کا خیال ہے کہ ایسی عورت کی زکواۃ ادا نہ ہوگی۔ یہ لوگ بیوی کے شوہر کو زکواۃ دینے اور شوہر کے بیوی کو زکواۃ دینے کو یکساں مشابہ قرار دیتے ہیں۔

حالانکہ از روئے سنت و عقل و نظر ہمارے نزدیک یہ دونوں صورتیں مختلف ہیں۔

(۱۸۸۰) جہاں تک سنت کا تعلق ہے وہ ان احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے واضح ہوجاتی ہے جو اوپر ہم عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کی بیوی کے بارے میں بیان کر چکے ہیں۔

(۱۸۸۱) اب رہا عقل و نظر کے اعتبار سے ان دونوں صورتوں کا اختلاف سو وہ اس بات سے صاف ظاہر ہے کہ مرد کو عورت کے نان نفقہ پر مجبور کیا جائے گا خواہ وہ عورت امیر و آسودہ حال ہی کیوں نہ ہو لیکن اس کے برخلاف عورت کو مرد کے نان نفقہ پر مجبور نہیں کیا جائے گا خواہ وہ مرد تنگدست ہی کیوں نہ ہو۔ آپ ہی بتائیے کہ ان دونوں صورتوں میں اس سے زیادہ شدید اختلاف اور کیا ہوسکتا ہے۔

کسی کو زکواۃ دینے یا نہ دینے کے بارے میں فیصلہ کن اصول

ہمارے نزدیک ان لوگوں کے درمیان جسے آدمی زکواۃ دے سکتا ہے اور جسے وہ زکواۃ نہیں دے سکتا، فیصلہ کن اصول یہ ہے کہ جس کی کفالت کرنا اور جس کے اخراجات برداشت کرنا کسی شخص پر فرض ہو ایسے شخص کو اس کی زکواۃ میں سے کوئی حصہ نہیں ملے گا۔ اور جس پر اس کی زکواۃ حلال ہو اس کی کفالت اس پر فرض نہیں ہوگی، اور یہ اہلِ حجاز کا قول ہے۔

(۱۸۸۲) لیکن اہلِ عراق کے نزدیک رشتہ داروں میں سے ہر ذی محرم کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ اپنے ذی محرم کی کفالت کرے بشرطیکہ وہ (محرم رشتہ دار) کمسن محتاج یا

معمرا پاہج ہو لیکن بایں ہمہ وہ والدین اور اولاد کو مستثنیٰ قرار دیتے ہوئے ان سب (رشتہ داروں) کو اس کی زکواۃ کا مستحق بھی سمجھتے ہیں۔

(۱۸۸۳) **ابو عبیدؒ**: ہم اس بارے میں قول اوّل کو ترجیح دیتے ہیں جس کی رو سے "کفالت فرض ہونا" اور "زکواۃ دینا" دو ایسے کام ہیں جو کسی ایک شخص کے مال میں یکجا نہیں ہو سکتے۔ اور اس بارے میں مجھے کتاب وسنت میں کوئی بنیاد نہیں ملتی۔ ایسے شخص کے وہ رشتہ دار (جن پر اس کی کفالت فرض نہیں) عام مومن محتاجوں کے زمرہ میں شامل ہوں گے جن کے حقوق فئے، خمس اور زکواۃ کی مد سے واجب الادا ہوں گے لیکن جہاں تک کسی شخص کے خصوصی مال کا تعلق ہے اس میں سے ان کے کچھ حقوق نہ ہوں گے۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ اسے ان اعزہ واقرباء کی صلہ رحمی کی طرف توجہ اور ترغیب دلائی جائے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو وہ صلہ رحمی کی خلاف ورزی کر رہا ہے اور اس ضمن میں اس پر کوئی فیصلہ مجبوراً نہیں تھوپا جائے گا۔ البتہ والدین، اولاد، بیوی اور غلام کا حکم اس سے مستثنیٰ ہے اور اس کی کفالت نہ کرنے والے کو ان کی کفالت کرنے کے لئے لازمی حکم دیا جائے گا۔ اس لئے کہ یہ لوگ اس کی زکواۃ کے نہیں بلکہ اس کے نان نفقہ کے مستحق ہیں۔ اور ان کے علاوہ اس کے دیگر اقارب اس کی کفالت ونفقہ کے نہیں بلکہ زکواۃ کے مستحق ہیں۔

آدمی پر جن کا نان نفقہ واجب ہو وہ اس کی زکواۃ کے مستحق نہیں ہو سکتے

لہٰذا ہر دو فریق میں یہی حدِ فاصل ہے۔

باب

زکواۃ جلدی یا قبل از وقت ادا کرنے کا بیان

زکواۃ پیشگی لے لینا یا ادا کرنا

(۱۸۸۴) حکم بن عتیبہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے حضرت عمرؓ کو زکواۃ وصول کرنے کے لئے بھیجا۔ چنانچہ وہ حضرت عباسؓ کے پاس ان کے مال کی زکواۃ مانگنے کے لئے پہنچے، تو حضرت عباسؓ نے ان سے کہا: "میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو پہلے ہی دو سال کی زکواۃ ادا کر چکا ہوں" حضرت عمرؓ نے یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو بتائی تو آپؐ نے فرمایا: "میرے پچا نے سچ کہا۔ ہم ان سے دو سال کی زکواۃ پہلے ہی لے چکے ہیں۔"[1]

(۱۸۸۵) **ابو عبیدؒ**: حضرت علیؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے ایسی ہی روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے حضرت عباسؓ سے دو سال کی زکواۃ پیشگی لے لی تھی۔"

(۱۸۸۶) حفص بن سلیمان کہتے ہیں کہ میں نے حسن سے دریافت کیا: "کیا تین سال کی زکواۃ یکمشت نکال سکتا ہوں" تو انھوں نے اس میں کوئی مضائقہ نہ سمجھا۔

۱۸۸۷ } ہُشیم نے ابراہیم سے اور حسن سے روایت کی ہے کہ وہ دونوں
۱۸۸۸ } جلدی زکواۃ نکال دینے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھتے تھے بشرطیکہ کوئی زکواۃ کا مستحق مل جائے۔

---

[1] - فتح الباری (۳: ۲/۴) میں امام ابن حجرؒ نے حضرت عباسؓ سے دو سال کی زکواۃ لی جانے والی روایات پر بحث کی ہے اور تقریباً ہر ایک پر جرح کی ہے۔ مجموعی طور پر وہ اس کی صحت کو بعید نہیں سمجھتے۔ زکواۃ کی تعجیل و تاخیر پر ابو عبید کا محاکمہ نمبر ۱۸۹۷ کے تحت دیکھئے۔

(۱۸۸۹) سعید بن جُبَیر سے روایت ہے کہ وہ زکواۃ جلدی ادا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے بشرطیکہ اس کا مستحق مل جائے۔

(۱۸۹۰) یوسف بن ابی حکیم کہتے ہیں کہ میں نے عطاء بن ابی رباح سے قبل از وقت زکواۃ ادا کرنے کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے کہا "پہلے دے دو اور دیر میں نہ دو۔"

(۱۸۹۱) جعفر بن سلیمان کہتے ہیں کہ میں نے حسن سے دریافت کیا: "کیا میں ایک بار میں اپنے مال کی دو سال کی زکواۃ نکال سکتا ہوں؟ تو انہوں نے کہا: "اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔"

ابو عبیدؒ: ان تمام آثار پر ہمارے ہاں عمل جاری ہے۔ ان کی رو سے زکواۃ کو جلدی ادا کرنے سے وہ ادا ہو جاتی ہے ساتھ ہی اس طرح ادا کرنے والا نیکوکار و محسن بھی ہوتا ہے۔

پیشگی زکواۃ لینے کے مسئلہ میں توقف

اور جہاں تک ہماری معلومات ہے ابن سیرین کے علاوہ کوئی اس بارے میں شک نہیں کرتا۔ وہ بھی اسے مکروہ نہیں سمجھتے بلکہ اس بارے میں خاموشی اختیار کئے ہوئے ہیں۔

پیشگی زکواۃ دینے کی مخالفت اور اس پر کلام

(۱۸۹۲) البتہ مالک بن انسؒ اس (پہلے دی ہوئی زکواۃ) کو ناکافی قرار دیتے ہیں۔ وہ اسے نماز اور روزہ سے مشابہ قرار دیتے ہیں۔

(۱۸۹۳) ابن عون کہتے ہیں کہ محمد سے جلدی زکواۃ دینے کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: "مجھے نہیں معلوم یہ کیا ہوتی ہے؟"

ابو عبیدؒ: ہمارے خیال میں جن حضرات نے اس بارے میں سکوت و توقف اختیار کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے زکواۃ کو نماز سے مشابہ قرار دیا اس لئے کہ نماز قبل از وقت جائز نہیں ہوتی۔ ان حضرات کو اندیشہ ہوا کہ کہیں زکواۃ بھی نماز

کی طرح نہ ہو۔

لیکن اس باب میں ہماری رائے یہ ہے کہ سنت نے ان میں تفریق کردی ہے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ نماز کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقررہ اوقات اور معینہ حدود بیان فرمادئے ہیں۔ اور آپؐ نے ان اوقات کو حضرت جبریل علیہ السلام سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے آپؐ کی ان نمازوں کے اوقات میں امامت کی اور پھر ان اوقات کے حدود بھی آپ کے لئے مقرر فرمائے۔ بنا ربریں نمازیں ان مقررہ اوقات وحدود سے آگے پیچھے نہیں کی جاسکتیں۔

(۱۸۹۴) لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے ایسی کوئی روایت نہیں پہنچی کہ آپؐ نے زکواۃ کے لئے بھی زمانہ میں سے کوئی خاص اور معین وقت مقرر کیا ہو۔ اس کے برخلاف آپؐ نے ہر سال گذرنے پر زکواۃ ایک بار مقرر فرمائی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کو مختلف زمانوں میں مال حاصل ہوتا ہے۔ کسی شخص کو اس مہینہ میں بقدر نصاب ملتا ہے اور کسی کو دوسرے مہینہ میں اور تیسرے کو ان دونوں کے بعد کے مہینہ میں۔ اسی طرح سال کے مختلف مہینوں میں مختلف لوگوں کا حال ہوتا ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک پر زکواۃ اگلے سال کے اس ماہ میں عائد ہوگی (جس میں کہ اسے بقدر نصاب مال ملا تھا) چنانچہ ملکیت کے زمانہ کے اختلاف کی وجہ سے ان کے زکواۃ نکالنے کا زمانہ بھی مختلف ہوگا۔ للہٰذا یہ کیونکر جائز ہوسکتا ہے کہ سب لوگوں کے لئے زکواۃ ادا کرنے کا ایک مقررہ مشترکہ زمانہ مقرر کردیا جائے؟ جبکہ نماز تمام لوگوں پر ایک ساتھ بیک وقت واجب ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء نے وقت آنے سے پہلے زکواۃ ادا کرنے کا فتویٰ دے دیا ہے اور انہوں نے زکواۃ اور نماز کو جداگانہ حیثیت دی ہے اور اس کے ساتھ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے چچا حضرت عباسؓ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے جو روایت ہے وہ بھی اس کی تائید کررہی ہے۔

(۱۸۹۵) اسی قول کی تائید علماء عراق وشام بھی کرتے ہیں اور اسی پر لوگوں کا عمل ہے اور جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں صرف مالک بن انس اور اہل حجاز اس سے مستثنیٰ ہیں۔

زکواۃ میں تاخیر بھی کی جاسکتی ہے

(۱۸۹۶) ابو عبیدؒ:۔ یہی صورت مویشیوں کی زکواۃ کو دیر میں ادا کرنے کی بھی ہے بشرطیکہ امام اپنی صوابدید کی بناء پر یہ سمجھے کہ جو قحط یا بحرانی کیفیت طاری ہوئی ہے اس سے لوگ متاثر ہوئے ہیں اور وہ یہ فیصلہ کردے کہ سرسبزی اور فصلوں کے بحال ہونے تک زکواۃ کی وصولی ملتوی ہے۔ اور پھر وہ آئندہ سال ان سے پورا پورا وصول کر لے، جیسے کہ حضرت عمرؓ نے "عام الرمادہ" (قحط سالی) میں کیا تھا۔ اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث مروی ہے جس سے حضرت عمرؓ کے اس عمل کو سند ملتی ہے۔

(۱۸۹۷) حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ (و زکواۃ) دینے کا حکم دیا، تو بعض طعن کرنے والوں نے کہا: ابن جمیل، خالد بن ولید اور عباس بن عبدالمطلب نے زکواۃ بند کر دی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اور اس میں بتایا عباسؓ اور خالدؓ کے زکواۃ بند کر دینے کی خبر جھوٹ ہے اور ابن جمیل کی خبر کی تصدیق فرمائی۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اور ابنِ جمیل کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے سوائے اس کے کہ وہ محتاج و نادار تھا اور اللہ نے اپنے فضل سے اور اس کے رسول نے اسے تونگری عطا فرمائی۔ رہا خالد بن ولید کا معاملہ سو لوگ خالد پر ظلم کر رہے ہیں۔ خالد تو وہ ہیں جنھوں نے اپنی زرہیں اور غلام [یا ایک روایت کے مطابق ساز و سامان] راہِ خدا میں وقف کر دئیے ہیں۔ باقی رہے عباسؓ عمّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، تو ان پر زکواۃ واجب الادا ہے اور اس کے ساتھ اتنی ہی اور۔

ابو عبیدؒ:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا "عباسؓ کی زکواۃ ان کے ذمہ واجب ہے اور اس کے ساتھ اتنی ہی اور" آپ کو یہ بتا رہا ہے کہ آپؐ نے ان سے وصولی زکواۃ کو مؤخر کر دیا تھا اور پھر اسے ایک قرض کی صورت دے دی تھی جو ان سے وصول کیا جاتا تھا۔ اس طرح پہلی حدیث (دیکھئے ۱۸۸۴) کی رو سے تو رسول اللہؐ نے ان سے پیشگی زکواۃ لے لی تھی اور اس کی رو سے آپؐ نے ان سے بعد میں زکواۃ وصول کی۔ ہو سکتا

ہے کہ ان کے ساتھ یہ دونوں شکلیں پیش آئی ہوں۔

(۱۸۹۸) بعض راویوں نے حضرت عباس رضؓ والی روایت یوں بیان کی ہے: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: جہاں تک عباس کی زکواۃ کا تعلق ہے وہ میرے ذمہ ہے اور اس کے ساتھ اتنی ہی اور۔"

اب اگر یہ روایت محفوظ وارجح ہے تو یہ ہماری اس باب میں بیان کردہ پہلی روایت کی طرح ہے جس کی رو سے قبل از وقت زکواۃ کی ادائی جائز ہے۔ بہر حال یہ دونوں صورتیں جائز ہیں بشرطیکہ امام کا اجتہاد اور اس کی صوابدید اس کی اجازت دے دیں۔ یہ ہے حضرت عباسؓ کی روایت سے متعلق علمی پہلو۔

اب رہا حضرت خالدؓ کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا یہ فرمان "انہوں نے اپنی زرہیں اور غلام راہِ خدا میں وقف کر دیے ہیں" تو اس میں تین مسنون طریقے نکلتے ہیں:۔

پہلا یہ ہے کہ یہ بھی حضرتِ عباسؓ کے واقعہ کی طرح پیشگی زکواۃ ادا کرنے کی شکل ہو۔ اس لئے کہ آپؐ نے اس واقعہ (یعنی پیشگی زکواۃ وصول کرنے) کی خبر محصل کے اپنے پاس واپس پلٹنے پر دی۔ اس سے ہم پر یہ واضح ہو گیا کہ یہ صورت اس سے قبل واقع ہوئی تھی۔ اور یہ کہ محصلوں کو زکواۃ واجب ہونے کے ساتھ ہی بھیج دیا جاتا تھا۔

دوسرا یہ ہے کہ آپؐ نے زرہیں اور غلام زکواۃ کے بدلہ میں قبول کر لئے ہوں۔ اس لئے کہ غلاموں اور زرہوں پر زکواۃ نہیں لگتی، اور یہ معلوم ہو چکا ہے کہ آپؐ نے مویشیوں یا دیگر اشیاء کی زکواۃ کے عوض انہیں (زرہوں کو) قبول کر لیا تھا۔ جیسا کہ اس کتاب کے آغاز میں بھی ہم بیان کر آئے کہ کسی چیز کی زکواۃ یا جزیہ میں مقررہ شے کے علاوہ کسی اور قسم کے (مساوی قیمت کے) مال کو قبول کر لیا جائے گا بشرطیکہ دینے والے اور جس کے لئے لیا جا رہا ہو (دونوں) کے لئے اس میں سہولت اور نفع ہو۔

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ انہوں نے تمام کی تمام زکواۃ صرف ایک مد یعنی "فی سبیل اللہ"

میں دے دی اور اسے دیگر مدوں میں تقسیم نہ فرمایا۔ ان کے اس عمل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنظرِ استحسان دیکھا۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ ہم پیشتر اس قسم کے عمل بتا چکے ہیں جس میں ایک بار اپنی زکواۃ فقیروں میں تقسیم کر دی گئی۔ دوسری مرتبہ تاوان زدہ اور مقروضوں میں اور تیسری مرتبہ مؤلفۃ القلوب میں۔ اور یہ چوتھی مثال ہے جس میں پوری زکواۃ "سبیل اللہ" میں دے دی گئی ہے۔ اور یہی صورت تمام مدوں کے ساتھ کی جا سکتی ہے۔

باب

زکوٰۃ کو اسی علاقہ میں تقسیم کرنا جہاں سے وہ لی گئی ہو نیز اس کے علاوہ دیگر علاقوں میں لے جانا اور یہ کہ زکوٰۃ میں سے پہلے دیئے جانے کا کون زیادہ مستحق ہے

جس علاقہ کی زکوٰۃ ہو پہلے وہاں کے مستحقین میں تقسیم کی جائے

(۱۹۰۰) ابراہیم کہتے ہیں: "زکوٰۃ ان لوگوں میں تقسیم کی جائے گی جو ایک گھاٹ سے پانی پیتے ہوں۔ پھر اگر اس گھاٹ والوں میں کوئی مستحق نہ ہو تو ان سے قریب تر جو گھاٹ ہو وہاں مستحق دیکھا جائے گا اور وہ زکوٰۃ ان میں تقسیم ہو گی۔" اگر وہاں بھی مستحق نہ ہو تو پھر جو ان سے قریب تر گھاٹ ہو۔"

امام علاقائی ضرورتوں کے مدِّنظر ہنگامی فیصلہ کر سکتا ہے

(۱۹۰۱) ابن جریج کہتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے عاملوں کو لکھا تھا: "زکوٰۃ کا نصف رکھ لو (—— ابو عبید یعنی مقامی مستحقین میں دینے کے لئے ——) اور نصف مجھے بھیج دو"۔ پھر انھوں نے اگلے سال یہ لکھ بھیجا: "تمام زکوٰۃ اپنے پاس رکھ لو۔"

شخصی طور پر رشتہ داری کی وجہ سے ایک علاقہ کی زکوٰۃ دوسرے علاقہ میں لے جانے کی اجازت

(۱۹۰۲) ابراہیم سے مروی ہے کہ وہ ایک علاقہ کی زکواۃ کو دوسرے علاقہ میں لے جانا ناپسند کرتے تھے الّا یہ کہ کسی اپنے رشتہ دار کو دینے کے لئے ایسا کیا جائے۔"

علاقائی ضرورت کی وجہ سے زکواۃ پر پابندی

(۱۹۰۳) فضالہ نے حسن سے بھی ایسی ہی روایت کی ہے۔

(۱۹۰۴) فرقد سبخی کہتے ہیں کہ میں اپنے مال کی زکواۃ بانٹنے کے لئے اسے لے کر مکہ کو روانہ ہوا۔ راستہ میں مجھے سعید بن جبیر ملے اور انہوں نے کہا: "اسے واپس لے جاؤ اور اپنے علاقہ ہی میں اسے تقسیم کرو۔"

(۱۹۰۵) سفیان بن سعید راوی ہیں "کسی کی زکواۃ رے سے کوفہ لائی گئی تو عمر بن عبدالعزیزؒ نے اسے رے میں واپس بھیج دیا۔"

جن لوگوں سے زکواۃ لی جائے انہی کے فقراء میں زکواۃ تقسیم کردی جائے

(۱۹۰۶) نعمان بن زبیر کہتے ہیں کہ محمد ابن یوسف نے طاؤس کو مخلاف (یمن کے قصبہ) کا عامل بنایا۔ وہ امیروں سے زکواۃ لے کر فقراء میں بانٹتے رہے۔ جب وہ فارغ ہوئے تو محمد بن یوسف نے ان سے کہا: "اپنا حساب پیش کرو۔" اس پر انہوں نے جواب دیا: "میرے پاس کوئی حساب نہیں ہے۔ میں امیر سے وصول کرتا اور مسکین کو دیتا تھا۔"

(۱۹۰۷) عمرو بن میمون کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے اپنی وصیت میں کہا تھا: "میں اپنے بعد آنے والے خلیفہ کو فلاں بات اور فلاں بات کی وصیت کرتا ہوں اور اسے وصیّت کرتا ہوں کہ وہ دیہاتی عربوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے اس لئے کہ ان لوگوں پر عربوں کا دارومدار ہے اور یہی لوگ اسلام کا بنیادی مواد ہیں۔ (میرے جانشین کو چاہیئے کہ) وہ ان کے زائد (بقدر نصاب) اموال میں سے (زکواۃ) لے اور اسے انہی کے محتاجوں میں واپس کردے۔"

ابو عبیدؒ:- ان روایات کی اصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس وصیت پر ہے جو آپؐ نے حضرت معاذؓ کو یمن بھیجتے وقت کی تھی، جس میں آپؐ نے فرمایا تھا کہ وہ اہل یمن کو اسلام اور نماز کی دعوت دیں - پھر آپؐ نے فرمایا: جب وہ تم سے ان دونوں باتوں پر کاربند ہونے کا اقرار کرلیں تو تم ان سے کہنا:" اللہ تعالیٰ نے تم پر تمہارے اموال کا صدقہ (زکواۃ) فرض کیا ہے جو تمہارے تونگروں سے لے کر تمہارے حاجت مندوں میں ہی پلٹا دیا جائے گا"

(۱۹۰۸) ایک اور سند سے ایک لمبی حدیث میں ابن عباسؓ نے بھی یہ روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ سے یہ (مذکورۃ الصدر قول) کہا تھا۔

ابو عبیدؒ:- اور اسی موضوع سے متعلق حضرت علیؓ کی یہ روایت بھی ہے۔

امیروں پر فرض ہے کہ وہ اتنی زکوٰۃ نکالیں جو فقراء کی ضروریات کے لئے کافی ہو

(۱۹۰۹) ابو جعفر محمد بن علی راوی ہیں کہ حضرت علیؓ نے فرمایا:" اللہ تعالیٰ نے آسودہ حال لوگوں کے اموال پر اتنی مقدار (زکواۃ) نکالنا فرض کیا ہے جو فقراء اور محتاجوں کی ضرورت کے لئے کافی ہو۔ اب اگر یہ لوگ بھوکے یا ننگے رہتے ہیں یا پریشان و تنگ حال ہو جاتے ہیں تو اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ امراء ان کا حق روک لیتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ پر یہ حق ہو جاتا ہے کہ ان سے محاسبہ کرے اور انہیں عذاب دے۔"

(۱۹۱۰) ابو عبیدؒ:- آج ان تمام آثار پر جملہ علماء کا اتفاق ہے کہ ملک کے ہر علاقہ کے باشندے یا گھاٹوں میں سے ایک گھاٹ سے پانی پینے والے اپنے حلقہ کی زکواۃ کے زیادہ مستحق ہیں۔ اور یہ استحقاق اس وقت تک باقی رہے گا جب تک

جب تک علاقہ میں ایک بھی محتاج ہو وہاں کی زکوٰۃ باہر نہیں جائے گی

کہ ان میں ایک یا اس سے زائد حاجتمند باقی رہیں۔ خواہ اس احتیاج کو رفع کرنے کے لئے وہاں

کی تمام زکواۃ کام میں آجائے اور محصلِ زکواۃ کو وہاں سے بغیر کچھ لئے خالی ہاتھ ہی واپس آنا پڑے۔

اس مضمون کی تفصیل و شرح ان روایات میں ملتی ہے:

(۱۹۱۱) عمرو بن شعیب کہتے ہیں کہ حضرت معاذؓ جب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے انہیں یمن بھیجا، جَندَیں رہے۔ تاآنکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اور حضرت ابوبکرؓ کے انتقال کے بعد حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور انہوں نے بھی انہیں اُن کی پہلی جگہ پر واپس بھیج دیا۔ پھر حضرت معاذؓ نے ان (حضرت عمرؓ) کے پاس لوگوں کی زکواۃ کا تہائی حصہ بھیجا تو حضرت عمرؓ نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے کہا: "میں نے تمہیں مال جمع کرنے یا جزیہ وصول کرنے کے لئے نہیں بھیجا بلکہ اس لئے مامور کیا ہے کہ تم امیر لوگوں سے وصول کرکے ان کے محتاجوں میں واپس کردو۔" اس پر حضرت معاذؓ نے کہا: "میں نے کوئی ایسی چیز آپ کو نہیں بھیجی کہ یہاں مجھے اس کا کوئی مستحق وصول کرنے والا مل رہا ہو۔" پھر اگلے سال معاذؓ نے آدھی زکواۃ انہیں بھیجی اور دونوں میں پہلی جیسی گفتگو کا تبادلہ ہوا۔ اور جب تیسرا سال گذرا تو حضرت معاذؓ نے تمام کی تمام زکواۃ ان کے پاس بھیج دی اور جواباً حضرت عمرؓ نے وہی پہلی سی بات کہی۔ تب حضرت معاذؓ نے کہا: "یہاں مجھے ایک (ضرورتمند) بھی ایسا نہیں ملتا جو مجھ سے کچھ (صدقہ و زکواۃ) لینے کا مستحق ہو۔"

جب کسی علاقہ کی زکواۃ لینے کے لئے کوئی مستحق وہاں نہ رہے تو وہاں کی زکواۃ مرکز بھیج دی جائے گی

(۱۹۱۲) سعید بن المسیّب راوی ہیں کہ حضرت عمرؓ نے معاذؓ کو بنی کلاب یا بنی سعد بن ذُبیان پر زکواۃ کا محصل بنا کر بھیجا۔ چنانچہ انہوں نے انہی (قبائل کے فقراء) میں وہ زکواۃ تقسیم کردی اور کچھ بھی نہ بچایا۔ اور اپنی گردن پر وہی بوریا رکھ کر گھر چلے جیسے لے کر نکلے تھے۔ یہ سماں دیکھ کر ان کی بیوی نے کہا: "تم جو کچھ لائے ہو اسے اُن تحائف اور سوغاتوں سے کیا نسبت ہے جو عمّال (محصلینِ زکواۃ) اپنے بال بچوں

کے لئے لاتے ہیں؟" انہوں نے جواب دیا: "میرے ساتھ ایک نگران افسر تھا۔" ان کی بیوی نے کہا: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو بکر رضؓ تو تمہیں معتمد علیہ اور امین سمجھتے تھے یہ عمر رضؓ کو کیا ہوا کہ انہوں نے تم پر نگران مسلّط کر دیا؟" پھر وہ اپنی سہیلیوں میں گئیں اور وہاں انہوں نے حضرت عمر رضؓ کے اس رویہ کی شکایت کی۔ چنانچہ یہ شکوہ حضرت عمر رضؓ تک پہنچا اور انہوں نے حضرت معاذ رضؓ کو بلا کر کہا: "کیا میں نے تمہارے ساتھ کوئی نگران افسر بھیجا تھا؟" تو انہوں نے کہا: "اپنی بیوی کے پاس خالی ہاتھ پہنچنے کا اس کے سوا میں کوئی عذر نہ پیش کر سکا۔" اس پر حضرت عمر رضؓ ہنسے اور انہیں کچھ دیتے ہوئے کہا: "یہ دے کر اسے منا لو۔"

(۱۹۱۳) ابن جریج کہتے ہیں کہ حضرت معاذ رضؓ نے "نگران افسر" سے مراد "اپنے رب" کو لیا تھا۔

(۱۹۱۴) شہاب بن عبداللہ خولانی روایت کرتے ہیں کہ سعد — جو یعلی بن اُمیّہ کے ساتھیوں میں سے تھے — چل کر مدینہ میں حضرت عمر رضؓ کے پاس آئے۔ انہوں نے سعد سے دریافت کیا: "کہاں کا قصد ہے؟" انہوں نے جواب دیا: "جہاد کا۔" حضرت عمر رضؓ نے کہا: "واپس جاؤ، یاد رکھو کہ حق کے مطابق عمل کرنا نہایت عمدہ جہاد ہے۔" جب انہوں نے پلٹنا چاہا تو حضرت عمر رضؓ نے ان سے کہا: "جب تم مال والے کے پاس پہنچو تو نہ تم بھلائی کو چھوڑو نہ اسے بھلائی فراموش کراؤ۔ تم تمام مال کو تین ٹکڑوں میں تقسیم کر دو اور مال والے کو اختیار دو کہ وہ ان میں سے ایک حصّہ پسند کرے پھر تم باقیماندہ دو تہائیوں میں سے ایک حصّہ کو چن لو (اور اس میں سے زکواۃ لو) پھر اسے فلاں فلاں (مستحقین) میں خرچ کر دو۔" راوی کہتا ہے کہ انہوں نے کچھ باتیں بیان کیں۔ سعد کہتے ہیں: "ہم زکواۃ وصول کرنے کے لئے نکلتے تھے اور واپسی پر ہمارے پاس صرف ہمارے کوڑے ہوتے۔"

(۱۹۱۵) **ابو عبید** رحؒ:۔ مذکورہ بالا روایات ثبوت پیش کر رہی ہیں کہ ہر قوم کے لوگ اپنی زکواۃ کے زیادہ مستحق ہیں تاآنکہ آسودگی کی وجہ سے انہیں اس کی ضرورت

باقی نہ رہے۔ اور ہم دوسرے لوگوں کو چھوڑ کران قریبی لوگوں کو اس زکواۃ کا زیادہ مستحق اس لیئے قرار دیتے ہیں کہ پڑوس کی حرمت اور اُن امیروں کے گھروں سے اِن فقراء کے گھروں کی قربت کی وجہ سے سُنت نے یہی قاعدہ مقرر کیا ہے۔

(۱۹۱۶) لہٰذا اگر محصل زکواۃ لاعلمی کی بناء پر ایک علاقہ کی زکواۃ دوسرے علاقہ میں لے جائے حالانکہ اس علاقہ والوں کو اس کی ضرورت باقی ہو تو امام اس لائی ہوئی زکواۃ کو واپس انہی لوگوں کے پاس بھیج دے گا جیسے عمر بن عبدالعزیزؒ نے کیا تھا اور جیساکہ سعید ابن جُبیرؒ نے فتویٰ دیا تھا۔

اگرچہ ابراہیم اور حسن دونوں اس بارے میں ایسے شخص کو رُخصت دیتے ہیں جو (زکواۃ دینے کے لیئے) اپنے رشتہ داروں کو ترجیح دینا چاہتا ہو تاہم یہ اجازت کسی شخص کو اس کے اپنے مخصوص (ذاتی) مال میں حاصل ہوگی۔ اور یہ شکل اس مجموعی زکواۃ میں روا نہ رکھی جائے گی جو ائمہ کے زیر تصرّف ہو۔

اور انہی دونوں کے قول سے مشابہ ابوالعالیہ سے مروی یہ روایت بھی ہے:

(۱۹۱۷) ابوالعالیہ سے روایت ہے کہ وہ اپنی زکواۃ مدینہ لے جاتے تھے۔

ابو عبیدؒ: ہمارے خیال میں وہ اس زکواۃ کو اپنے اقارب و موالی میں محدود رکھنے کے لیئے ایسا کرتے تھے۔

اگر کسی مستحق زکواۃ کی محرومی کی شکایت ملے تو آئندہ سال اسے دُگنی زکواۃ دینا

(۱۹۱۸) لیکن اگر امام کو ضرورتمند مستحقِ زکواۃ کا علم نہ ہو سکے اور وہ (اس علاقہ کے علاوہ) دوسروں میں ان کی زکواۃ بانٹ دے یا اس کے بعض ماتحت عمال سے ایسا ہو جائے اور پھر بعد میں اسے اس (غلطی) کا علم ہو تو اس بارے میں حضرت عمر بن الخطابؓ سے یہ روایت ہے کہ انہوں نے ایسے موقع پر اگلے سال دُگنی زکواۃ کردی تھی۔[1]

---

[1] ہمارے خیال میں اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ اگلے سال لوگوں سے دُگنی زکواۃ وصول کی بلکہ اگلے سال مستحقین کو دُگنی زکواۃ دے کر پہلی محرومی کی تلافی کردی جیساکہ اگلی روایت سے ظاہر ہے۔ (مترجم)

(۱۹۱۹) عُمیر بن سلمہ دُؤلی کہتے ہیں کہ وہ حضرت عمرؓ کے ساتھ سفر میں تھے یا عُمیر کو کسی ایسے شخص نے بتایا جو حضرت عمرؓ کے رفیقِ سفر تھے ۔ اگرچہ خود عُمیر بھی بڑے بوڑھے اور پُرانے لوگوں میں سے تھے ـــــ اس اثناء میں کہ حضرت عمرؓ دوپہر کو ایک درخت کے سایہ میں قیلولہ کر رہے تھے ایسا ہوا کہ ایک عرب کی دیہاتی عورت آئی اور اس نے بغور لوگوں کو پہچاننا شروع کیا پھر وہ ان (حضرت عمرؓ) کے پاس پہنچی اور اس نے ان سے عرض کیا: "میں ایک مسکین عورت ہوں، میرے بچے ہیں ۔ اور امیر المومنین عمر بن الخطابؓ نے ہمارے ہاں تحصیل زکوٰۃ کے لئے محمد بن مَسلَمہ کو مامور کیا تھا لیکن انہوں نے ہمیں نہیں دیا ۔ میں آپ کی خدمت میں پہنچی ہوں کہ آپ ان سے ہمارے لئے سفارش فرما دیں ۔ اللہ آپ پر رحم فرمائے ۔" راوی کہتے ہیں کہ اس پر حضرت عمرؓ نے یَرفاٗ کو آواز دی اور کہا: "محمد بن مَسلَمہ کو میرے پاس بُلا لاؤ ۔" اس عورت نے کہا "میری حاجت برآری کے لئے یہ زیادہ مفید ہوگا کہ آپ میرے ساتھ ان کے پاس چلیں" ۔ حضرت عمرؓ نے کہا: "ان شاء اللہ وہ تمہارا کام کر دیں گے ۔" یَرفاٗ ان (محمد بن مَسلَمہ) کے پاس پہنچا اور ان سے کہا: "امیر المومنین کے بلاوے پر پہنچو" ۔ چنانچہ وہ حضرت عمرؓ کے پاس پہنچے اور کہا: "السلام علیک، یا امیر المومنین وہ عورت شرما گئی اور حضرت عمرؓ یوں گویا ہوئے: "اللہ کی قسم، اپنی جانب سے میں کسر نہیں چھوڑتا کہ تم میں سے بہترین آدمی کو منتخب کروں، بھلا بتاؤ تو تم اللہ کے سامنے کیا جواب دو گے جب وہ تم سے اس عورت کے بارے میں سوال کرے گا؟" اس پر محمد (بن مَسلَمہ) کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ۔ پھر حضرت عمرؓ نے کہا" اللہ تعالیٰ نے ہم میں اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا ۔ ہم نے ان کی تصدیق کی اور ان کے بتائے ہوئے راستہ کی اتباع کی رسول اللہؐ نے وہی عمل کیا جس کا اللہ نے آپؐ کو حکم دیا ۔ چنانچہ آپؐ نے زکوٰۃ اس کے مستحق مساکین میں تقسیم فرمائی اور اسی پر عمل پیرا رہتے ہوئے آپؐ نے اپنی جان اللہ کو سونپ دی پھر اللہ نے حضرت ابوبکرؓ کو ان کا جانشین بنایا اور وہ بھی مرتے دم تک آپؐ کے طریقِ کار پر عمل پیرا رہے ۔ پھر اس نے مجھے ان کا جانشین بنایا اور میں نے تم میں سے بہترین کو انتخاب کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا ۔ اگر میں نے پھر تمہیں مامور کیا تو اس عورت کو اس

سال اور پہلے سال کی زکوٰۃ دینا، اور میرا خیال ہے کہ شاید میں تمہیں مامور نہ کروں۔ پھر اُنہوں نے ایک اُونٹ منگوایا اور اُسے آٹا اور زیتون کا تیل دیتے ہوئے کہا: "یہ لے لو، ہم خیبر جا رہے ہیں وہاں تم ہم سے ملو۔" چنانچہ وہ عورت خیبر میں ان کے پاس پہنچی اور انہوں نے اس کے لئے دو دوسرے اُونٹ منگوائے اور کہا: "یہ لے لو، اس میں گذر بسر ہو جائے گی تا آنکہ محمد بن مَسلَمَہ تمہارے پاس پہنچیں، میں نے انہیں ہدایت کر دی ہے کہ وہ تمہارا اس سال کا اور پچھلے سال کا حق تمہیں ادا کر دیں۔"

(۱۹۲۰) ایک اور سند سے یحییٰ بن سعید نے ایسی ہی روایت بیان کی ہے۔ البتہ اس کی ابتدائی عبارت اس طرح ہے: "اس عورت نے ایک شخص کو درخت کے نیچے سوتا پایا تو اس نے اس شخص کے پاؤں کی کوئی اُنگلی پکڑی جس کی وجہ سے وہ شخص بیدار ہو گیا اور اس نے دریافت کیا: "تمہیں کیا معاملہ درپیش ہے؟" چنانچہ اس عورت نے اس سے محمد بن مَسلَمَہ کا پورا واقعہ بیان کر دیا۔ تب اس شخص نے کہا: "اُن کے پاس جا کر اُن سے کہو کہ یہ شخص تمہیں بُلا رہا ہے۔" تو اس عورت نے ان سے کہا: "سفارشی اس طرح نہیں کہتا ہے۔" اُنہوں نے کہا: "اُن کے پاس جا کر جیسے میں تم سے کہہ رہا ہوں ویسے ہی کہہ دو وہ چلے آئیں گے۔" چنانچہ وہ لوگوں کے درمیان سے نکلتی ہوئی اُن سے جا ملی اور وہی بات اُن سے کہہ دی۔ وہ اُٹھ کر تیزی سے چل پڑے اور وہ عورت بھی ان کے پیچھے ہو لی تا آنکہ وہ حضرت عمرؓ کے پاس جا کر ٹھہرے۔ پھر بقیہ حدیث بیان کی۔

بعض روایات جن سے ایک علاقہ کی زکوٰۃ دوسرے علاقہ لے جانے کا جواز ملتا ہے اور اُن کی توجیہ

(۱۹۲۱) ابو عبیدؒ:۔ بایں ہمہ کچھ احادیث ایسی آئی ہیں جن سے ایک علاقہ کی زکوٰۃ دوسرے علاقہ میں لے جانے کی رُخصت کے بارے میں دلائل ملتے ہیں مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث جس میں آپؐ نے قبیصہ بن مخارق کے تاوان سے زیر باری کے ضمن فرمایا تھا: "تم ہمارے پاس قیام کرو تا آنکہ زکوٰۃ ہمارے پاس آئے، پھر یا تو

ہم تمہارے بار کو کم کرنے میں تمہاری مدد کریں گے یا وہ سارا بار تم سے ہٹا کر اپنے ذمہ لے لیں گے۔" اس طرح آپؐ نے یہ خیال ظاہر فرمایا کہ وہ انہیں حجاز کی زکوٰۃ میں سے دیں گے حالانکہ وہ نجد کے باشندہ تھے۔ نیز یہ بھی کہ اہلِ نجد کی زکوٰۃ اہلِ حجاز کی طرف منتقل کی جائے۔

(۱۹۲۲) اسی طرح عدی بن حاتم کی روایت ہے جس کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد ایام ارتداد میں انہوں نے حضرت ابوبکرؓ کو اپنی قوم کی زکوٰۃ لاکر دی۔

(۱۹۲۳) ایسی ہی حضرت عمرؓ کی وہ روایت ہے جس میں اُنہوں نے عام الرمادۃ (قحط سالی) کے بعد ابن ابی ذباب کو محصل بنا کر بھیجتے وقت کہا تھا: "ان سے دو سال کی زکوٰۃ لینا، پھر ایک سال کی انہی میں تقسیم کر دینا اور دوسرے سال کی میرے پاس لے آنا۔

(۱۹۲۴) اور یہی مضمون حضرت معاذؓ کی اس روایت کا ہے جس میں اُنہوں نے اہلِ یمن سے کہا تھا: "میرے پاس یمنی چادریں اور کپڑے (خمیس و لبیس) لے آؤ میں دوسری چیزوں کی بجائے زکوٰۃ میں تم سے یہ لے لوں گا۔ اس لئے کہ ان کا دینا تمہارے لئے زیادہ آسان ہے اور یہ کپڑے مہاجرین کے لئے مدینہ میں زیادہ سودمند رہیں گے۔"

ابو عبیدؒ:۔ ان تمام اشیاء کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں اِلّا یہ کہ یہ چیزیں علاقہ والوں کی ضرورتوں سے زائد ہوں اور انہیں ان اشیاء کی ضرورت باقی نہ رہے۔ جیسا کہ حضرات عمرؓ و معاذؓ کی روایات میں ہم بیان کر آئے ہیں۔

(۱۹۲۵) مقسم بن عباس آیت کریمہ:

يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ — وہ آپؐ سے دریافت کرتے ہیں کہ

قُلِ العَفْوَ: وہ کیا خرچ کریں۔ آپ کہہ دیجئے کہ "عفو"

(البقرۃ ۲: ۲۱۹)

میں "عفو" کی تفسیر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس سے مُراد ہے آسودگی (کے بعد ضرورت) سے زائد (یا تونگری کے بعد ضرورت سے بچ رہنے والی چیز)۔

باب

کسی شخص کے زکوٰۃ نکالنے کے بعد اس زکوٰۃ کے ضائع ہو جانے یا لاعلمی میں زکوٰۃ کسی تونگر و آسودہ حال کو دے دینے کا بیان

نکالنے کے بعد مستحقین تک پہنچے بغیر تلف ہو جانے والی زکواۃ ادا نہیں مانی جائے گی

(۱۹۲۶) زہریؒ سے ایسے شخص کے بارے میں جس نے اپنے مال کی زکواۃ نکالی اور پھر وہ ضائع ہو گئی یہ قول مروی ہے: "ہمارا خیال تو یہی ہے کہ وہ زکواۃ اس شخص پر واجب رہے گی تاآنکہ وہ اسے ادا نہ کر دے۔"

(۱۹۲۷) اسی مسئلہ میں حسنؒ سے مروی ہے: "ایسے شخص نے اپنے مال کی زکواۃ نہیں نکالی۔ اسے چاہیئے کہ وہ دوبارہ ادا کرے۔"

(۱۹۲۸) دوسری سند سے حسنؒ ہی سے روایت ہے: "ایسی تلف ہو جانے والی زکواۃ اس مالکِ مال کو کفایت نہ کرے گی تاآنکہ وہ زکواۃ کے مستحقین میں اسے تقسیم نہ کرے۔"

(۱۹۲۹) ابراہیمؒ سے (اسی بارے میں) روایت ہے: "ایسی زکواۃ اسے کفایت نہیں کرے گی۔"

(۱۹۳۰) شعبہؒ کہتے ہیں کہ میں نے اس بارے میں حکم بن عتیبہ سے استفسار کیا تو انہوں نے کہا: "ایسا شخص دوبارہ زکواۃ دے گا۔"

زکواۃ کسی دوسرے کو برائے تقسیم دے دی جائے اور پھر اس سے ضائع ہو جائے تو ادا مانی جائے گی

ابو عبیدؒ: اس مسئلہ میں ایک اور قول بھی ہے۔

(۱۹۳۱) حسنؒ سے روایت ہے کہ اُنہوں نے ایسے شخص کے بارے میں جس نے اپنی زکواۃ نکال کر کسی دوسرے آدمی کو برائے تقسیم دے دی ہو اور پھر اس سے وہ زکواۃ ضائع ہو گئی ہو یہ کہا: "اسے یہ زکواۃ کفایت کرے گی۔"

(۱۹۳۲) قتادہ کہتے ہیں: "اگر مالکِ مال اپنے مال سے زکواۃ کی رقم نکال کر علیحدہ کر چکا ہو تب وہ اسے کفایت کرے گی۔"

ابو عبیدؒ: ہمارے ہاں جس قول پر عمل ہوتا ہے وہ حسنؒ کا پہلا قول ہے جس کی موافقت ابراہیم، حکم اور زہری کر رہے ہیں جس کی رُو سے ایسی زکواۃ ناکافی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ مالداروں پر تو فریضہ یہ ہے کہ وہ فقیروں یا امام کو زکواۃ ادا کر دیں اور (اس سے پہلے) ضائع کر دینے والا اپنے ذمہ واجب الادا فریضہ کو ادا کرنے والا نہیں مانا جائے گا۔ فرمان باری تعالیٰ ہے:

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (البقرۃ: ۲۷۱)

اگر تم صدقات کو ظاہر (کر کے ادا) کرو تو یہ بہت ہی خوب ہے اور اگر تم انہیں چھپا کر فقراء کو دے دو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔

لیکن ایسا (ضائع کرنے والا) شخص تو ان فقراء کو کچھ بھی نہیں دے پایا۔ یہاں تک تو قبل ادائی زکواۃ ضائع کر دینے کے مسئلہ پر بحث ہوئی۔ اب لیجئے اس شخص کو جو زکواۃ کسی تونگر کو دے ڈالتا ہے:۔

لاعلمی میں تونگر کو زکواۃ دے دینے والے کی زکواۃ ادا ہو جائے گی

(۱۹۳۳) حسن رح سے مروی ہے کہ ایسا شخص جو اپنے مال کی زکواۃ کسی آدمی کو فقیر سمجھتے ہوئے دے دے اور بعد میں معلوم ہو کہ وہ تونگر تھا، تو اس کی زکواۃ ادا ہو جائے گی۔"

(۱۹۳۴) ایک اور سند سے بھی حسن رح سے ایسی ہی روایت ہے۔

(۱۹۳۵) ابوعبید رح:۔ اس موضوع پر بعد میں لوگوں میں اختلاف ہو گیا، کچھ لوگوں

ایسے شخص کو دوبارہ زکواۃ نکالنا ہوگی

نے اس قول کی تائید کی اور دوسروں نے کہا کہ ایسے شخص کو دوبارہ زکواۃ ادا کرنا ہوگی۔

ہر دو فیصلہ پر ابوعبید رح کا محاکمہ

میرا خیال ہے کہ ہر دو فریق نے اس مسئلہ کو نماز سے مشابہ قرار دیا ہے۔ اب جو لوگ ایسی زکواۃ کو ادا مانتے ہیں ان کی نظر میں یہ مسئلہ ایسا ہی ہے جیسے لاعلمی میں غیر قبلہ رُخ کر کے نماز پڑھ لینا اور ایسی صورت میں اسے نماز دوبارہ نہیں پڑھنا ہوگی، دوسروں نے اسے لاعلمی میں بغیر طہارت کے نماز پڑھ لینے سے تشبیہ دی ہے اور ایسے شخص کو (معلوم ہو جانے کے بعد) دوبارہ نماز ادا کرنا ہوگی۔

(۱۹۳۶) اس ضمن میں ہمارے نزدیک جو تشبیہ زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے وہ قبلہ والی ہے۔ لیکن اس تشبیہ کا اطلاق اس سے پہلے والے مسئلہ پر نہیں ہوگا۔ (دیکھئے نمبر ۱۹۲۶ تا ۱۹۳۰) اس لئے کہ زکواۃ کی ادائی کے لئے لوگوں پر اتنی ہی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی جانب سے پوری چھان بین کرلیں اور جب وہ مستحقین کو اپنی دانست میں صحیح سمجھتے ہوئے زکواۃ دے دیں تو انہوں نے اپنا فریضہ ادا کر دیا۔ خواہ حقیقت کچھ اور ہی ہو۔ اس لئے کہ حقیقت ان سے اوجھل ہو سکتی ہے۔

(۱۹۳۷) اس بارے میں جس حدیث کو اساسی حیثیت حاصل ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث ہے جس میں دو آدمیوں نے آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلّم سے صدقہ (زکواۃ) کا مطالبہ کیا تھا اور آپؐ نے ان سے فرمایا تھا: "اگر تم دونوں چاہتے ہو تو میں تمہیں دئے دیتا ہوں۔ لیکن (یہ جان لو) کہ اس (زکواۃ کے مال) میں کسی تونگر اور طاقتور کمائو کے لئے کوئی حصّہ نہیں ہے۔ اور یہاں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ان دونوں کو اس مد میں سے رقوم دے دیں، اور ان کے اس دعویٰ کو کہ وہ فقیر (حاجتمند) ہیں قبول کر لیا۔ اس لئے کہ آپؐ پر یہ نہ کھل سکا کہ وہ دونوں تونگر ہیں، بنا بریں رسول اللہؐ نے یہی مناسب خیال فرمایا کہ انہیں دے دیا جائے۔ یہی صورت ہر زکواۃ دینے والے کے لئے روا رہے گی۔"

———✕———

باب

زکوٰۃ میں فقراء و مساکین کا حصہ، نیز از روئے تاویل فقراء و مساکین کا فرق

مسکین و فقیر کا فرق

(۱۹۳۸) ابراہیم آیت کریمہ:

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ (التوبہ ۹: ۶۰)	بے شک صدقات (زکوٰۃ) فقراء اور مساکین کے لئے ہیں۔

کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ اس بارے میں یہ کہا جاتا تھا" یہ لوگ فی سبیل اللہ مہاجرین ہیں۔"

(۱۹۳۹) ضحاک بن مزاحم کہتے ہیں: "فقراء سے مراد تو مہاجرین فقراء ہیں اور مساکین سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہجرت نہ کی ہو۔"

(۱۹۴۰) ابن عباسؓ کہتے ہیں: "فقراء سے مراد ہے مہاجرین فقراء اور مساکین سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہجرت نہ کی ہو۔"

(۱۹۴۱) ابن عباسؓ ہی سے روایت ہے: "فقرار سے مراد ہے مسلمان فقراء اور مساکین سے مراد ہے در بدر پھرنے والے فقراء و سائلین۔"

(۱۹۴۲) مجاہد سے مروی ہے: "فقیر سے مراد ہے وہ حاجت مند جو سوال نہ کرے اور مسکین سے مراد ہے وہ جو سوال کرے۔"

(۱۹۴۳) ایسی ہی روایت جابر بن زید سے ہے: "فقیر وہ جو ہے سوال نہ کرے اور مسکین وہ ہے جو سوال کرتا ہو۔"

(۱۹۴۴) عکرمہ کہتے ہیں "فقیر سے مراد ہے کمزور و ناتواں اور مسکین سے مراد ہے جو کھلانے کا سوال کرے۔"

(۱۹۴۵) ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا "مسکین وہ نہیں ہے جو ایک دو کھجور، یا ایک دو لقمے لے کر واپس چلا جاتا ہے بلکہ مسکین وہ ہے جو احتیاج کے باوجود سوال سے گریز کرتا ہے۔ اگر تم چاہو تو قرآن مجید کی یہ آیت کریمہ پڑھ لو:

لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا : وہ لوگوں سے چمٹ کر سوال نہیں کرتے ہیں:

(البقرہ ۲ : ۲۷۳)

ابوعبیدؒ: یہ ہے فقیر اور مسکین کا فرق۔

قانع، معتر، بائس اور فقیر کا فرق

علماء نے "قانع و معتر" اور "بائس و فقیر" کے درمیان بھی فرق کیا ہے۔ حالانکہ ہر دو زکواۃ اور کھلائے جانے کے مستحق ہیں:

(۱۹۴۶) مجاہد آیت کریمہ:-

فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ : (الحج ۲۲ : ۲۸) تو اس (قربانی) میں سے خود کھاؤ اور پریشان حال فقیر کو کھلاؤ۔

کی تفسیر میں کہتے ہیں "یہ دونوں (بائس اور فقیر) ایک ہی ہیں۔"

(۱۹۴۷) عکرمہ کہتے ہیں: "فقیر سے مراد ہے کمزور و ناتواں اور "بائس" سے مراد ہے لاچار و مجبور، جس پر تنگی و پریشان حالی کا غلبہ ہو۔ اور "قانع" سے مراد ہے طمع اور امید رکھنے والا۔"

(۱۹۴۸) ابراہیم سے مروی ہے: "قانع اور معتر" میں سے ایک سے مراد ہے سائل اور دوسرے سے مراد ہے پڑوسی۔

(۱۹۴۹) سعید بن جبیر کہتے ہیں: "قانع وہ ہے جو سوال کرے ــــ یا جو تجھ سے سوال کرے ــــ اور معتر وہ ہے جو تمہارے پاس چکر لگائے۔

(۱۹۵۰) مجاہد کہتے ہیں: "قانع تمہارا وہ پڑوسی ہے جو سوال کرے اور معتر وہ ہے

جو سامنے آئے لیکن سوال نہ کرے۔"

(1951) حسن کہتے ہیں: قانع وہ ہے جو کسی آدمی کے سامنے عاجزی کا اظہار کرتے ہوئے سوال کرے اور "معتر" وہ ہے جو سامنے آئے اور سوال نہ کرے۔

(1952) مجاہد کہتے ہیں: "قانع سے مراد ہے وہ شخص جو اپنے گھر میں بیٹھا رہے اور "معتر" وہ ہے جو لوگوں کے پاس پہنچ کر اُن سے سوال کرے۔

باب

محصلینِ زکوٰۃ (عاملین) اور مؤلفۃ القلوب کے حصّے

دیانتدار محصلِ زکواۃ کا رُتبہ غازی جیسا ہے

(۱۹۵۳) رافع بن خدیج راوی ہیں کہ مَیں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا: "زکواۃ کی تحصیل پر مامور اسی طرح راہ حق پر لگا ہوا ہے جیسے فی سبیل اللہ غازی، تاآنکہ وہ اپنے کام سے واپس آجائے۔"

زکواۃ میں سے محصلِ زکواۃ کو محدود طور پر کھانے پینے کی اجازت دی جا سکتی ہے

(۱۹۵۴) عقبہ بن عامر جہنی رض کہتے ہیں: "مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محصل زکواۃ بنا کر بھیجا تو مَیں نے آپؐ سے زکواۃ کے مال میں سے کھا لینے کی اجازت طلب کی تو آپؐ نے ہمیں اجازت دے دی۔"

(۱۹۵۵) سلیمان بن یسار راوی ہیں کہ ابن ابی ربیعہ اپنی جمع کردہ زکواۃ لائے، جب وہ (مدینہ) پہنچے تو حضرت عمر بن الخطاب رض اُن کے پاس آئے تو انہیں عمر نے کھجور پیش کئے۔ اُنہوں نے وہ کھجور کھائے، لیکن حضرت عمر رض نے خود نہ کھایا۔ اس پر ابن ابی ربیعہ نے اُن سے کہا: "خدا آپ کا بھلا کرے، واللہ ہم تو ان (زکواۃ کے جانوروں) کا دودھ بھی پیتے ہیں اور ان میں سے بعض کو کھا بھی لیتے ہیں۔" تو اُنہوں نے کہا: "اے ابن ابی ربیعہ! میرا موقف تمہاری طرح کا نہیں ہے۔ تم تو ان جانوروں کی دُموں کے پیچھے لگے رہتے ہو تب تم ان میں سے کچھ

لے لیتے ہو، لیکن تمہاری طرح میری یہ کیفیت نہیں ہے۔"

(۱۹۵۶) ابن شہاب نے محصلینِ زکوٰۃ کے حصے کے بارے میں کہا: "جس نے

محصلینِ زکوٰۃ کا معاوضہ اور اُس کی مقدار

امانت داری اور پاکبازی سے زکوٰۃ کی تحصیل کا کام کیا۔ اسے اپنی کارکردگی اور جمع کردہ زکوٰۃ کے انداز (و تناسب) سے محنتانہ دیا جائے گا۔

اور وہ اپنے ساتھ کے ماتحت عملہ کو بھی ان کی کارکردگی کے مطابق اُجرت دے گا۔ اور یہ محنتانہ مجموعی طور پر اس حصّہ کے چوتھائی تک ہو سکے گا۔"

(۱۹۵۷) ابن بُکیر مالک رحؒ سے روایت کرتے ہیں: "زکوٰۃ کے محصل کے لئے کوئی مقررہ اُجرت (و تنخواہ) نہیں ہے۔ اس کا فیصلہ امام کے اجتہاد اور اس کی صوابدید پر موقوف ہے۔"

(۱۹۵۸) ابو عبیدؒ:۔ یہی سفیان اور اہلِ عراق کا قول ہے اور اسی پر ہمارے ہاں عمل جاری ہے، برخلاف ان لوگوں کے جو اس مد میں آٹھویں حصّہ (۱/۸) کی قید مقرر کرتے ہیں، لیکن اگر عاملین زکوٰۃ کے لئے اسے محدود کر دیا جائے تو پھر آٹھوں مدات کا حال بھی اسی طرح محدود ہو جائے گا۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ عاملین و محصلین

محصلینِ زکوٰۃ سرکاری افسر ہوتے ہیں

زکوٰۃ دیگر عمال و حکام کی طرح جو فئے وغیرہ جمع کرتے ہیں مسلمانوں کے نگران افسروں اور اہلکاروں کا ایک حصّہ ہیں اور ان لوگوں کو ان کی کارکردگی اور محنت کے مطابق اُجرت دی جائے گی۔ اس ضمن میں نہ ان کے ساتھ کمی روا رکھی جائے گی اور نہ (دیگر عاملین حکومت کے مقابلہ میں) انہیں کچھ زائد دیا جائے گا۔

یہاں تک تو عاملین زکوٰۃ کی بحث تھی۔

مؤلفۃ القلوب کا بیان اور اُن کی تعریف

اور اب لیجئے "مؤلفۃ القلوب" کو:

(۱۹۵۹) حسن رحؒ سے آیت کریمہ میں "اَلْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ" کی تفسیر کے ضمن مروی ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اسلام میں داخل ہوتے ہیں۔

(۱۹۶۰) ابن جُریج سے مروی ہے "یہ وہ گروہ ہے جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اپنے ساتھ ملانے اور ان کی دلجمعی کرنے کے لئے بخشش و عطیہ دیا کرتے تھے جیسے عُیینہ بن حصن اور اُن کے ساتھی اور اقرع بن حابس"۔

(۱۹۶۱) ابن شہاب کہتے ہیں" (کہ مؤلفۃ القلوب سے مراد) وہ لوگ ہیں جنہیں کمک میں بھیجے جانے والوں میں بھرتی کیا جائے تاوقتیکہ انہیں پہلا عطیہ دیا جائے اور وہ جانباز مجاہدین جو غزوہ میں مشروط طور پر حصہ لیں اور ان کے لئے کوئی عطیہ یا وظیفہ (مقرر) نہ ہو، بشرطیکہ وہ فقیر ہوں اور لوگوں سے سوال بھی نہ کرتے ہوں"۔

ابو عبیدؒ:۔ اس آیت کریمہ (میں مؤلفۃ القلوب) کا مفہوم جو عوام میں معروف و مشہور رہے وہی ہے جو حضرات حسن اور ابن جُریج سے مروی ہے۔ یعنی یہ وہ لوگ ہیں جنہیں عطیہ دے کر تالیف قلب کی جائے اور مانوس کیا جائے۔ اور اسلام میں ان کا کوئی حساب نہ ہو۔

مؤلفۃ القلوب کے بارے میں اختلاف

پھر بعد میں علماء میں ایسے لوگوں کے بارے میں جن کی حالت ان سے مشابہ ہو، اختلاف ہو گیا:

(۱۹۶۲) چنانچہ بعض علماء کا خیال ہے کہ جن حضرات پر اس آیت کا اطلاق ہوتا تھا وہ ختم ہو چکے، اور یہ صورت صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانہ تک محدود تھی۔

مؤلفۃ القلوب ہمیشہ رہیں گے اور اُن کی مد ختم نہیں کی جائے گی

(۱۹۶۳) لیکن حسنؒ اور ابن شہابؒ کے قول کے مطابق یہ صورت حال ہمیشہ جاری رہے گی اور میں بھی اسی قول سے اتفاق کرتا ہوں اس لئے کہ آیت مُحکمہ ہے اور کتاب و سنّت میں ہمیں اس کا کوئی ناسخ نہیں ملتا۔

(۱۹۶۴) بنابریں اگر کچھ لوگوں کی کیفیت یہ ہو کہ انہیں سوائے حصولِ دریافت کے

اسلام سے اور کچھ دلچسپی نہ ہو اور حالت یہ ہو کہ اگر وہ ارتداد اختیار کر لیں یا (مسلمانوں کے خلاف) جنگ کرنے لگیں تو ان کی طاقت و قوت اور ان کے غلبہ کی وجہ سے اسلام کو گزند پہنچنے کا اندیشہ ہو اور اس وجہ سے امام یہ مناسب تصوّر کرے کہ انہیں زکوٰۃ سے کچھ دے (کر خاموش کر دے) تو اسے تین وجوہ کی بناء پر یہ اختیار ہوگا۔ ان میں ایک وجہ تو کتاب و سنت پر عمل ہے۔ دوسری مسلمانوں کا بچاؤ (اور دشمن کی دست درازیوں سے ان کی حفاظت) ہے اور تیسری یہ کہ ان لوگوں سے نومید نہیں ہونا چاہیئے ہو سکتا ہے کہ اسلام کی مسلسل حوصلہ افزائیوں سے وہ اسے سمجھنے اور اس میں خوش اسلوبی سے دلچسپی لینے لگیں۔

باب

زکوٰۃ میں سے غلاموں کو آزاد کرانے اور مقروض و تاوان زدگان کا حصہ

زکواۃ کی رقم سے غلام آزاد کرانے کی اجازت

(۱۹۶۵) حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ وہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے کہ ایک آدمی اپنے مال کی زکواۃ میں سے کسی کو حج کرادے اور اس زکواۃ میں سے غلام کو آزاد کرادے۔"

(۱۹۶۶) ابن عباسؓ کہتے ہیں: "اپنے مال کی زکواۃ میں سے غلام کو آزاد کردو۔"

(۱۹۶۷) حسن کے متعلق یونس کہتے ہیں کہ وہ اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے کہ ایک آدمی اپنے مال کی زکواۃ میں سے کوئی جان خرید کر اسے آزاد کردے۔"

زکواۃ سے غلام آزاد کرانے کی کراہت

(۱۹۶۸) ابراہیم سے روایت ہے کہ وہ اس (مذکورہ بالا عمل) کو ناپسند کرتے تھے۔ (یعنی غلام کو زکواۃ کی رقم سے آزاد کرنا)

کراہت کا سبب

(۱۹۶۹) ابراہیم سے روایت ہے کہ وہ ایسا اس لئے ناپسند کرتے تھے کہ اس طرح وہ (آزاد کرنے والا) اُس (آزاد کردہ غلام) کی میراث میں حقدار ہوجائے گا۔

(۱۹۷۰) ابراہیم کہتے ہیں: "زکواۃ میں سے غلام کو آزاد کرانے میں مدد دی جائے گی لیکن اس میں سے پوری رقم دے کر آزاد نہیں کرایا جائے گا۔"

(۱۹۷۱) سعید بن جبیرؒ کہتے ہیں: "اپنے مال کی زکواۃ میں سے غلام کو آزاد نہ کرو، اس لئے کہ اس طرح "حقِ وَلاء" (وہ مراعات جو غلام کو آزاد کرنے والے کو حاصل ہوتی ہیں) حاصل ہو جائے گا۔"

(۱۹۷۲) سعید بن جبیرؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے ایسا کرنے کو ناپسند بھی کیا ہے۔

زکواۃ میّت کے کفن دفن میں نہیں خرچ کی جائے گی

(۱۹۷۳) ابراہیمؒ سے مروی ہے: "زکواۃ میں سے میّت کے قرض یا اس کے کفن دفن میں نہیں دیا جائے گا۔

زکواۃ سے غلام آزاد کرانے پر ابو عبیدؒ کا محاکمہ

ابو عبیدؒ:۔ اور یہی اہلِ عراق کا قول ہے۔ ان میں سے بیشتر غلام آزاد کرانے کو اسی سبب سے ناپسند کرتے ہیں جس کا ابراہیمؒ اور سعید بن جبیرؓ نے اظہار کیا ہے یعنی اس طرح آزاد کرنے والا حقِّ ولاء (غلام کو آزاد کرانے کی مراعات) اور میراث میں حصہ لے سکے گا۔

لیکن اس مسئلہ میں جتنے اقوال آتے ہیں ان میں ابن عباسؓ کا قول (نمبر ۱۹۶۵ و ۱۹۶۶) سب سے بلند ہے اور وہ اِتّباع کا زیادہ مستحق ہے اس لئے کہ ابن عباسؓ مفہوم و تاویل زیادہ جاننے والے تھے۔ پھر حسنؒ بھی اس بارے میں ان سے موافقت کر رہے ہیں، اور یہی بیشتر علماء کا فیصلہ ہے۔

اور اس قول کو جو چیز مزید تقویت بخشتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر آزاد کرنے والے کو ایک طرف یہ امکانی خطرہ ہے کہ وہ وَلاء کے باعث میراث حاصل کرے گا تو دوسری طرف اسے یہ خطرہ بھی ہے کہ وہ آزاد کردہ غلام کچھ ایسے تاوان اور قرض بھی چھوڑ سکتا ہے جو آزاد کرنے والے اور اس کی قوم کو بھگتنا پڑیں۔ بناء بریں ان میں سے ایک (نفع) دوسرے (امکانی خطرہ) کے عوض حاصل ہو گا۔

لہٰذا وہ شخص جو اس شکل کو جائز نہیں سمجھتا اس پر یہ بھی لازم ہوگا کہ وہ کسی کا اپنے والدین یا اپنے کسی رشتہ دار کو صدقہ[1] دینا بھی مکروہ سمجھے اس لئے کہ یہ اندیشہ موجود ہے کہ جس

صدقہ معطی کی میراث بن سکتا ہے

کو دیا جا رہا ہے وہ مر جائے اور صدقہ میراث بن کر پھر معطی کو واپس مل جائے حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اس کے برخلاف ہے۔

(۱۹۷۴) اس لئے کہ آپؐ نے اس شخص سے جس نے اپنی ماں کو صدقہ میں زمین دی پھر ماں کے مرنے کی وجہ سے وہ زمین میراث میں اسے واپس مل گئی تھی یہ فرمایا: تیرا اجر واجب ہوگیا، اور تیرا مال تجھے واپس مل گیا۔"

ابو عبیدؒ:۔ تو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے میراث میں (اپنا دیا ہوا) صدقہ جوں کا توں واپس لے لینے کی اجازت ہے تو ولاء کے سبب سے اس صدقہ کا وارث ہونا تو اور بھی زیادہ جائز ہوگا۔

یہاں تک تو ہوئی ابن عباسؓ کے اس قول پر بحث جس کی رو سے زکواۃ میں سے غلام کو آزاد کیا جا سکتا ہے۔

زکواۃ میں سے حج کرانے پر بحث

(۱۹۷۵) اب ان کے اس قول پر بحث کی جاتی ہے کہ زکواۃ میں سے حج بھی کرایا جا سکتا ہے:۔

مجھے نہیں معلوم کہ ان سے یہ قول زیادہ محفوظ (ارجح) ہے یا نہیں۔ اس لئے کہ اسے دیگر راویوں کے علاوہ صرف ابومعاویہ نے اپنی روایت میں بیان کیا ہے۔ بہرحال اگر یہ قول ان سے ثابت ہو جاتا ہے تو ہمارے خیال میں انہوں نے یہ بات آیت کریمہ کے ٹکڑے "وَفِی سَبِیلِ اللّٰہِ وَابْنِ السَّبِیلِ" کی تفسیر میں کہی ہوگی۔ اور انہوں نے حج کو اللہ کی راہوں میں شمار کیا ہوگا۔ بالکل اسی طرح جیسے حضرت عمرؓ نے ایک موقع پر آیت وصیت کی تاویل کرتے ہوئے کہا تھا:

(۱۹۷۶) یہ اس موقع پر جبکہ ان سے سوال کیا گیا کہ ایک عورت نے فی سبیل اللہ تیس درہم

---

[1] ۔ یہاں صدقہ سے مراد نجی طور پر لوجہ اللہ صدقہ وخیرات دینا ہے۔

دینے کی وصیت کی ہے۔ کیا اس کی وصیت کی یہ رقم حج کرانے میں دی جا سکتی ہے؟" تو انہوں نے جواب دیا: "کیوں نہیں، حج بھی تو اللہ کی راہوں میں سے ہے۔"

ابو عبیدؒ:۔ بہرحال لوگ اس پر عامل نہیں ہیں، اور مجھے ایک بھی شخص نہیں معلوم جس نے زکواۃ کو حج میں خرچ کرنے کا فتویٰ دیا ہو۔

(۱۹۷۷) حج اور غلام کو آزاد کرنا دونوں جُدا جُدا حکم اس لئے رکھتے ہیں کہ غلام کو آزاد کرانے کا حکم تو صاف طور پر قرآن مجید میں "وفی الرِّقَابِ" (اور غلاموں کو آزاد کرانے میں) کے الفاظ سے مذکور ہے، لیکن حج کرانے کا ذکر مرکواۃ کے قرآن مجید میں مذکور آٹھ مدات میں نہیں ہے، البتہ تاویل کر کے حج کو شامل کیا جا سکتا ہے۔

(۱۹۷۸) رہے وہ لوگ جو (زکواۃ کی رقم سے) غلام آزاد کرنے کو مکروہ قرار دیتے ہیں وہ اس آیت (میں فی الرِّقَابِ) کے الفاظ سے مراد ان (مکاتبین) غلاموں کی امداد لیتے ہیں جو اپنے مالکوں سے آزادی حاصل کرنے کے لئے معاہدہ کر لیتے ہیں، لیکن جو علماء غلام آزاد کرنے کی اجازت دیتے ہیں وہ اس آیت کو ہمہ گیر اور عمومی حیثیت دیتے ہیں اور غلام آزاد کرنا یا آزادی میں مدد کرنا سب اس میں شامل سمجھتے ہیں۔

زکوٰۃ سے میّت کا قرض ادا کرنے یا دیگر رفاہِ عامہ کے کام کرنے کا بیان

(۱۹۷۹) جہاں تک زکواۃ میں سے میّت کے قرض کی ادائی اور اس کے کفن دفن میں دینے یا مساجد تعمیر کرانے اور نہریں کھدوانے اور اسی قسم کے دیگر کارہائے خیر کا تعلق ہے تو سفیان اور اہلِ عراق اور ان کے علاوہ دیگر علماء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ان میں دی ہوئی زکواۃ ادا شدہ نہیں مانی جائے گی[1] اس لئے کہ یہ اخراجات قرآن مجید کی مذکورہ

---

[1] ۔ شاید یہ اس موقع کی بات ہے جب زکواۃ انفرادی طور پر لوگ ادا کر رہے ہوں لیکن اگر امام اور اس کے نمائندوں کے ذریعہ زکواۃ باقاعدہ وصول اور خرچ کی جاتی ہو تو اس قسم کے تمام کارِ خیر اور رفاہِ عامہ کے متعلق امام (اسلامی نظام کا مرکز) ہی اپنی صوابدید سے فیصلہ کرے گا اور صدقات کے آٹھ مدوں کی تاویل بھی وہی بہتر پیش کرے گا۔ (مترجم)

آٹھ مدات میں سے نہیں ہیں۔

(۱۹۸۰) **ابو عبیدؒ**: ادائی قرض میں زندہ اور مردہ کا فرق اس لئے ملحوظ رکھا گیا ہے کہ میت اپنے قرض کا ذمہ دار ہو گا اس لئے کہ اس کا لیا ہوا قرض اب دوسرے پر جو وارث ہے آگیا ہے۔ اور اگر اس میت کے پاس اس قرض کی ادائی بھر مال ہو تو اس کی میراث میں سے وہ ادا ہو گا اور زکواۃ میں سے نہیں بلکہ اس کے مال میں سے وہ ادا ہو گا لیکن اگر اس (میت) کے پاس مال نہ ہو تو اس کے وارث پر (اس قرض کی) کوئی ذمہ داری نہ ہو گی۔ اور وہ قرض ادا کرنے کا ذمہ دار نہ ہو گا۔ اس لئے کہ اس نے تو وہ قرض لیا ہی نہیں، بناء بریں علماء کا اجماع ہے کہ میت کا قرض زکواۃ سے ادا نہیں کیا جائے گا[1] رہ گیا زندہ تو اسے از روئے کتاب و سنت (قرض ادا کرنے کے لئے) زکواۃ دے دی جائے گی۔

(۱۹۸۱) اس بارے میں جہاں تک کتاب کا تعلق ہے اس کا فرمان ہے "والغارمین" (اور قرضداروں، تاوان زدہ لوگوں کو زکواۃ دی جائے گی)

(۱۹۸۲) جہاں تک سنت کا تعلق ہے وہ قبیصہ بن مخارق کے تاوان و قرض سے زیر بار ہوتے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے عیاں ہے "تم ہمارے پاس زکواۃ کے آنے تک قیام کرو۔ پھر یا تو ہم تمہاری زیر باری کو کم کرنے میں تمہاری مدد کریں گے یا پھر ہم ہی تمہارا سارا بار اپنے ذمہ لے لیں گے۔"

---

[1] ۔ ایسے میت کا قرض بشرطیکہ وہ فضول خرچی اور غیر شرعی کاموں کی وجہ سے نہ ہو "بیت المال" کو ادا کرنا چاہیئے، بالخصوص ایسی صورت میں جبکہ قرض دینے والا اس تاوان کو برداشت نہ کر سکے اور "غارمین" کے زمرہ میں شامل ہو جائے۔ (مترجم)

باب

مجاہدین فی سبیل اللہ اور مسافروں کے حصّے

پانچ تونگر جن کے لئے زکواۃ لینا حلال ہے۔ ان میں سے ایک غازی ہے

(۱۹۸۳) عطاء بن یسارؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: "سوائے پانچ آدمیوں کے کسی آسودہ و تونگر کے لئے صدقہ (زکواۃ) حلال نہیں ہے۔ (۱) زکواۃ جمع کرنے پر مامور محصل (۲) یا جس نے اپنے مال کے عوض زکواۃ کا مال خرید لیا ہو۔ ۳۔ یا وہ شخص جس کا پڑوسی فقیر ہو اور اسے زکواۃ دی جائے پھر وہ فقیر اپنے پڑوسی کو زکواۃ (کی چیز) ہدیۃً پیش کر دے (۴) یا غازی (۵) یا تاوان زدہ و مقروض۔"

ابوعبیدؒ:۔ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے غازی کو زکواۃ لینے کی اجازت دے دی خواہ وہ تونگر ہو۔ اور ہمارے خیال میں آپؐ نے قرآن مجید کے الفاظ "وَفِی سَبِیْلِ اللہِ" کی تاویل میں یہ کچھ فرمایا ہے۔

اس حدیث کے سوا ہم نے کوئی حدیث نہیں سُنی جس میں غازی کو زکواۃ دینے کا مذکور ہے۔"

ابن السبیل (مسافر) کا بیان

اب ہم ابن السبیل (مسافر) کا بیان کرتے ہیں:

(۱۹۸۴) سعر بن مالک عبسی کہتے ہیں: "میں اور میرا ایک ساتھی دو اونٹوں پر حج کے لئے گئے۔ جب ہم وہاں تمام ارکان حج ادا کر چکے تو ہمارے اونٹوں کی پیٹھوں میں زخم ہو گئے چنانچہ مدینہ پہنچ کر میں حضرت عمرؓ بن الخطاب کی خدمت میں پہنچا اور میں نے کہا: "اے امیرالمومنین! میں اور میرے ایک ساتھی نے حج کیا۔ ارکانِ حج سے فراغت کے بعد ہمارے اونٹوں کی پیٹھیں زخمی ہو چکی تھیں۔ اب آپ یا امیرالمومنین

ہمیں ہمارے گھروں تک پہنچانے کے لئے سواری کا انتظام فرما دیجئے"۔ اُنہوں نے کہا: میرے پاس اپنے دو نوں اونٹ لے آؤ۔ میں وہ دونوں اونٹ لے کر ان کے پاس پہنچا۔ انہوں نے ان اونٹوں کو بٹھایا پھر ان کی پشت کے زخموں کو دیکھا پھر اپنے عجلان نامی ایک کارندہ کو آواز دی اور اس سے کہا: "یہ دونوں اونٹ لے کر جاؤ اور انہیں حمی (سرکاری رکھت) میں زکوٰۃ کے جانوروں میں چھوڑ دو۔ اور میرے پاس دو سدھائے ہوئے نوجوان اُونٹ لے آؤ۔" چنانچہ وہ دو اونٹ لے آیا۔ تب حضرت عمرؓ نے کہا: "تم دونوں یہ دونوں اُونٹ لے لو۔ اللہ تمہیں سواری دے رہا ہے اور پہنچا رہا ہے۔ جب اپنے مقام پر پہنچ جاؤ تو تم مختار ہو خواہ انہیں اپنے پاس رکھ لو یا فروخت کر کے اپنے خرچ میں لے لو۔"

ابو عبیدؒ: یہ ہیں مسلمانوں کی وہ زکوٰتیں جن کے وہ آپس میں حق دار و مستحق ہوتے ہیں۔ اب رہے ذمی سوان کے لئے زکوٰۃ میں جداگانہ حکم ہے۔

باب

زکواۃ (وصدقات) میں سے ذمیوں کو دینے کا بیان نیز یہ کہ کونسا صدقہ ان کو دینے پر ادا مانا جائے گا اور کونسا غیر ادا شدہ رہے گا

مسلمان محتاج کے ہوتے ہوئے غیر مسلم کو زکواۃ نہیں دی جائے گی

(۱۹۸۵) مجاہد کہتے ہیں: "یہودی اور عیسائی کو زکواۃ نہ دو۔ الّا یہ کہ تمہیں کوئی مسلمان (فقیر) نہ ملے۔"

(۱۹۸۶) حسن کہتے ہیں: "زکواۃ میں سے عیسائی، یہودی اور مجوسی کو نہیں دیا جائے گا۔"

(۱۹۸۷) ابراہیم بن مہاجر کہتے ہیں کہ میں نے ابراہیم نخعی سے دریافت کیا: "ہماری آیائیں یہودیوں یا عیسائیوں میں سے ہیں کیا میں انہیں زکواۃ دے سکتا ہوں؟" انہوں نے کہا: "جہاں تک زکواۃ کا تعلق ہے اُس میں سے تو نہیں دے سکتے۔"

غیر مسلموں کو زکواۃ کے علاوہ دیگر صدقات وخیرات میں سے دیا جاسکتا ہے

(۱۹۸۸) عکرمہ کہتے ہیں: "انہیں (غیر مسلموں کو) زکواۃ مت دو لیکن اور کچھ (نجی خیرات و صدقات میں سے) دے سکتے ہو۔"

ابو عبیدؒ:۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ زکواۃ کے علاوہ دیگر خیرات وصدقات انہیں دئے جاسکتے ہیں۔

(۱۹۸۹) حسن کہتے ہیں: "ذمیوں کا فرض زکواۃ میں کوئی حق نہیں ہے۔ لیکن اگر کوئی

شخص چاہے تو دیگر مدات میں سے انہیں دے سکتا ہے۔"

زکواۃ کو مسلمان محتاجوں میں محدود رکھنے کا سبب

ابو عبیدؒ:۔ جہاں تک ہمارا خیال ہے علماء نے خصوصیت سے زکواۃ میں سے غیر مسلموں کو دیا جانا اس لئے مکروہ سمجھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں جہاں مسلمانوں کی زکواتوں اور صدقات کا ذکر ہے وہاں آپؐ کا یہ ارشاد ہے:" زکواۃ ان (مسلمانوں) کے امیروں سے لی جائے گی اور انہی کے فقیروں میں واپس دے دی جائے گی۔"

اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیگر ادیان والوں کو الگ کر کے زکواۃ صرف مسلمانوں کے لئے واجب فرمائی۔ آپؐ کا یہی فرمان اس باب میں اصل کی حیثیت رکھتا ہے۔

اسی مضمون کی تائید آپؐ کی ایک اور حدیث سے ہوتی ہے۔

(۱۹۹۰) عبداللہ بن ھلال ثقفی کہتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے کہا:" میں آپؐ کے بعد زکواۃ کی ایک سالہ بکری (یا بکری) کے عوض جان سے ہی مارا جانے والا تھا۔" تو آپؐ نے فرمایا:" اگر یہ (زکواۃ میں لیا جانے والا جانور) مہاجرین فقراء کو نہ دیا جاتا تو میں اسے نہ لیتا۔"

غیر مفروضہ صدقات میں سے غیر مسلموں کو دینے کا بیان

ابو عبیدؒ:۔ یہ صورت صرف زکواۃ کے لئے مخصوص ہے۔ لیکن جہاں تک غیر مفروضہ صدقات کا تعلق ہے تو کتاب میں بھی اس کی اجازت مذکور ہے اور سنت نے بھی یہی عمل روا رکھا ہے:۔

(۱۹۹۱) سعید بن جُبیرؒ، ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں:" مسلمانوں میں بعض لوگ ایسے تھے جن کی بنو قُریظہ اور بنو النَّضیر میں رشتہ داریاں اور قرابتیں تھیں اور یہ لوگ اپنے ان رشتہ داروں کو زکواۃ وصدقات دینے سے گریز کرتے تھے اور ان کے اسلام لے آنے کے خواہشمند بھی تھے۔ چنانچہ یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ آپؐ پر انہیں ہدایت دے دینے کی

يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ٥ (البقرۃ ۲ : ۲۷۲)	ذمہ داری نہیں بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت فرماتا ہے، اور جو کچھ تم خیر (مال) سے خرچ کرتے ہو تو وہ اپنی جانوں کے بھلے کے لئے ہے۔ اور تم نہیں خرچ کرتے ہو مگر اللہ کی رضاجوئی کے لئے۔ اور جو کچھ بھی تم خیر (مال) سے خرچ کروگے وہ پورا پورا تمہیں دے دیا جائے گا۔ اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

(۱۹۹۲) سعید بن المسیب روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کے ایک گھرانہ کو صدقہ دیا، اور وہ انہیں دیا جا رہا ہے۔"

(۱۹۹۳) یزید بن الہاد سے مروی ہے کہ ام المومنین حضرت صفیہؓ نے اپنے دو یہودی رشتہ داروں کو صدقہ[1] دیا۔ جو تیس ہزار (درہم) کے عوض فروخت کیا گیا۔

(۱۹۹۴) عبداللہ بن مروان کہتے ہیں کہ میں نے مجاہد سے دریافت کیا "میرا ایک مشرک رشتہ دار ہے اور اس کے ذمہ میرا کچھ قرض ہے، کیا میں اسے معاف کردوں؟" انہوں نے کہا "ضرور اور اسے (رشتہ داری کے تعلق کو مدنظر رکھتے ہوئے) کچھ دو بھی۔"

(۱۹۹۵) ابن جریج آیت کریمہ :

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ٥ (الدھر ۷۶ : ۸)	اور وہ کھانا کھلاتے ہیں اس کی محبت کے باوجود مسکین اور یتیم و قیدی کو۔

کی تفسیر کرتے ہوئے کہتے ہیں "اس زمانہ میں مشرکین کے علاوہ اور قیدی ہوتے ہی نہ تھے۔"

ابو عبیدؒ: ان کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کو کھانا کھلانے کی بھی ستائش فرمائی ہے۔

(۱۹۹۶) ابو میسرہ کہتے ہیں کہ لوگ ان کے پاس صدقۂ فطر (فطرہ) جمع کردیتے تھے اور

---

[1] - یہ زکوٰۃ نہیں بلکہ سخاوت و صلہ رحمی کرتے ہوئے کسی کی حالت سدھارنے کے لئے جو امداد دی جاتی ہے اسی ذیل میں آتا ہے۔ (مترجم)

وہ اسے یا اس میں سے (عیسائی) راہبوں کو دیتے تھے۔

(۱۹۹۷) ابو اسحٰق راوی ہیں کہ عمرو بن میمون اور عمرو بن شرجبیل اور مرۃ ہمدانی (سب) صدقہ فطر (فطرہ) میں سے راہبوں کو دے دیا کرتے تھے۔

ابو عبیدؒ: ہمارا خیال ہے کہ یہ حضرات اس لئے یہ عمل جائز سمجھتے تھے کہ یہ فرض زکواۃ میں سے نہیں بلکہ مسنون صدقات میں سے ہوتی ہے۔[۱]

اللہ تعالیٰ کی مدد اور حسنِ توفیق سے کتاب الاموال
تکمیل پذیر ہوئی۔ فللہ الحمد کثیراً والشکر
وصلی اللہ علی سیدنا محمد وعلی آلہ وسلم

---

[۱] ۔ زکواۃ و فطرہ میں سے اولین مستحق مسلم محتاج ہیں لیکن ملک میں جب ان کی تقسیم نظامِ حکومت اسلامی کے تحت ہوگی تو وہی نظام اپنے حالات کے مطابق مستحقین وغیر مستحقین میں امتیاز کرے گا۔ حضرت عمرؓ نے آیت انما الصدقات کی مدوں میں سے الفقراء سے مراد مسلمان اور المساکین میں سے اہلِ کتاب کے غیر مسلم مساکین بھی مراد لئے ہیں۔ (دیکھئے کتاب الخراج، ابو یوسف : ۷۲)

ضمیمہ

مختلف عمروں کے اونٹوں کے عربی ناموں کی تشریح

بنت مخاض :- ایک سال کی ہو کر دوسرے سال میں جانے والی اونٹنی۔

اِبن مَخَاض :- ایک سال کا ہو کر دوسرے سال میں جانے والا اونٹ

(یہ بنت مخاض کا مذکّر ہے)

مخاض حاملہ اونٹنیوں کو کہا جاتا ہے۔ بچہ دینے کے ایک سال کے بعد اونٹنی کے دوبارہ حاملہ ہونے کا امکان ہو جاتا ہے لہٰذا دوسرے سال میں لگنے والے اونٹ کے بچہ کو "ابن مخاض" اور مادہ کو "بنت مخاض" کہہ دیا جاتا ہے۔

بنت لَبُوْن :- پورے دو سال کی ہو کر تیسرے سال میں جانے والی اونٹنی۔

ابن لَبُوْن :- پورے دو سال کا ہو کر تیسرے سال میں لگنے والا اونٹ۔

لَبُون دودھ دینے والی اونٹنی کو کہتے ہیں۔ جب ایک اونٹنی کو بچّہ دئیے ہوئے دو برس ہو جاتے ہیں تو تیسرے برس میں اس کی از سرِ نو ولادت متوقع ہوتی ہے جس سے وہ پھر دودھ دینے والی بن جاتی ہے۔ اس لئے تیسرے سال میں لگنے والے اُونٹ کو "ابن لبون" اور اس کی مادہ کو "بنت لبون" کہا جاتا ہے۔

حِقَّہ :- جوان اونٹنی جو پورے تین سال کی ہو کر چوتھے سال میں لگی ہو۔ ایسی اونٹنی نہ صرف سواری و بار برداری کے لئے بلکہ نر سے جفتی کے لئے بھی پوری طرح تیار ہو جاتی ہے۔ اس کا مذکّر "حِق" کہلاتا ہے۔

جَذَعَة :- پورے چار سال کی ہونے کے بعد پانچویں سال میں لگنے والی اونٹنی۔

اس کا مذکّر "جَذَع" کہلاتا ہے۔

ثَنِيَّةٌ :- پورے پانچ سال کی ہونے کے بعد چھٹے سال میں لگنے والی اونٹنی۔ اس کا مذکر "ثَنِيٌّ" کہلاتا ہے۔

رَبَاعِيَة :- ساتویں برس میں لگنے والی اونٹنی۔

سَدِيس :- آٹھویں سال میں لگنے والا اُونٹ۔

بَازِل :- پورے آٹھ سال کا ہو کر نویں سال میں جانے والا اُونٹ۔ یہ عمر اُونٹ کے بھرپور شباب و کمال کی عمر ہوتی ہے۔

مختلف عمروں کی بھیڑ بکریوں کے عربی ناموں کی تشریح

جَذَعَة :- پورے ایک سال کی ہو کر دوسرے سال میں لگنے والی بھیڑ بکری (مذکر: جَذَعٌ)

ثَنِيَّة :- پورے دو سال کی ہو کر تیسرے سال میں لگنے والی بھیڑ بکری۔ (مذکر: ثَنِيٌّ)

(نوٹ) یہ دونوں نام اسی عمر کی گایوں کے لئے بھی بولے جاتے ہیں۔

مختلف عمروں کی گایوں بیلوں کے عربی ناموں کی تشریح

تَبِيع :- (۱) گائے کا ایک سالہ بچھڑا (۱۱) پورے ایک سال کا ہو کر دوسرے سال میں داخل ہونے والا گائے کا بچہ (۱۱۱) وہ بچھڑا جس کے کانوں اور سینگوں کی لمبائی برابر ہو گئی ہو (چونکہ اس عمر تک یہ بچہ اپنی ماں کے پیچھے پیچھے لگا رہتا ہے اس لئے اسے "تَبِيعٌ" کہا جاتا ہے) اس کی مؤنث "تَبِيعَةٌ" کہلائے گی۔

مُسِنَّة :- دو سال کی ہو کر تیسرے سال میں جانے والی گائے۔ اس عمر میں اس کے اگلے دو دانت نکل جاتے ہیں، (یہی لفظ اس عمر کی بھیڑ بکریوں کے لئے بھی بولا جاتا ہے)

ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی، اسلام آباد

کتابیں

۱- اسلامی منہاج کی تاریخ —— (بزبانِ انگریزی) قیمت مجلد بارہ روپیہ پچاس پیسے

۲- قرآن کا نظریۂ تاریخ —— (بزبانِ انگریزی) قیمت مجلد بارہ روپیہ پچاس پیسے

۳- الکندی —— (بزبانِ انگریزی) قیمت مجلد بارہ روپیہ پچاس پیسے

انگریزی کتابیں براہِ راست آکسفورڈ یونیورسٹی پریس پوسٹ بکس نمبر ۵۰۹۳ کراچی سے حاصل کر سکتے ہیں

۴- مجموعۂ قوانینِ اسلام جلد اوّل —— (بزبانِ اردو) قیمت مجلد .... دس روپیہ

۵- ″ ″ جلد دوم —— (بزبانِ اردو) قیمت مجلد .... پندرہ روپیہ

۶- ″ ″ جلد سوم —— (بزبانِ اردو) قیمت مجلد —— زیرِ طبع

۷- تقویم تاریخی —— (بزبانِ اردو) قیمت مجلد ... آٹھ روپیہ

۸- الرسائل القشیریہ —— (عربی مع اردو ترجمہ) قیمت مجلد ... دس روپیہ

۹- اجماع اور باب اجتہاد —— (بزبانِ اردو) قیمت مجلد ... دو روپیہ

۱۰- اصول الحدیث —— (بزبانِ اردو) قیمت مجلد ... سات روپیہ پچاس پیسے

۱۱- کتاب الرسالہ —— (بزبانِ اردو) قیمت مجلد ... دس روپیہ پچاس پیسے

۱۲- کتاب النفس والروح —— (بزبانِ عربی) قیمت مجلد ... پندرہ روپیہ

رسائل

۱- اسلامک اسٹڈیز —— (انگریزی سہ ماہی) سالانہ چندہ :- اٹھارہ روپیہ ... فی کاپی پانچ روپیہ

۲- الدراسات الاسلامیہ —— (عربی سہ ماہی) سالانہ چندہ :- اٹھارہ روپیہ ... فی کاپی پانچ روپیہ

۳- فکر و نظر —— (اردو ماہنامہ) سالانہ چندہ ... چھ روپیہ ... فی کاپی ساٹھ پیسے

۴- سندھان —— (بنگلہ ماہنامہ) سالانہ چندہ ... چھ روپیہ ... فی کاپی پچاس پیسے

رسالوں کے تمام گذشتہ شمارے دستیاب ہیں اور آرڈر دینے پر مہیا کئے جا سکتے ہیں

● انگریزی کتابوں کے سوائے کتب فروشوں کو حسب ذیل کمیشن دیا جاتا ہے

۱- ۱۰۰ روپیہ تک آرڈر کے لئے .... ۲۵ فیصد

۲- ۵۰۰ روپیہ تک آرڈر کے لئے ... ۳۳ ۱/۳ فیصد

۳- ۱۰۰۰ روپیہ تک آرڈر کے لئے .... ۴۰ فیصد

۴- ۱۰۰۱ اور زائد کے لئے ..... ۴۵ فیصد (جس کے لئے پچاس فیصد ایڈوانس جمع کرانا ہوگا)